حالی بحیثیت شاعر

8887

محمد فاضل مجددی
ذخیرہ لاہور

باب اوّل

حالاتِ حالی

مولانا حالی کے حالاتِ زندگی۔ خاندان۔ تعلیم
ذریعۂ معاش۔ علمی و ادبی خدمات۔ وفات۔ سیرت
و اخلاق۔ اولاد و شاگرد اور تخلیقاتِ حالی کا تعارف

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

13000

ترتیب

حیات و خدمات	۱۱
علالت و وفات	۵۹
ماتمِ حالی	۶۲
سیرتِ حالی	۶۷
جانشین حالی	۷۴
تخلیقات حالی	۷۷

Marfat.com

اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دَورِ گراں خوابی

ہندوستان میں پانی پت ضلع کرنال نہ صرف اپنی سیاسی، تاریخی اور مذہبی حیثیت سے مشہور ہے بلکہ علمی اور ادبی حیثیت سے بھی ممتاز ہے۔ اسی مقام پر وہ ذاتِ گرامی پیدا ہوئی جس کو ہندوستان کا سعدی، اُردو ادب کا مجدّد، جدید اور نیچرل شاعری کا بانی، اُردو کا اہم ترین نقاد، سچا محبِّ وطن، مخلص معلّم اخلاق اور مصلح ملک و قوم تسلیم کیا گیا ہے۔

سُلطانِ قلمرو خیالی — تسلیمِ سخن کا باب عالی
بے مثل مثال بے مثالی — شمس العلماء جناب حالی
ذی عزّت و خواجہ گرامی
الطاف حسین نام نامی (صفی لکھنوی)

یہ خواجہ گرامی، الطاف حسین ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء، اپنے بڑے بھائی کے مکان، انصاریوں کے محلّے، پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوا۔

نازشِ ہندوستاں پیدا ہوا — حالیِ شیوا بیاں پیدا ہوا

عیسوی سنِ پیدائش میں اختلاف ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۶ء لکھا ہے[۱] جب کہ خود مولانا حالی نے اپنی کہانی میں ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء تحریر فرمایا ہے[۲]۔ اور تمام تذکرہ نویس اسی سن پر متفق ہیں۔ تقویم ہجری و عیسوی کے اعتبار سے ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء اور ۱۸۳۸ء یعنی دونوں سنوں میں ہے۔ ۱۸۳۶ء میں نہیں[۳]۔

اس اعتبار سے مولانا حالی یقیناً ۱۸۳۷ء ہی میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۵۳ھ [illegible] ۱۸۳۷ء [illegible] شروع ہوتا ہے، مولانا حالی نے "میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ" لکھا ہے، اس سنہ [illegible] ۱۸۳۷ء کی ابتدا میں ہوئی، بعد کے حالات اور حساب سے شروع سال ہی میں پیدا ہونا زیادہ قرینِ قیاس اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مولانا کا خاندان نہایت بزرگ و محترم ہے۔ پدری بزرگوار کا سلسلہ بیالیس واسطوں سے مشہور

---

[۱] تذکرہ حالی، اسماعیل پانی پتی صفحہ ۳۔ [۲] مقالاتِ حالی حصہ اول، حیاتِ حالی صفحہ ۲۶۱۔

[۳] تقویم تجزئی عیسوی مرتبہ ابو النصر محمد خالد زئی صفحہ ۱۶۱ و ۱۶۲۔ [۴] حیاتِ حالی صفحہ ۲۶۱، مقالاتِ حالی حصہ اول۔

Marfat.com

صحابی و میزبان رسول اللہ ؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ آپ کی والدۂ محترمہ، سیدہ امۃ الرسول عرف بی چھولو، سیدانی تھیں اور سید الانبیا حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کی چھتیسویں پشت میں تھیں۔ اس طرح مولانا حالی دادھیال کی طرف سے انصاری اور ناتھیال کی طرف سے سید تھے۔ شجرہ حسب ذیل ہے[1]:-

ناتھیال :-

(۱) سید الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم (۲) سیدہ فاطمہ زہراؓ (۳) سیدنا امام حسینؓ (۴) سیدنا امام زین العابدین (۵) امام ابو جعفر محمد باقر (۶) امام جعفر صادق (۷) حضرت اسماعیل ناطق (۸) سید محمد ناطق (۹) امام ابو القاسم اسماعیل شہید (۱۰) سید احمد (۱۱) سید اسماعیل شہید (۱۲) سید ابو جعفر (۱۳) سید موسٰی مکحول (۱۴) سید ابراہیم (۱۵) سید یحییٰ (۱۶) سید ابی متیم (۱۷) سید موسٰی (۱۸) سید محمد (۱۹) سید مغیث (۲۰) سید نور الدین (۲۱) سید مرتضٰی (۲۲) سید معظم (۲۳) سید شمس الدین (۲۴) سید حسام الدین (۲۵) سید اخوند (۲۶) سید نعمت اللہ (۲۷) سید امجد (۲۸) سید محمد (۲۹) سید منجھو (۳۰) سید علی (۳۱) سید ابو القاسم (۳۲) سید عبد الرحیم (۳۳) سید عبد الرحمٰن (۳۴) سید محمد امین (۳۵) سید محمد شفیع (۳۶) سیدہ امۃ الرسول زوجۂ خواجہ ایزد بخش و والدۂ خواجہ الطاف حسین حالی۔

دادھیال :-

(۱) حضرت ابو ایوب خالد انصاری خزرجی رضی اللہ تعالےٰ عنہ (۲) ابو منصور امت الانصاری (۳) جعفر انصاری (۴) علی انصاری (۵) احمد انصاری (۶) محمد انصاری (۷) ابی معاذ انصاری (۸) ابو المنصور محمد (۹) شیخ الاسلام خواجہ عبد اللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات (۱۰) شیخ محمد اول (۱۱) شیخ نصیر (۱۲) شیخ محمد ثانی۔ (۱۳) اسعد انصاری (۱۴) خواجہ عبد اللہ (۱۵) خواجہ فضل اللہ (۱۶) خواجہ محمد الملقب بہ امیر شیخ ابو اسحاق۔ (۱۷) خواجہ ملک شرف الدین امیر (۱۸) محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ (۱۹) شیخ نافع (۲۰) خواجہ انفع (۲۱) خواجہ عنقہ (۲۲) خواجہ ابو طاہر (۲۳) خواجہ عثمان (۲۴) خواجہ ابراہیم (۲۵) خواجہ عمر (۲۶) خواجہ مسعود (۲۷) خواجہ میرک علی شاہ (۲۸) قاضی خواجہ ملک علی (۲۹) خواجہ نصیر الدین محمود (۳۰) خواجہ ابو تراب (۳۱) خواجہ ابو حامد (۳۲) خواجہ ابو راشد (۳۳) خواجہ ضیاء الدین (۳۴) خواجہ عبد الکافی (۳۵) خواجہ زین الدین احمد (۳۶) خواجہ مسلم (۳۷) خواجہ عبد الکریم (۳۸) خواجہ عبد السبحان (۳۹) خواجہ غلام محمد (۴۰) خواجہ محمد بخش (۴۱) خواجہ بو علی بخش (۴۲) خواجہ ایزد بخش پدر بزرگوار خواجہ الطاف حسین حالی۔

حضرت ابو ایوب انصاری کے صاحبزادے حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک مہم میں خراسان آئے اور ہرات میں سکونت اختیار کر لی، اس خاندان کی نویں پشت میں، شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبد اللہ انصاری

---

[1] تذکرۂ حالی۔ اسماعیل پانی پتی۔

Marfat.com

ایک عالم باعمل اور نہایت پارسا بزرگ ہوئے، وہ فن حدیث کے امام اور صوفی کامل اعلیٰ درجہ کے خطیب اور بلند پایہ ادیب تھے، اپنے زہد و تقوے، ریاضت و عبادت، بزرگی و پرہیزگاری کی وجہ سے 'پیر ہرات' کے نام سے مشہور ہو گئے تھے، ان کی تمام عمر تصنیف و تدریس میں بسر ہوئی، انہیں شیخ الاسلام کی اٹھارھویں پشت میں خواجہ ملک علی ہوئے، خواجہ صاحب، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں، ترک سکونت کر کے ہرات سے ہندوستان چلے آئے۔ سلطان کی علمی سرپرستی کی دور دور تک مشہور تھیں۔ اس کا بیٹا سلطان محمد اپنے باپ سے زیادہ علما و فضلا کا قدر داں تھا، اسلامی ممالک کے اکثر و بیشتر اہل علم اور عالی خاندان، کشاں کشاں، جنت نشان، ہندوستان کی طرف مراجعت کرنے لگے اور دلی ارباب فضل و کمال کا مسکن ہو گئی۔ خواجہ ملک علی انصاری جو سلطان کے متعارفہ میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے، اپنے دو صاحبزادوں خواجہ مسعود اور خواجہ نصیر الدین کے ساتھ ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ء ہندوستان آئے اور پانی پت میں سکونت اختیار کی۔ مولانا حالی تحریر فرماتے ہیں:-

"چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد، علما، شعرا اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدر داں تھا اس لیے اکثر اہل علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند موضع اور سیر حاصل دیہات، پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہے اور خطابت عیدین ان کے متعلق کر دی، پانی پت میں اب تک جو ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں بزرگوں کی اولاد سے ہے۔"[1]

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ غیاث الدین بلبن نے خواجہ ملک علی کو حسب ذیل خدمات سپرد کی تھیں:

(ا) منصب قضا و صدارت (ب) تشخیص نرخ بازار

(ج) تولیت مزارات ائمہ (د) خطابت عیدین

ان فرائض کی انجام دہی کے صلے میں رہائش اور معاش کے لیے انہیں حسب ذیل آراضیات مرحمت فرمائی۔

(ا) عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں۔

(ب) معتدبہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں۔

---

[1] مقالات حالی حصہ اول، صفحہ ۲۶۲ (ترجمہ حالی)

(ج) بہت سی زمین اندرون قصبہ پانی پت میں۔

اس زمانہ میں پانی پت علما و فضلا اور شرفا کا مرکز تھا۔ دہلی کی علمی و ادبی، دینی و مذہبی شعاعیں اس قصبہ کو بھی منور کر رہی تھیں۔ دہلی کا قرب ہونے کی وجہ سے بیشتر اہل کمال یہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے، خواجہ ملک علی نے علم و ادب، زہد و تقوے ورثہ میں پایا تھا۔ یہاں کا علمی ماحول ان کو اتنا پسند آیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ جس محلہ میں آکر انھوں نے سکونت اختیار کی وہ محلہ ان کے خاندان کی نسبت سے "انصار" مشہور ہو گیا۔

خواجہ ملک علی کی چودھویں پشت میں خواجہ ایزد بخش، خواجہ اسفاف حسین حالی کے والد پیدا ہوئے، خواجہ ایزد بخش سرکار انگریزی کے سررشتہ پرمٹے میں ملازم تھے[1] تنخواہ قلیل تھی لیکن خوش قسمتی سے بیوی کفایت شعار اور سلیقہ مند تھیں، اس لئے تنگی میں بھی فراخی اور فقیری میں بھی شاہی [illegible] خانگی تفکرات کفن کی طرح کھائے جاتے تھے۔ روز بروز اخراجات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مولانا حالی کے ایک بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امۃ الحسین اور وجیہ النسا، [illegible] مولانا حالی کی ولادت کے بعد ان کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا[2]۔ ان پر محویت و استغراق کی ایک خاص کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی، بچوں کی دیکھ بھال، عزیزوں سے میل ملاقات اور بات چیت بالکل بند ہو گئی، ہر وقت خاموش رہتی تھیں، اس خاموشی و خود فراموشی کی وجہ سے گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا، اور مولانا حالی ماں کی آغوش تربیت سے محروم ہو گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت اور گھر کے انتظام کی تمام تر ذمہ داری بھائی اور بہنوں کے کاندھوں پر پڑ گئی۔ مولانا حالی اپنی ماں کی شفقت اور تربیت سے محروم پہلے ہی ہو چکے تھے کہ ۱۸۴۵ء میں جب کہ وہ عمر کی نویں منزل میں تھے باپ کے سایۂ عاطفت سے بھی محروم ہو گئے۔ خواجہ ایزد بخش کی عمر وفات کے وقت چالیس برس کی تھی، مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"میرے والد نے چالیس برس کی عمر میں، سن کہولت میں انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا[3]۔"

اب بھائی اور بہنوں کے علاوہ حالی کا اور کوئی سہارا نہ رہا، بڑے بھائی نے باپ سے زیادہ پیار اور محبت کے ساتھ اپنے بھائی کی پرورش کی، بہنوں نے چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیا۔ اور اگرچہ حالی ماں باپ کی محبت و شفقت سے محروم ہو چکے تھے، لیکن حق یہ ہے کہ بھائی بہنوں کی دلسوزی، ہمدردی اور محبت نے انھیں داغ یتیمی اور ماں کی شفقت سے محرومی کا احساس تک نہ ہونے دیا، حالی کے دل پر اپنے بھائی بہنوں کی محبت کے نقوش اتنے گہرے تھے کہ عمر بھر قائم رہے خصوصاً

---

[1] مقالات حالی حصہ اول۔ ترجمہ حالی، صفحہ ۲۶۳۔

[2] مقالات حالی حصہ اول۔ ترجمہ حالی صفحہ ۲۶۲ (اس حساب سے خواجہ ایزد بخش کی پیدائش ۱۸۰۵ء میں ہوئی۔

Marfat.com

بڑے بھائی سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور وہ ان کا بے حد ادب احترام کرتے تھے۔

اس زمانے کے دستور اور خاندان کے رواج کے مطابق، حالی کی بھی بسم اللہ ساڑھے چار سال کی عمر میں (۱۸۴۴ء) ہوئی۔ حافظ ممتاز حسین انصاری پانی پت کے مشہور قاری تھے اور انصاریوں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے، قرأت سکھاتے تھے اور حافظ بھی کراتے تھے۔ مولانا حالی کو ان کے پاس پڑھنے کے لئے بٹھا دیے گئے، قاری صاحب تجربہ کار معلم اور مردم شناس بزرگ تھے۔ حالی کو دیکھتے ہی تاڑ گئے کہ بچہ ذہین اور ہونہار ہے، حالی کو پڑھنے کا شوق بھی بے حد تھا۔ ذہن اچھا اور حافظہ خداداد تھا۔ قاری صاحب کی توجہ سے بہت جلد حافظ ہو گئے۔ قرآن پاک نہایت صحت اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پانی پت کے مشہور قاری حافظ امانت اللہ نے حالی کا قرآن پاک سن کر فرمایا کہ:۔

"یہ نہایت جوہر قابل معلوم ہوتا ہے اس کی تربیت بڑی اچھی طرح کی جائے"[۱]

قرآن پاک حفظ کر لینے کے بعد حالی نے میر تمنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی سے فارسی پڑھنا شروع کی۔ سید صاحب کو فارسی ادب، طب اور تاریخ پر عبور تھا۔ اعلیٰ درجے کے سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ حالی نے ان سے فارسی کی ابتدائی چند کتابیں پڑھیں، سید صاحب کے فیض صحبت نے حالی کے فطری ذوق ادب کو بیدار و متحرک کیا اور انھیں فارسی زبان و ادب سے ایسا شغف پیدا ہو گیا، اسی ذوق کا یہ کرشمہ تھا کہ حالی نے بہت جلد فارسی ادب پر عبور حاصل کر لیا اور وہ تمام عمر اس کے رسیا رہے۔

فارسی کے ساتھ ساتھ حالی کو عربی پڑھنے کا بھی شوق پیدا ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک نوجوان عربی حاجی ابراہیم حسین لکھنؤ سے مجتہد ہو کر پانی پت واپس آئے تھے۔ حالی کی نگہ انتخاب ان پر پڑی۔ حالی صاحب کی خدمت میں گئے، حرف آرزو زبان پر لائے۔ حاجی صاحب نے منظور کر لیا، درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا اور حالی ان سے صرف نحو پڑھ سکے۔ خود لکھتے ہیں:۔

"میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ انھوں نے ... حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں ... تاہم کبھی موقع نہ ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر تمنون دہلوی کے ... زنا شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ ... فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں ... پھر عربی کا شوق ہو گیا، انھیں دنوں میں ... حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی ... رہنے کو آئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھی"[۲]

---

[۱] و [۲] تذکرہ حالی از اسماعیل پانی پتی صفحہ ۳۵ ۵۳ مقالات حالی مرتبہ حالی صفحہ ۲۶۲

Marfat.com

حالی کا یہ فقرہ کہ :-

"اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر مجھے باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہ ملا۔"

اگر ایک طرف علم و ادب میں ان کے شاندار مستقبل کی نشان دہی کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے پریشان کن اور الم انگیز ماضی کا بھی پتہ دیتا ہے کہ ان کا ابتدائی زمانہ بھائی اور بہنوں کی سرپرستی اور نو برس تک باپ کا سایہ سر پر قائم رہنے کے باوجود کس قدر تکلیف اور انتشار میں گزرا۔ ساڑھے چار برس سے لے کر سترہ برس کی عمر تک تقریباً ساڑھے بارہ سال میں حالی نے جو کچھ پڑھا اس کا ماحصل یہ ہے :-

(۱) قرآن پاک حفظ کر لیا اور قرأت سیکھی۔ (۲) فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

(۳) عربی کی صرف و نحو پڑھی۔

لیکن حالی کے دل میں پڑھنے کا شوق تھا اور

"شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست"

کے مصداق حالی کا یہ شوق، ہر وقت اور ہر حالت میں رہنمائی کرتا رہا اور اسی کی بدولت مصائب و مشکلات کے باوجود وہ آسمان علم و ادب کے نیر تاباں ہوئے، سچ ہے۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

مولانا حالی نے خود مدرس ہیں اپنے ذاتی تجربات کو یوں بیان کیا ہے۔

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے جہاں تک ہو کام آپ اپنا سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
پڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو

حالی کی پوری زندگی اس کی گواہ ہے کہ وہ تمام عمر اپنی گاڑی خود ہانکتے رہے۔

یہ بے قاعدہ تعلیم، جس کے ختم ہونے پر حالی کو حسرت و افسوس ہے، ان کی شادی ہو جانے کی وجہ سے جاری نہ رہ سکی، وہ لکھتے ہیں :-

"چند روز بعد بھائی بہنوں نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا، تاہل پر مجبور کیا، اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارہ تھا کہ یہ بوجھ میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے ہر طرف سے مسدود تھے، سب کی خواہش تھی کہ میں نوکری کی تلاش کروں گو تعلیم کا شوق غالب تھا اور یہی کامیکہ آسودہ حالی[1]"

---

[1] حیات حالی، ترجمہ بحالی صفحہ ۲۶۲۔

حالی کے لئے سب سے زیادہ آزمائش اور کشمکش کا وقت یہی تھا، شفیق بھائی اور بہنوں کی دلی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے سہرے کے پھول کھلتے دیکھیں، عمر بھی شادی کے قریب پہونچ چکی تھی، اس زمانہ میں یہ بڑا عیب سمجھا جاتا تھا کہ شادی بیاہ کے متعلق صاحب معاملہ سے کوئی گفتگو کی جائے بڑوں نے جو کچھ چاہا آپس میں طے کر دیا۔ ان کے سامنے زبان کھولنا سوء ادب سمجھا جاتا تھا پھر حالی جیسا نیک، سعادت مند اور باحیا نوجوان یہ جرأت کیسے کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی اور بہنوں کے سامنے جنھیں بمنزلہ والدین سمجھتا تھا، کسی قسم کی لب کشائی کرتا اور ان کی محبت آمیز خواہش کے خلاف کچھ کہنے کی ہمت کرتا۔ اگرچہ اس کی دلی تمنا یہی تھی کہ جیسے تیسے وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے اور شادی بیاہ کے چکر میں ابھی سے نہ پڑے، لیکن حرف تمنا لب تک لانا شرم و حیا اور ادب و تہذیب کے خلاف تھا، اس لئے دل کی دل ہی میں رہی، اور بھائی بہنوں نے اپنی ماموں زاد بہن میر قربان کی صاحبزادی اسلام النساء کے ساتھ ۱۸۵۲ء میں حالی کی شادی کر دی۔ اب حالی کے اوپر ایک اور ذمہ داری معاش کی آن پڑی۔

شادی ہوگئی اور بظاہر حصول تعلیم کے سارے راستے مسدود ہو گئے، لیکن حالی کو تعلیم کا شوق بے چین کئے ہوئے تھا، یہ نشۂ علم، ازدواجی ترشی سے اترنے والا نہیں تھا، حالی کو تعلیم چھوڑنے اور معاش کی فکر کرنے کے لئے جو ذریعہ مہیا کیا گیا وہی ذریعہ ان کے لئے تعلیم جاری رکھنے کا سبب بنا اور انھوں نے تحصیل علم کا ایک راستہ پیدا کر لیا، یہ اشارہ کہ

"تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا"

حالی کے شوقِ علم کی تکمیل ہی کی طرف ہے۔ انھیں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنی تعلیم بہرحال جاری رکھ سکتے ہیں۔ اور بیوی کے میکے کی آسودہ حالی کی وجہ سے فی الحال انھیں نوکری تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ان کی تعلیم پانی پت میں رہ کر جاری نہیں رہ سکتی، اس لئے علم کی خاطر گھر بار چھوڑنا، اور وطن عزیز سے ہجرت کرنا لازمی ہے، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ بے چینی کے ساتھ موقع کے منتظر رہے۔ شادی کے بعد حالی کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا انھیں جب تلاش معاش کے تقاضے شروع ہوئے، حالی کو اس بات کا احساس پہلے ہی سے تھا کہ [illegible] اخراجات کا تمام بوجھ ان کے بڑے بھائی پر ہے۔ شادی کے بعد یہ احساس اور زیادہ ہو گیا، شادی اسی خیال کے پیش نظر کی گئی تھی کہ سسرال میں رہ کر تعلیم سے کنارہ کش ہو جائیں گے، اور فکر معاش کریں گے۔ احباب اور اعزا نے اس بات پر زور بھی دیا کہ تعلیم ختم کر کے روزی کی فکر کرو نہیں تو کب تک کھاتے رہو گے؟ حالی ان حضرات سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے۔ اگر بیوی کے میکے کی آسودہ حالی آڑے نہ آجاتی تو شاید وہ کوئی دوسری راہ اختیار کرتے

کیونکہ انھیں "تو کسب کمال کن" کی دُھن لگی ہوئی تھی۔ جب انھیں تعلیم چھوڑنے اور ملازمت کرنے پر بہت مجبور کیا گیا تو ایک رات جب کہ ان کی بیوی میکے میں تھیں، موقع غنیمت جان کر مہاتما بدھ کی طرح، سب لوگوں سے روپوش ہو کر گھر سے نکل پڑے، فرق صرف اتنا تھا کہ مہاتما بدھ تلاش حق میں گھر سے نکلے تھے اور مولانا حالی تلاش علم میں کہ وہ بھی خدا تک پہونچنے کا سب سے بہتر وسیلہ ہے۔ "کہ بے علم نتواں خدا را شناخت"

حالی کو بیوی کی وجہ سے فکر معاش کی ضرورت نہیں تھی، سسرال کی آسودہ حالی سے ان کا دل مطمئن تھا، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر انھوں نے اپنے خیالات، اشارۃً بھی کسی پر ظاہر کیے تو تحصیل علم کے لئے باہر جانا ناممکن ہو جائے گا، اس لیے انھوں نے مجبوراً یہی طے کیا کہ وہ چپ چاپ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر دلی کی طرف روانہ ہو جائیں، چنانچہ وہ پاپیادہ، خالی ہاتھ، دلی کی طرف روانہ ہو گئے ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

پانی پت سے دلی تک بھگ ترپن میل ہے، حالی کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ اٹھارہ برس کی ہو گی، ابھی تک انھوں نے گھر سے باہر قدم تک نہیں نکالا تھا لیکن شمع علم کے اس پروانے کا عشق شدت اختیار کر چکا تھا کہ وہ بے تابانہ اور بے باکانہ نثار ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ حالی نے جوانی میں اپنی کج رائی کی شکایت کی ہے ؎

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

لیکن اگر کج رائی اسی کا نام ہے کہ عین عنفوان شباب میں، شادی کے چند دنوں کے بعد جب کہ ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں چھوٹی تھی، یہ طے کر لینا کہ ہر صورت سے علم حاصل کرنا چاہیے تو یہ کجرائی پارسائی سے بدرجہا بہتر اور افضل ہے، ممکن تھا کہ نوجوان دلخیز حالی کج رائی و بے راہ روی کا شکار ہو جاتے، لیکن دنیا کے مکروہات نے دم لینے کی فرصت نہ دی، وہ خود معترف ہیں:۔

"باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی، نہ وصل کی لذت اٹھائی، نہ فراق کا مزہ چکھا"[1]

یہ زمانہ نہایت پُر آشوب اور افراتفری کا تھا۔ سفر نمونہ سقر تھے، ایسے نازک زمانہ اور پُر فتن دور میں بے سر و سامان اور بے یار و مددگار، گھر بار چھوڑ کر، صرف اکتساب علم کے لئے، تن تنہا سفر کرنا، حالی ہی جیسے علم و فن کے شیدائیوں کی ہمت و جرأت ہو سکتی ہے، راستہ میں ان پر کیا کیا گزری؟ ان کا سفر کس طرح کٹا؟ حالی نے اس سلسلے میں کسی قسم کا ذکر کرنا بے کار سمجھا۔

---

[1] دیباچہ مسدس حالی صفحہ ۲ ۔ نامی پریس کانپور۔

Marfat.com

نگاہیں جن کی جم جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر　　انھیں ماضی کی ناکامی کو دُہرانا نہیں آتا

راستے کی تکلیفیں اُٹھاتے ہوئے مولانا حالی خالی ہاتھ دہلی پہونچے، کھانے پینے رہنے سہنے کا کوئی سہارا نہ تھا دہلی میں وہ کس طرح رہے؟ کہاں رہے؟ ذریعہ معاش کیا رہا؟ یہ سب باتیں پردۂ راز میں ہیں، کیونکہ ان کا انکشاف اگر کوئی کر سکتا تھا تو وہ حالی کی ذات ہو سکتی تھی اور حالی نے "خوب سے خوب تر کی جستجو" اور طلب علم کے شوق میں ان تمام تکلیفوں کو اس قدر معمولی سمجھا کہ ان کا ذکر تک نہیں کیا البتہ ان کے بڑے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین مرحوم نے ایک مرتبہ یہ بیان کیا تھا کہ :-

"زمانۂ قیام دہلی میں والد مرحوم تکیے کی جگہ ایک یا دو اینٹیں سرھانے رکھ لیا کرتے تھے اور انھیں پر سر رکھ کر سو جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے دن ان پر ایسے بھی گزرے ہوں گے کہ فاقہ رہا ہوگا اس محنت اور تکلیف کا یہ نتیجہ تھا کہ والد مرحوم کی صحت جوانی میں خراب ہوگئی اور وہ ہمیشہ بیمار رہنے لگے"[1]

لیکن ہندوستان کا ہونے والا سعدی "پئے علم چوں شمع باید گداخت" کا معتقد اور عامل تھا اس لئے اس نے بڑی سے بڑی تکلیف کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

تحصیل علم کے لئے، حالی کا یہ پہلا سفر تھا، وہ پہلے پہل علوم و فنون کے مرکز جہان آباد دلی میں آئے تھے، اس وقت اگرچہ دلی پر خزاں آ چکی تھی اور مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہو چکا تھا صرف شفق کی ہلکی ہلکی رنگت باقی تھی، بہادر شاہ ظفر کی شاہنشاہی کا زوال لال قلعہ کے اندر بھی شروع ہو چکا تھا لیکن یہ خزاں بھی ہزاروں بہاروں سے بہتر تھی۔ اب بھی بڑے بڑے صاحب کمال موجود تھے جن کے دم سے دہلی میں علمی و ادبی صحبتیں رونق پر تھیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں :-

"وہ زمانہ جب کہ دلی نے تھوڑی دیر کے لئے سنبھالا لیا تھا، اگرچہ اس وقت پرانے کمالات کی سوتیں آئندہ کے لئے بالکل بند ہو گئی تھیں مگر اگلے زمانے کے بچے کھچے اہل کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہو گئے تھے لیکن مرغان خوش الحان خزاں کی آمد آمد سے بے خبر بدستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے، دلی کا یہ اخیر جھگڑا جس کے تصور سے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اس کے پس ماندہ قافلہ کو ایک ایک کر کے اپنے [illegible] رخصت کیا ہے"[2]

حالی جب اس گہوارۂ علوم و فنون میں پہونچے تو ان کی دلی مراد پوری ہو گئی اور ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام　　گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا (حالی)

حالی علم کی پیاس بجھانے کی غرض سے علم کے ایسے سرچشمے کی تلاش میں نکلے جو ان کی تشنگی کام و دہن کو

---

[1] حیات حالی صفحہ ۳۰ - اسماعیل پانی پتی　　[2] مقالات حالی جلد دوم صفحہ ۱۰۲

Marfat.com

دور کر سکے اس وقت جامع مسجد کے قریب مولوی حسین بخش کا عربی مدرسہ نہایت مشہور تھا جس میں مشہور واعظ اور زبردست عالم مولوی نوازش علی درس دیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب حنفی المذہب اور اپنے مسلک کے سخت پابند تھے، حالی نے مدرسہ میں داخل ہو کر عربی پڑھنا شروع کی، صرف و نحو کی کمی کو پورا کیا۔ منطق کی کچھ ابتدائی کتابیں شرح سلم، ملاحسن اور میبذی وغیرہ پڑھیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں :—

"میں گھر والوں سے رد و پوش ہو کر دہلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں[1]"

اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی تقریباً ڈیڑھ برس دہلی میں رہ پائے اس قلیل مدت میں انھوں نے مولوی نوازش علی مرحوم کے علاوہ حسب ذیل اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا۔

مولوی فیض الحسن سہارنپوری۔ مولوی امیر احمد۔ شمس العلماء مولانا میاں سید نذیر حسین[2]۔

مولوی فیض الحسن سہارنپوری عربی ادب میں شہرۂ آفاق تھے، ان کے تلامذہ میں بڑی بڑی باکمال ہستیاں سرسید احمد اور مولانا شبلی نعمانی جیسی ہیں، حالی نے ان سے عربی ادب کی تکمیل کی۔

مولوی امیر احمد عربی شعر و ادب میں مستند استاد اور سخن فہمی میں یکتائے روزگار تھے، حالی نے ان سے عربی شاعری کے رموز و نکات سمجھے اور دیوان متنبی کے دو تین قصائد پڑھے۔

شمس العلماء مولانا میاں سید نذیر حسین، حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے مشہور شاگرد اور محدث تھے، آپ کی شہرت ہندوستان اور ہندوستان سے باہر تمام اسلامی ممالک میں تھی۔ سرسید نے آثار الصنادید میں لکھا ہے :—

"مولوی نذیر حسین بہت صاحب استعداد ہیں خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد بہم پہونچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقران سے گوئے سبقت لے گئے ہیں روایت میں آج بے نظیر ہیں[3]"

قرآن و حدیث کے درس و تدریس کی محبت آپ پر ایسی غالب ہوئی کہ آپ اس کے مصداق ہو گئے۔

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث دوست کہ تکرار می کنم[4]

حالی کو ایسے عالم باعمل اور محدث اعظم سے حدیث پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

حالی نے ان تمام بزرگوں سے نہایت پابندی کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور یہ انھیں اساتذہ کی توجہ کا اثر تھا کہ حالی ذرے سے آفتاب بن گئے۔

---

[1] مقالات حالی حصہ دوم۔ ترجمۂ حالی صفحہ ۲۶۳ [2] تذکرۂ حالی۔ اسماعیل پانی پتی صفحہ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔

[3] [illegible] بہادر شاہ ظفر، رئیس احمد جعفری صفحہ ۲۵۵۔

Marfat.com

اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثرات بڑھتے جا رہے تھے بنگال میں انگریزی تعلیم کا رواج بڑھتا جا رہا تھا۔ شمالی ہندوستان میں بھی انگریزی پڑھنے پڑھانے کا کچھ کچھ رواج ہو چلا تھا۔ قدیم دہلی کالج میں انگریزی کے درجات قائم ہو چکے تھے، لیکن انگریزی کی مخالفت ملک گیر پیمانہ پر، اعلیٰ مہذب اور قدامت پسند طبقے میں شد و مد کے ساتھ جاری تھی۔ حالی نے جس ماحول میں نشو و نما پائی تھی اس میں انگریزی کا نام و نشان تک نہ تھا اور علم صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر تھا، ان کو دہلی میں جس مدرسہ سے سابقہ پڑا۔

"وہاں سب مدرس اور طلبا رکالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے اس لیے کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا۔"

انگریزی کی مخالفت میں یہ مدرسے سب سے آگے تھے۔ یہاں انگریزی اسکولوں کو (مجھلے) جہالت کی نیت کہا جاتا تھا۔ انگریزی پڑھنا عیب ہی نہیں بلکہ کفر کے مترادف تھا۔ مسلمانوں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں تھا۔ حالی بھی ان خیالات سے متاثر تھے اسی لیے ان کے دل میں "کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال نہ گزرا۔"

پانی پت میں ۱۷، ۱۸ برس تک وہ جس ماحول میں رہے، اس میں انگریزی تعلیم کا ذکر تک نہیں تھا۔ البتہ وہ سرکاری ملازمت کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھی جاتی تھی، علم حاصل کرنے کا نہیں۔ خود کہتے ہیں

"انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔"[1]

یہی وجہ تھی کہ حالی ڈیڑھ برس تک دلی میں رہے مگر انگریزی پڑھنا تو کجا کالج کی طرف رُخ بھی نہیں کیا یہ افسوسناک واقعہ انھوں نے خود لکھا ہے:-

"ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا بھی نہیں اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے، جیسے مولوی ذکاء اللہ مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔"[2]

لیکن بعد میں یہ ناآشنائے زبان مغربی، اپنے ذاتی شوق اور وسائل کی بدولت نہ صرف انگریزی زبان سے آشنا ہو گیا بلکہ انگریزی خیالات کی ترجمانی بھی اپنی زبان میں کرنے لگا۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں — بس قتل مصطفیٰ و نذیر کریں

---

[1] در ۵۲ و ۵۳، مقالات حالی ترجمہ حالی صفحہ ۲۶۱ اگرچہ انھوں نے خواجہ حالی کو دہلی کالج میں تعلیم حاصل کرنا لکھا ہے، جو حالی کے بیان کی روشنی میں یقیناً غلط ہے۔

Marfat.com

حالی نے مذہبی ماحول میں تعلیم و تربیت پائی تھی اس ماحول کا اثر ان پر تمام عمر قائم رہا ابتدا میں مذہبی جوش زیادہ تھا اور مذہبیت غالب تھی تاہم مذہبی تعصب اور تنگ نظری ان میں نام کو نہیں تھی اور وہ بے خوف ہو کر حق بات کی تائید کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ مولوی حسین بخش کے مدرسے میں زیر تعلیم تھے نواب صدیق حسن خاں (والیہ بھوپال کے شوہر) نے ایک مذہبی رسالہ لکھا۔ نواب صاحب مذہبا اہل حدیث تھے اور ان کے بہت سے عقائد اہل سنت والجماعت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حالی اس رسالہ کی تائید میں ایک رسالہ عربی میں لکھ کر اصلاح کی غرض سے اپنے استاد مولوی نوازش علی کے پاس لے گئے، مولوی صاحب حنفی المذہب تھے۔ رسالہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے اور اس کو فوراً چاک کر ڈالا۔ خواجہ غلام الثقلین عصر جدید میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیر تعلیم تھے، اس زمانہ میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں تھا، جسے ان کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اسے چاک کر دیا۔"[1]

اس طرح حالی کی یہ پہلی تصنیف، اختلاف عقائد اور مذہبی عصبیت کی شکار ہو گئی، کتاب کے ضائع ہو جانے کے صدمہ کے ساتھ ساتھ، حالی کے دل پر مسلمانوں کی اس مذہبی تنگ نظری کا گہرا اثر ہوا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی جائز بات بھی سننا گوارہ نہیں کرتا۔

خندہ زن ہے اس مسلمانی پہ کفر　　جیسی ہے حالی مسلمانی مری

مسلمانوں کے اختلاف کا یہ نقش اول حالی کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ وہ عمر بھر اس سے متاثر رہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ

اگر بھولتے ہم نہ قولِ پیمبر　　کہ ہیں سب مسلمان باہم برادر
برادر ہے جب تک برادر کا یاور　　معین اس کا خود ہے خداوند داور

تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

حالی اگرچہ فطرۃً خاموش اور سنجیدہ مزاج تھے، لیکن ان کی خاموشی سمندر کی طرح اپنے اندر جذبات و خیالات کا تلاطم خیز طوفان پنہاں کیے ہوئے تھی، شعر و شاعری سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ مولوی سید جعفر علی کی شاگردی سے بچپن ہی میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو چکا تھا[2]۔ دہلی آئے تو دبے ہوئے

---

[1] عصر جدید ۲۱ دسمبر ۱۹۱۴ء　　[2] تذکرہ حالی۔ اسماعیل پانی پتی صفحہ ۴۳۔
یادگار حالی میں صالحہ عابد حسین نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ حالی کے ذوق سخن کو سنوارنے میں ایک حد تک ان کا (استاذہ) کا حصہ ہے۔ یادگار حالی صفحہ ۱۴۴۔

130096

Marfat.com

جذبات پھر اُبھر آئے۔ اس وقت دہلی میں بڑے بڑے صاحب کمال، بہادر شاہ ظفر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا غالب، شیفتہ، آزردہ، صہبائی، نیر جیسے یکتائے روزگار حضرات موجود تھے، شعر و ادب کی محفلیں گرم رہتی تھیں، حالی بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے، مشاعروں میں جاتے، شعر و سخن کے جام پہ جام پیتے اور مست و مخمور ہوتے۔ حالی نے اپنے آپ کو پایا۔ بہت کچھ پڑھا، لیکن محو شوق کا دیوانہ پن گیا نہیں، اور اگرچہ دن میں وہ "شاہدۂ حق کی گفتگو" میں مصروف رہتے لیکن رات کو مے خانۂ شعر و شاعری میں جاکر بزم رندان ادب میں شریک ہونے لگے۔

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش — وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں، اب

حالی نے پیرِ مے فروش کے انتخاب میں اپنے فطری ادبی شعور سے کام لیا اور ایسے رند نما شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی جو مرجع کرام و ثقات تھا۔ اپنی اور شیخ (مرزا غالب) کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:—

"جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا تو مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے اپنے دیوان میں سے انھوں نے مجھے پڑھائے بھی تھے۔"[1]

اس تحریر سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ

۱۔ حالی مرزا غالب سے پہلی بار دلی آنے پہ ملے۔

۲۔ مرزا غالب کا اُردو اور فارسی کلام شائع ہو چکا تھا۔

۳۔ حالی کو غالب کے کلام سے ایک خاص لگاؤ تھا، اسی وجہ سے وہ ان کے اشعار پڑھتے تھے اور جو سمجھ میں نہیں آتے تھے، غالب کے پاس جاکر سمجھ لیتے تھے۔

۴۔ غالب کے چند فارسی قصیدے سبقاً سبقاً انھیں سے پڑھے تھے۔

اس لیے یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ حالی مدرسے کے بعد غالب سے ملے اور پہلے انھیں صرف مشاعروں میں پڑھتے سُنا۔ امین زبیری لکھتے ہیں:—

"قلعہ معلّٰے کے مشاعروں میں فارسی اور اُردو غزلیں پڑھتے سُنا تھا۔"[2]

قلعہ معلّٰے میں حالی کی شرکت کے سلسلے میں صاحب نادرات غالب تحریر فرماتے ہیں:—

"قلعہ معلّٰے میں حالی کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ آخری مشاعرہ پنجم جولائی ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا جس میں غالب شریک ہوئے تھے۔"[3]

---

[1] مقالات حالی جلد اول صفحہ ۲۶۵ — [2] تذکرۂ حالی از امین زبیری صفحہ ۲

[3] نادرات غالب، مرتبہ آفاق حسین آفاق صفحہ ۱۰۔

لیکن اس آخری مشاعرہ میں بھی حالی کی شرکت مشکوک ہے کیونکہ حالی کی شادی سترہ برس کی عمر میں ۱۸۵۶ء کے آخر میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ روپوش ہو کر دلی آئے اور یہ یقینی بات ہے کہ شادی ہوتے ہی حالی فوراً نہیں گئے، کچھ دنوں تک موقع کے منتظر رہے اس لیے جو لائی ۱۸۵۷ء کا مشاعرہ حالی نے نہیں سنا۔ پھر غالب سے ملاقات کیسی؟ حالی نے غالب سے ملاقات اُن کے گھر پر کی، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں :۔

"مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔"

غرض حالی، غالب کی خدمت میں انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے حاضر ہوئے اور ان سے اکتساب علم کیا۔ حالی کی سخن فہمی اور صحت مند ادبی شعور کے لیے اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اُردو فارسی کلام ایک ایسے شاعر کا پڑھنا شروع کیا جو اپنی دقت پسندی کی وجہ سے عوام و خواص دونوں میں مہمل گو مشہور ہو چکا تھا اور جس کی جدت ادا، ندرت فکر اور بلندی تخیل کا ارباب علم و فن مضحکہ اُڑاتے تھے، خود شاعر کو بھی ان سب باتوں کا بخوبی علم تھا، چنانچہ متعدد بار اس نے یہ اظہار کیا کہ

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا — نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یارب وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن ہشتہ سالہ حالی کو غالب کی تخلیقات میں اک جہان رنگ و بو، اک آفتاب تازہ نظر آیا، جدت و ندرت اور تخیل کی بلندی نظر آئی، دشنہ و خنجر میں ناز و غمزہ اور بادہ و ساغر میں جلوۂ حق نظر آیا۔ ان نکات کو سمجھنے کے لیے غالب سے بہتر اور کون تھا جو سمجھاتا، اسی لیے حالی مشکل اشعار کا مطلب سمجھنے کے لیے غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

مرزا غالب بڑے مردم شناس تھے، انھوں نے حالی کے اندر وہ جوہر دیکھا جو شاعری کی روح اور آبروئے شیوۂ اہل نظر ہے۔ مطلب سمجھتے سمجھتے حالی نے اپنی غزل استاد کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی۔ غالب ہر کس و ناکس کو شعر و شاعری سے منع کرتے رہتے تھے، وہ شمع ادب کے فروغ حسن کے لیے دل گداختہ پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے، اسی لیے شاعری کی رائے وہ بہت کم لوگوں کو اور بڑی مشکل سے دیا کرتے تھے لیکن حالی کی سخن فہمی اور سخن سنجی کو دیکھ کر مرزا غالب نے منع کرنے کے بجائے، ان کی ہمت افزائی کی اور فرمایا :۔

Marfat.com

"اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر
نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"[۵]

غالب کے ان چند ہمت افزا، صداقت آمیز اور حقیقت افروز کلمات نے حالی کے سمند شاعری پر تازیانہ کا کام کیا اور شاعری کا وہ پاکیزہ چشمہ جو زمانے کے حوادثات اور غم روزگار کی وجہ سے حالی کے سینہ میں پنہاں تھا اور صرف کبھی کبھی رس کر باہر آجاتا تھا، اب ابلنے کے لئے بیتاب ہو گیا لیکن حالی کی محتاط طبیعت اس وقت بھی رکی رکی رہی اس زمانہ میں وہ دو ایک غزل یا کچھ زیادہ کہہ سکے۔

تبرکات حالی میں ایک اردو تضمین جو انھوں نے حاجی جان محمد قدسی کی مشہور نعتیہ غزل

مرحبا سید مکی مدنی العربی

پر لکھی تھی یادگار کے طور پر رہ گئی۔ اس تضمین میں کل پانچ بند ہیں جس کا آخری بند یہ ہے:-

خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصف نبی — ہاتف اٹھا سوئے مدینہ و حاجت طلبی
پڑھ زباں سے زرہِ صدق یہ شعر قدسی — سیدی انت حبیبی و طبیبی قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

یہ تضمین انھوں نے انیس سال کی عمر میں یعنی ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں لکھی تھی[۵]۔
اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی پہلے خستہ تھے اور یہ تخلص اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ اوائل عمر میں کتنے پریشان تھے۔ زمانہ کے مصائب و حالات سے وہ کتنے زیادہ متاثر تھے؟ افسوس ہے کہ کلام خستہ زمانہ کے دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہ تضمین دلی سے واپسی کے بعد لکھی گئی کیونکہ حالی دلی میں آخر ۱۸۵۵ء تک رہے۔ اس لئے حالی کا وہ کلام ضائع ہو گیا، جس پر انھوں نے غالب سے اصلاح لی تھی۔

حالی تقریباً ڈیڑھ برس تک دلی میں رہے، ان کی اچانک گم شدگی سے گھر والے، عزیز و اقربا، سب سخت پریشان تھے۔ شادی کے بعد دولھا کا گھر بار چھوڑ کر اس طرح غائب ہو جانا لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک پیدا کرتا تھا۔ حالی جیسا عزلت پسند، سنجیدہ اور خاموش انسان جس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، چھپ کر باہر چلا جائے یہ بات سب کے لئے انتہائی پریشان کن تھی۔ پہلے قصبہ پھر گرد و نواح میں ان کی تلاش شروع ہوئی مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر ۱۸۵۵ء میں تقریباً ڈیڑھ برس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ یوسف گم گشتہ جہان آباد میں ہے اور تحصیل علم میں مصروف ہے۔ بڑے بھائی اور کئی دوسرے اعزا دلی پہونچے۔ اور حالی کو مجبور کیا کہ وہ تعلیم ختم کر کے گھر

---

[۵] مقالات حالی حصہ اول صفحہ ۱۲۶۔ [۵] حالی کا ذہنی ارتقاء۔ ڈاکٹر غلام سیدین خاں۔ صفحہ ۱۹۰

Marfat.com

ان کے ساتھ پانی پت واپس چلے آئے۔ حالی جو ایک جرعہ اور پانے کے لئے سب کو چھوڑ چھاڑ کر پیر مغاں کے آستانہ پر آ بیٹھے تھے، اپنی تعلیم اور دلی کی محفل شعر و سخن چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جرأت لب کشائی تو نہیں ہوئی لیکن حسرت بھری نگاہ سے التجا کی کہ

اک جرعۂ شراب بنے سب کچھ بھلا دیا ہم ہیں اور آستانۂ پیر مغاں ہے اب

مگر عذر قابل قبول نہیں ہوا۔ بڑے بھائی کا حکم کیسے ٹالتے؟ دل پر برچھیاں چل رہی تھیں لیکن زبان سے اف تک نہ کی۔ انتہائی رنج و غم کے عالم میں بھائی کے ساتھ دہلی اور پانی پت واپس آ گئے۔ حالی کو تعلیم ختم کر جانے اور دلی کی علمی و ادبی محفلوں کے چھوٹ جانے کا سخت افسوس ہوا۔ بظاہر اب تعلیم جاری رکھنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا مگر قدرت نے ان کے دل میں جو علم کی لو جلائی تھی، اور اکتساب علم سے جو انہیں عشق تھا، اس میں کمی ہونے کے بجائے زیادتی ہی ہوتی گئی، غالباً اسی موقع کے لئے انہوں نے فرمایا ہے ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب ! بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

پانی پت پہونچ کر یہ ذوق گنہ یعنی شوق تعلیم اور زیادہ ہو گیا۔ تحصیل علم میں یہ محویت، اور مشغولیت ان کے گھر والوں کے لئے پریشان کن تھی، وہ چاہتے تھے کہ حالی کچھ معاش کریں، کتابیں طاق پر رکھیں اور دنیا سے حسب بر سر روزگار ہو جائیں۔ حالی خود فکر معاش سے غافل نہیں تھے اور ملازمت کی تلاش بھی کرتے تھے مگر شوق علم بار بار من مزید کا نعرہ لگا رہا تھا اور وہ غم دوراں سے بے نیاز ہو کر مطالعہ کتب میں مشغول رہتے۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا، تقریباً ایک سال کے بعد حالی پھر دلی پہونچ گئے۔

ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر سے ہو بازی تو سو سو کے ہو جائے گی

دلی پہونچ کر انہوں نے تعلیم کو دوبارہ پانی پت سے باہر قدم نکالا۔ یہ زمانہ ۱۸۵۶ء کا تھا اور حالی ایک نوجوان کے باپ ہو چکے تھے۔

حالی تلاش معاش میں باہر نکل تو پڑے لیکن نہ کوئی ذریعہ، نہ سفارش، نہ کسی سے جان پہچان نہ کہیں رسائی، جائیں تو کہاں جائیں؟ ملیں تو کس سے ملیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ خدا پر بھروسہ کر کے حصار دہلی سے باہر نکلے۔ جو پندرہ یا بیس روپے کمشنر کے دفتر میں ایک جگہ خالی تھی، درخواست دی، خوش قسمتی سے منظور ہو گئی، اسی طرح وہ بغیر کسی کوشش و سفارش کے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، تنخواہ قلیل تھی لیکن وہ برسر روزگار تو ہو گئے، جب ملازمت کی خبر گھر پہونچی سب لوگ بہت خوش ہوئے۔ حالی نے اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے میں بڑی محنت اور جانفشانی کرنے لگے، چند دنوں کے اندر ہی فرض شناس حالی نے سارا کام سمجھ کر، سنبھال لیا۔ ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب آفریں ہنگامہ رستخیز بے جا برپا ہو گیا، تمام ہندوستان خصوصاً شمالی ہند اور دہلی

Marfat.com

گرد و نواح کا علاقہ اس طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ ہر طرف فتنہ و فساد، قتل و غارت گری کا دور دورہ تھا۔ انگریزی عملداری ختم ہوتی جا رہی تھی۔ حصار میں بھی آثار یہی نمودار ہو رہے تھے۔ نفسی نفسی کا عالم ہو گیا۔ حکومت کا رعب و دبدبہ ختم ہو گیا۔ جان و مال، عزت و آبرو کو کہیں پناہ نہیں تھی۔ اس پُرآشوب زمانہ میں قدرتی طور پر سب کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر پر اپنے عزیز و اقربا کے ساتھ رہیں۔ حالی کے لئے حصار میں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا انھوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ جلد سے جلد حصار سے پانی پت کی طرف روانہ ہو جائیں، اگرچہ سفر کرنے میں سخت خطرہ تھا، قتل و غارت کا بازار گرم ہو چکا تھا، راستے لوٹ مار سے غیر محفوظ تھے، حصار سے پانی پت کا راستہ اور بھی زیادہ خطرناک تھا، تاہم حالی نے اللہ کا نام لے کر چلنے کی تیاری کر لی، اور تن تنہا ایک گھوڑی پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ راستہ میں انھیں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لٹیروں نے ان سے سب کچھ چھین لیا نہ معلوم کس طرح جان بچی۔ اس سفر کے متعلق خواجہ سجاد حسین مرحوم لکھتے ہیں :۔

"والد جس گھوڑی پر سفر کر رہے تھے وہ بھی ڈاکوؤں نے چھین لی اور آپ کے پاس صرف ایک سائل باقی رہ گئی تھی جب پانی پت پہنچے تو پیدل سفر کی صعوبتوں اور راستے میں ناموافق اور ناوقت غذاؤں کی وجہ سے آپ کو اسہال کی شکایت ہو گئی جو ایک سال سے زیادہ رہی، آخر پانی پت کے مشہور طبیب حکیم خورشید احمد صاحب مرحوم نے والد کو گڑ یوں (بکری کے گھنگنے کی ہڈی) کا پلاؤ بتایا اور اس سے مرض کا ازالہ ہو گیا۔ جوانی میں والد مرحوم کے قویٰ بہت اچھے تھے اور آپ کو کسرت کا بھی شوق تھا لیکن معلوم ہوتا ہے اس حصار سے پانی پت تک سفر میں جو تکلیف اٹھائی اس نے ان کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اور آپ اکثر دست اور سینے اور پھیپھڑے کے امراض میں مبتلا رہنے لگے۔ باوجود انتہائی احتیاط کے جو آپ کی عادت ثانی تھی"[1]

غرض اس عالم سراسیمگی میں خدا خدا کر کے حالی پانی پت پہونچے۔

رسید بود بلائے ولے بخیر گزشت

سعد سعد کے شعلے اپنی پوری شدت کے ساتھ بھڑک رہے تھے، ہر وقت [illegible] کہ نہ معلوم کس وقت پانی پت میں آگ و خون کی ہولی کھیلی جانے لگے۔ دلی کی قریب کی [illegible] فتنہ و فساد کے خطرات اور زیادہ تھے اس لئے ہر شخص ہوشیار [illegible] جب پانی [illegible] تو لٹیروں نے پورے قصبہ کو پریشان اور خوف زدہ [illegible] اور [illegible] جان بچا کر پانی پت آگئے تھے اور یہ سلسلہ جاری تھا، باوجود اپنی پریشانی [illegible] قصبہ کے لوگ [illegible]

---

[1] یادگار حالی۔ رسالہ مآثر حالی صفحہ ۳۲

Marfat.com

ان مصیبت زدوں کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور ہر ممکن امداد و خدمت کی۔ حالی اپنے ستم رسیدہ بھائیوں کی مدد اور خدمت کرنے میں سب سے آگے تھے۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں :۔

"پانی پت والوں نے اس وقت سچی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اپنے گھروں اور دلوں کے دروازے ان مصیبت کے ماروں کے لئے کھول دیے۔ الطاف حسین اس وقت بیس سال کے نوجوان تھے، مگر تجربہ، متانت اور زمانہ شناسی بوڑھوں جیسی تھی، دل ایسا دردمند اور حساس پایا تھا کہ چیونٹی کی تکلیف پر بھی دکھ جاتا تھا، پھر کیسے ممکن تھا کہ مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد نہ کرتے۔ دوسروں کے ساتھ وہ بھی اس کام میں لگ گئے[1]"

خود حالی کے گھر میں بہت سے لوگوں نے پناہ لی، بعض ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہے، ان میں ایک بی مٹریا تھیں، جو ۵۷ء میں صرف دس سال کی بچی تھیں، اور ان کے والدین اور شوہر نذر انقلاب ہو گئے تھے، یہ دس سالہ، یتیم و یسیر بیوہ الطاف حسین کے خاندان میں آکر پناہ گزیں ہوئی، اور سب کے الطاف بے پایاں سے اتنی زیادہ متاثر ہوئی کہ تمام عمر اسی خاندان میں گزار دی۔ حالی تمام عمر بی مٹریا کا بڑا خیال اور لحاظ کرتے رہے، ان کے انتقال کے بعد ان کی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ بی مٹریا کی خدمت کرتی رہیں۔ صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ :۔

"خواجہ الطاف حسین بھی جب تک زندہ رہے بی مٹریا کا بڑا لحاظ اور خیال کرتے رہے، عمر بھر بھی بی مٹریا کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اسی خاندان کی ایک معزز فرد نہیں تھیں[2]"

غرض پانی پت میں جو بھی آیا حالی نے اس کی خدمت بڑی دل سوزی، ہمدردی، محبت اور خلوص کے ساتھ کی، قوم و ملک کی تباہ حالی اور بربادی کے یہ نقوش ان کے دل پر بہت گہرے ہو گئے، ہمدردی و ایثار کا فطری جذبہ بیدار ہو گیا اور یہ جذبہ مرتے دم تک قائم رہا۔

انقلاب ۵۷ء کے اثرات، عرصہ تک قائم رہے۔ سفید فام، مہذب نما درندوں کے جوش انتقام نے لاکھوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، حاکم قوم یعنی مسلمان کے وہ جانی دشمن ہو گئے تھے اور ایک ایک کو چن چن کر قتل کر رہے تھے، مسلمانوں کے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی صورت پیدا ہو گئی تھی، اس دور ابتلا میں حالی چار سال تک پانی پت ہی میں رہے۔ ابتدا میں تقریباً ایک سال اپنی بیماری اور خانماں بربادوں کی ہمدردی و اعانت میں صرف ہوا، جب ذرا سکون ہوا تو پھر اپنے دیرینہ اور محبوب کام تحصیل علم میں مصروف ہو گئے۔ چہار سالہ قیام پانی پت کے متعلق وہ لکھتے ہیں :۔

"قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزارے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ، اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے

---

[1] و [2] یادگار حالی۔ صالحہ عابد حسین صفحہ ۳۱، ۳۲۔

کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور ان میں سے جب کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور فارسی کے علم و ادب کی کتابیں شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا، اور کبھی کبھی عربی نظم اور نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی کا منتہا صرف اسی قدر ہے، جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔[1]

اس طرح مولانا حالی نے اپنے چہار سالہ قیام پانی پت میں:-

ا۔ مذکورہ بالا اساتذہ سے منطق، فلسفہ، حدیث اور تفسیر پڑھی۔

ب۔ ذاتی مطالعہ جاری رکھا اور لغات، شرح کی مدد سے علم ادب کی کتابیں پڑھیں۔

ج۔ عربی نظم اور نثر لکھی مگر کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا اور نہ اصلاح لی۔

اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی کو ادب سے کافی دلچسپی تھی اور پانی پت میں ادب پڑھنا ہی نہیں تھا، عربی میں شاعری کرنا اور نثر لکھنا ان کے عربی ذوق کا ثبوت ہے۔ اس زمانہ میں انھوں نے اردو اور فارسی میں کچھ نہیں لکھا۔ اور اسی زمانہ میں ان کی عربی تعلیم ختم ہو گئی۔

حالی کے ذہنی ارتقا اور ادبی رجحانات میں یہ چہار سالہ بحرانی زمانہ کافی اہم ہے انھوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے خونیں ڈرامہ کو محض تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا۔ بلکہ اس ڈرامہ کے مظلوم اور ستم رسیدہ کرداروں کے ساتھ ہمدردی و محبت کا برتاؤ کیا۔ آنکھوں نے جو دردناک مناظر دیکھے، دل ان سے متاثر ہوا، اشک خونیں بہے، آہ آتشیں نکلی، اور ان سب نے مل کر حالی کی شاعری کو پرسوز و دلگداز بنا دیا۔ "اسی زمانہ میں الطاف حسین نے اپنا مشہور تخلص حالی اختیار کیا۔[2] اس سے پہلے وہ خستہ تخلص کرتے تھے۔ یہ تبدیلی، اسی انقلاب کا اثر ہو سکتی ہے۔

چار برس کے اس عرصہ میں دنیا بدل گئی، حریت و انقلاب کا معرکہ ختم ہو چکا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے بجائے، تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہو گئی تھی پورا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ انگریزوں کے ظلم و ستم نے خون کے دریا بہا کر ملک پر موت کی سی خاموشی طاری کر دی تھی بظاہر امن و امان ہوتا جا رہا تھا اور لوگ تلاش معاش میں باہر نکلنے لگے تھے۔ دہلی بھی شاعر معاش سے خالی نہیں تھے اس لئے وہ پھر ۱۸۶۱ء میں دلی کی طرف روانہ ہوئے۔ حالی پر اس دور کا بار بھی زیادہ ہو گیا تھا، پہلے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین دلی سے پہلی مرتبہ واپس آنے کے بعد پیدا ہوئے تھے جن کو ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے متبنیٰ کر لیا تھا اور حالی ہمیشہ انھیں برابر زیادہ کہتے تھے، اس چار برس کی مدت میں ان کے کئی اولادیں پیدا ہوئیں جن میں عنایت فاطمہ زندہ رہی

---

[1] مقالات حالی جلد اول صفحہ ۲۶۵۔ [2] یادگار حالی صاحبزادہ سید حامد حسین صفحہ ۳۲

Marfat.com

سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ اس طرح اخراجات برابر بڑھتے جا رہے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا، بڑے کے بھائی کی ایک تنخواہ اور تھوڑی بہت خاندانی جائداد کی آمدنی پر سب کا گزارہ تھا۔ حالی جب دلی پہونچے تو دنیا بدل چکی تھی۔ دلی کا شہر کیمپ بن چکا تھا۔ اس کی رونق اور چہل پہل سب نذر انقلاب ہو چکی تھی۔ اجنبی اور ظالم قوم کا تسلط تھا، شریف ذلیل ہو چکے تھے، خاکیوں کے لشکر نے جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی، سب لوٹ لیا تھا[1] لیکن جہان آباد اس لٹے پٹے حال میں بھی بہت غنیمت تھا۔ اب بھی وہاں علم و فضل کے قدر دان موجود تھے، علم و ادب اور شعر و سخن کے شیریں چشمے تشنہ کامان ادب کو سیراب کر رہے تھے۔ حالی دلی پہونچتے ہی ان محفلوں میں شرکت کرنے لگے، ان کا ذوق شاعری پھر زندہ ہو گیا۔ دیوان آنور کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :—

"اتفاق یہ ہے کہ محبت نے جس قید خانہ میں لے جا کر مقید کیا، سید آنور بھی اسی قید خانہ کے اسیر نکلے مخدومی محمد کرم اللہ خاں شیدا کا دیوان خانہ جود و سخا اور صداقت کا مرکز اور آزادوں کا ملجا و ماوی اور زندہ دلی کا جنم بھوم ہے، سالہا سال وہاں شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہیں اور ان صحبتوں میں سید آنور، سید ظہیر اور مرزا سالک اکثر شریک ہوتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے دستبردار ہو کر ہر شخص زبان حال سے اس شعر کا مضمون ادا کرتا تھا ؎

بزم مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ"[2]

تقریباً دو سال تک مولانا حالی تلاش معاش میں سرگرداں رہے، لیکن اس پراگندہ روزی کے زمانہ میں بھی وہ پراگندہ دل نہیں ہوئے بلکہ سکون قلب کے ساتھ اپنے دلچسپ مشاغل، تحصیل علم، مطالعہ کتب صحبت ارباب ادب اور شرکت محفل شعر و سخن میں مصروف و منہمک رہے، اسی زمانہ میں حسن اتفاق سے ان کی ملاقات نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ہو گئی، شیفتہ خود صاحب کمال تھے اور باکمالوں کے نہایت قدر داں۔ اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے، پہلے حکیم مومن خاں مومن، (المتوفی ۱۸۵۲ء) کو اپنا کلام دکھاتے تھے، اس کے بعد غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ حالی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اس نوجوان کو پیکر علم و عمل اور، سیرت و کردار کا مجسمہ پایا، حالی کی شرافت نفس نے شیفتہ کے دل پر اتنا زیادہ اثر کیا کہ انھوں نے اپنے بچوں کی اتالیقی کے لئے حالی کا انتخاب کر لیا، اور اپنے ساتھ جہانگیر آباد لیتے گئے اور نقش بند خاں کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد کر دی، مالک رام ایم، اے لکھتے ہیں کہ :—

---

[1] خطوط غالب حصہ دوم بنام انور الدولہ شفق صفحہ ۵۳ ۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔

[2] مقالات حالی حصہ ۲ صفحہ ۱۷۴۔

"جناب افضل بیگم دوسری بیوی سے دو لڑکے نقش بند خاں اور نواب محمد اسحاق خاں اور دو صاحبزادیاں ہوئیں، یہ نقش بند خاں ہی تھے جن کی تعلیم کے لئے حالی مقرر ہوئے تھے۔"[1]

مولانا حالی نے شیفتہ سے ملاقات کا ذکر خود کیا ہے :—

"غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا، حسن اتفاق سے نواب مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کیا کرتے تھے اور شعر کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہو گئی اور سات آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔"

یہ شناسائی ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی۔ حالی خمیمہ اُردو کلیات نظم میں لکھتے ہیں :—

"حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم ..... کی سرکار میں ..... ہو گیا۔"[2]

حالی کے لئے یہ تعلق نہایت مفید ثابت ہوا، ان کے آفتاب ادب کی درخشانی میں شیفتہ کی مصاحبت نے بڑا کام کیا۔ حالی شیفتہ کی سخن فہمی و سخن سنجی کے معترف ہیں اور اپنے میلان طبیعی کے چمکنے کا سبب ان کی صحبت بتاتے ہیں۔

"نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت اُن کا مذاق شعر بہت بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شوق سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا میلان طبیعی جو اب تک نکتہ چینی کے سبب اچھی طرح نمایاں نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اکثر فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا، مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔"

"وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات بیان میں ..... سادگی بالتزام و محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو شعر ..... اور یہ بات ..... شیفتہ اور غالب دونوں .....

---

[1] شاعر آگرہ خاص نمبر جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۳ [2] مقالات حالی حصہ اول صفحہ ۲۶۲ - ۱۶۳

Marfat.com

ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔[1]

اس سلسلہ میں حالی کا ایک شعر بھی بہت مشہور ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں　　شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا[2]

حقیقت میں شیفتہ کی آٹھ سالہ صحبت نے حالی کے جوہر شاعری کو جلا دی، اسی زمانہ میں ان کا ادبی کردار بنا اور شاعری کے اس عالیشان ایوان کی بنیاد پڑی جس کو بعد میں حالی نے تعمیر کیا، حالی مستقل طور پر جہانگیر آباد رہنے لگے، لیکن کبھی کبھی نواب صاحب کے ساتھ دلی جا کر مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے ان کو غالب سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی، وہ غالب کو صفات و خصائص انسانی کا مجموعہ سمجھتے تھے، اس پیکر انسانیت میں اگر انھیں کوئی کمی نظر آتی تھی تو وہ غالب کی مذہبی اعتبار سے بے اعتدالی تھی۔ حالی نے مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی، شیفتہ مرحوم بھی مذہبی انسان تھے، ان کی صحبت نے مذہبی رنگ کو اور نکھارا، حالی کو اپنے شفیق استاد کی یہ بے راہروی پسند نہیں آئی، انھیں سخت صدمہ تھا کہ مرزا غالب اپنی کبر سنی اور بزرگی کے باوجود علی الاعلان یہ کہتے ہیں ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

حالی کی دلی خواہش یہ تھی کہ مرزا غالب بھی صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو جائیں تاکہ عقبیٰ بن جائے ایک دن پیمانۂ صبر چھلک گیا اور انھوں نے مرزا غالب کی خدمت میں ایک لمبا چوڑا نصیحت نامہ لکھ کر پیش کیا۔

"ایک روز مرزا کی بزرگی، استادی اور کبر سنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح ان کو نصیحت کرنی شروع کی، چونکہ ان کا تقلل سماعت انتہا کے درجہ کو پہونچ گیا تھا، اور ان سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے کی جاتی تھی۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا خط لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا اشارے سے، غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔"[3]

یہ ناصحانہ و دوستانہ نصیحت جب غالب نے پڑھی تو ان کے بے ریا دل پر سخت چوٹ لگی۔ یہ زمانہ وہ تھا، جب غالب کے مخالفین اپنی شرافت نفس اور تہذیب و اخلاق کا مظاہرہ خطوں میں فحش نویسی اور دشنام طرازی سے کرتے تھے، غالب کو تکلیف ہوتی مگر وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے، حالی کی یہ نصیحت آمیز تحریر اگرچہ بہ بنائے خلوص و محبت تھی مگر صرف ظاہری باتوں پر مبنی تھی، غالب نے کردہ گناہوں کا اعتراف

---

[1] مقالات حالی، حصہ اول، صفحہ ۲۶۶ - ۲۶۷۔

[2] شیفتہ کا شعر یوں بھی ہے :۔ حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں ؤ غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا۔

[3] یادگار غالب صفحہ ۴۸ - ۴۹۔

Marfat.com

کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ"[1]

مولانا حالی اس کے بعد واپس چلے گئے، دوسرے دن مرزا غالب مرحوم نے اسی مضمون کے متعلق ایک غزل لکھ کر حالی کے پاس بھیجی، جس کا مطلع یہ ہے ؎

بمقصدے کہ مرآں را رہ خدا گویند — برد بر در کہ ازاں سو بیا بیا گویند

مولانا حالی نے اس کے جواب میں ایک مختصر قطعہ لکھ کر بھیجا جس میں شکر و شکایت دونوں کے پہلو نمایاں تھے۔

تو اے کہ رونق ہیجا منیاں بہم بہ شکست — ز نظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی

مرزا غالب اپنے شاگرد رشید کا یہ قطعہ پڑھ کر خاموش نہیں رہے بلکہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو مخاطب کر کے نہایت لطیف پیرایہ اور بلیغ انداز میں حسب ذیل پارچہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری — ہمی بہ لطف تو خود را ازیں سبب دانی کہ

چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم

دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال — بر آں سرم کہ در آں نیستی ایں دکار کنم

یکے ادائے عباداتِ عمر پیشینہ — دگر بہ پیش گہِ مالی استغفار کنم

ادا شناس شاگرد سمجھ گیا کہ اس کی نصیحت سے غالب کو کتنی تکلیف ہوئی، معذرت نامہ بھیجا جس میں الفاظ چن چن کر معذرت کی۔

تو اے کہ عذر فرستادہ بسوے رہی — سزد کہ جان گرامی بر آں نثار کنم

چو شکوہ جز بہ تقاضائے دوستی نہ بود — ز غیر شکر و شکایت ز دوستاں کنم

بر آں سرم کہ اگر مرگ امان دہد زیں پس — ز کارہائے جہاں قاعدہ یہ سکار کنم

تذکرہ تو بہ نماید، ز تفتہ استغفار — دگر سیاس تو پنہاں و آشکار کنم

شفیق استاد، اپنے عزیز شاگرد کی محبت و خدمت کی قدر کرتا تھا۔ اس لیے یہ [illegible] کرنے کا حکم لکھ دیا" بس اب بہت بخشی موقوف" اور اطاعت گزار شاگرد [illegible] غالب کے دل میں حالی کی جو قدر و منزلت تھی اس کا سبب یہی تھا کہ حالی جیسا فرمانبردار نیک ذہین اور باشعور شاگرد ان کو مشکل سے ملا تھا۔ حالی نے جوانی کی اس نصیحت کو عمر بھر [illegible] تعبیر کرتے رہے اور ہمیشہ افسوس کرتے رہے۔

---

[1] یادگار غالب، صفحہ ۲۰۰ ۔ [illegible] یادگار غالب، صفحہ ۲۰۱

Marfat.com

اس واقعہ کے بعد مولانا حالی جہانگیر آباد واپس چلے گئے، لیکن دل استاد کے پاس ہی لگا رہا کیونکہ غالب اپنی مسلسل علالت اور پیرانہ سالی کی وجہ سے مرنے کی راہ دیکھ رہے تھے، بالآخر وہ وقت موعود آپہونچا جس کے وہ منتظر تھے۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

پنجشنبہ ۲ رذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو مرزا غالب کا انتقال ہوگیا، حالی اس وقت دلی میں موجود تھے، جنازے میں شریک ہوئے اور شفیق استاد کے غم میں اس طرح اشکبار ہوئے کہ سارا جہان اشکبار ہوگیا، یہ صدمہ حالی کے لئے ناقابل برداشت تھا، اُن کے لئے دنیائے ادب سونی ہوگئی کہ

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

یہ مرثیہ نہیں، جگر کے ٹکڑے ہیں جو آنسوؤں میں مل کے بہ نکلے ہیں، یہ مرثیہ غم سیال ہے، ایک ایک لفظ پیکر حزن وملال ہے، سوگوار وغمزدہ حالی نے کیسے بھولے پن اور سیدھے سادے انداز میں اپنے غم انگیز جذبات کی ترجمانی کی ہے:

دل مضطر کو کون دے تسکیں ماتم یار غمگسار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

قبر کو دیکھ کر حالی بے قرار ہوجاتے ہیں، عزادارانِ میت سے کہتے ہیں۔

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہل میت، جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

یہ بات قابل قبول کہاں ہوسکتی تھی، غالب کے لئے آئین شریعت سے کیسے انحراف کیا جاتا؟ اس لئے آخری دیدار کے لئے کہا۔

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے غالب بے مثال کی صورت
اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

لیکن حالی کا کیا ہوگا؟ کیونکہ ابھی تک

شعر میں ناتمام ہے حالی غزل اس کی بنائے گا اب کون؟

غرض مولانا حالی نے اپنے استاد کا مرثیہ اس سوز وگداز کے ساتھ لکھا کہ اُردو شاعری اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قطعۂ تاریخ رحلت غالب بھی حالی نے لکھا اور اس شعر سے تاریخ وفات نکالی۔

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۱۲۱۱ ۳۰۰ ۲۰۹۶ ۱۲۸۵ھ

Marfat.com

مولانا حالی، شیفتہ کے ساتھ دلی آتے رہتے تھے، اور قیام کرتے تھے، جس سے اکابرین شہر سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی، سرسید سے حالی کی ملاقات، شیفتہ ہی کی وساطت سے ہوئی تھی، یہ ملاقات، غالباً ۱۸۶۸ء میں ہوئی تھی" ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سرسید سے حالی کی ملاقات علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کی مجلس میں شیفتہ نے کرائی تھی، یہ ملاقات ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان کسی زمانہ میں ہوئی ہوگی[1]" حالی نے سب سے پہلے "سید احمد خاں اور اُن کے کام" پر ایک مضمون لکھا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں سرسید کے کاموں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ان کے کاموں کو سراہا ہے آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ:-

"اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کا خوش کرنا منظور نہیں نہ اُن کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور وہ مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے[2]"

حالی پہلی ہی ملاقات میں سرسید کی زبردست شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور دل و جان سے ان کے بلند مقصد کے حامی ہو گئے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہ

سرسید نے سب سے پہلے حالی کا ذکر اپنے پرچہ تہذیب الاخلاق میں لاہور کے مشاعروں کے سلسلہ میں کیا ہے۔ یہ زمانہ ۱۸۷۴ء کا ہے اور حالی اور سرسید کی ملاقات کو چھ سات برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں حالی سرسید سے قریب تر ہوتے گئے، یہاں تک کہ عمر بھر انھیں کے ہو رہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ سرسید سے حالی کی ملاقات کرانے والے، یعنی شیفتہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے، غالب کی وفات بھی، سرسید کی ملاقات کے فوراً بعد ہوئی تھی، اسی کے بعد شیفتہ بھی چل بسے۔ حالی کا رفیق و محسن ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ ابھی دل ناشاد، استاد کی موت پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا تھا کہ اُردو ادب کا جوہری، اور حالی کا قدرداں بھی سدھار گیا۔ حالی کو بیحد صدمہ ہوا۔ شیفتہ کی موت سے نہ صرف ان کی علمی و ادبی زندگی میں خلا پیدا ہو گیا بلکہ فکرِ معاش دامنگیر ہو گئی، کیونکہ نواب مرحوم کے بعد جہانگیر آباد میں رہنا ناممکن تھا۔ اسی سبب وہ دہلی آ گئے قرآنی سے نواب مرحوم کی تاریخ وفات حالی نے نکالی جو شیفتہ کی قبر پر کندہ ہے۔

"وجزاھم بما صبروا جنات وحریرا" (سورۂ دھر) ۱۲۸۹ھ

حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین مظہر نے بھی شیفتہ کی تاریخ وفات نکالی۔

از سرزاری بباید گفت ایں رحمت حق بر محمد مصطفےٰ ۱۲۸۹ھ

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی صفحہ ۴۵۔ [2] مقالات حالی حصہ اول صفحہ ۲۰۰

Marfat.com

ان دونوں تاریخوں کے اعتبار سے شیفتہ کی وفات ۱۲۸۶ھ مطابق اپریل ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۰ء ہوتی ہے، لیکن ضمیمہ اُردو کلیات نظم حالی مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ کے صفحہ ۹۹ میں دیوان حسرتی (شیفتہ) کی تقریظ کی سُرخی یہ ہے :-

"تقریظ دیوان فارسی حضرت حسرتی رحمۃ اللہ تعالےٰ کہ در سال ہزار و ہشت صد و ہفتاد و دو مسیحی در زمان حیات مصنف مغفور نوشتہ بود"

یعنی ۱۸۷۲ء میں شیفتہ کو زندہ کہا ہے[1]

حالی نے عربی تاریخ کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

"چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اس لیے جنۃ کی جگہ جنات کر دیا گیا ہے"[2]

اور اس آیت سے کل عدد ۱۲۸۳ نکلتے ہیں جو صحیح نہیں ہو سکتے۔ میرے خیال میں و مشدد کو دو مرتبہ شمار کیا گیا ہے، اس سے ۱۲۸۹ مطابق ۱۸۷۲ء ہو جاتے ہیں، اس طرح حالی کی تقریظ سے مطابقت ہو جاتی ہے، شیفتہ کی وفات کے بعد مولانا حالی کا تعلق گورنمنٹ بکڈپو لاہور سے ہو گیا، وہاں انھیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اُردو کتابوں کی عبارت درست کرنے کا کام سپرد ہوا۔ ترجمۂ حالی میں لکھتے ہیں :-

"نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی"[3]

یہ کتابیں زیادہ تر طلبا کے نصاب تعلیم کے لیے لکھی جاتی تھیں اور ان میں مغربی ادب کے مفید اور بہترین مضامین کا انتخاب کر کے ترجمہ کیا جاتا تھا، یہی کتابیں حالی کی ادبی زندگی میں انقلاب عظیم کا سبب بنیں، جس سے خزاں رسیدہ اُردو کے چمن میں بہار آ گئی، وہ سرسبز و شاداب، تر و تازہ اور گلریز و گل بیز ہو گیا، ترجمہ کرنے کے علاوہ مولانا حالی دوسرے ادبی مشاغل میں بھی عملی طور پر حصہ لیتے تھے، اس زمانہ میں لاہور دوسرا جہان آباد بن گیا تھا، ماسٹر پیارے لال آشوب جن کی وساطت سے

---

[1] حالی کا ذہنی ارتقاء۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صفحہ ۲۳-۲۴ حاشیہ

[2] دیوان حالی، مطبوعہ نولکشور بک ڈپو لکھنؤ، صفحہ ۱۷۰۔

[2] جزاھم بما صبروا جنات و حریرا
۶ + ۱۱ + ۴۵ + ۴۳ + ۲۹۶ + ۵۴ + ۶ + ۴۱۹ = ۱۲۸۳ھ۔ اب اگر اس میں و مشدد کے ۶ عدد شامل کر دیے جائیں تو ۱۲۸۹ھ ہو جاتے ہیں۔

[3] مقالات حالی حصہ اول، صفحہ ۲۶۷۔

مولانا حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کو جگہ ملی تھی، بڑے با اثر اور ادب نواز شخص تھے، ان کی وجہ سے دلی کے ارباب کمال لاہور میں آ گئے تھے۔ آشوب کی ادارت میں "اتالیق پنجاب" محکمہ تعلیم کی طرف سے جاری کیا گیا، مولانا حالی کچھ عرصہ تک اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے جس کو سر سید مرحوم نے اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر لکھا۔

"آپ کو سررشتہ تعلیم میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر کی جگہ ملی"[1]

مولانا محمد حسین آزاد بھی اتالیق پنجاب کے سب ایڈیٹر تھے۔ اتالیق کے بند ہو جانے پر جب پنجاب میگزین نکلا تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور آزاد کے بعد مولانا حالی کچھ دنوں اس عہدے پر متعین رہے[2]۔

آزاد سے حالی کی ملاقات، لاہور ہی میں ہوئی، اور ادبی ذوق کی مناسبت نے بہت جلد دونوں کو قریب کر دیا۔ آزاد ۱۸۶۴ء میں لاہور آئے تھے اور میجر فلر ڈائرکٹر تعلیمات کے حکم سے اردو اور فارسی کی درسی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے پر مامور تھے۔ میجر فلر مولانا آزاد کی علمیت اور سلاست سے بہت متاثر تھا۔ اردو سے اسے خاص لگاؤ تھا، اس لیے وہ اس زبان کی توسیع و اشاعت کے لیے کوشاں رہتا تھا، مولانا آزاد نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور اپنے اہل وطن کو، اپنے ملک کی زبان پر رحم کرنے کے لیے پکارا کہ وہ اپنی شاعری کو تباہ ہونے سے بچائیں۔

میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائیڈ ناظم تعلیمات پنجاب مقرر ہوئے، کرنل موصوف کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن، "انجمن پنجاب" کے نام سے قائم کی، اس انجمن کا اہم مقصد یہ تھا کہ اردو کو جھوٹے اور مبالغہ اور گل و بلبل کے افسانوں سے پاک کیا جائے، مولانا آزاد تطہیر اردو کے سلسلے میں جدید خیالات و رجحانات پر روشنی ڈالتے رہتے تھے، نظم اور خیال موزوں کے باب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

"نظم درحقیقت ایک شاخ گلریز فصاحت کی ہے، جس طرح پھولوں سے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے، شعر سے روح تر و تازہ ہوتی ہے۔"

"شعر گلزار فصاحت کا پھول ہے، کلام کے الفاظ کی خوشبو ہے، روشنی عبارت کی ہے، علم کا عطر ہے، قوائے روحانی کا جوہر، تاثیر بھوتی کا رستہ ہے، دل کے لیے آب حیات ہے، گرد غم کو دل سے دھوتا ہے، طبیعت کو ہلاتا ہے، خیال کو عروج دیتا ہے، دل کو استغنا اور بے نیازی اور ذہن کو قوت پرواز دیتا ہے، گرد انتشار سے دامن دل کو پاک رکھتا ہے،

---

[1] تہذیب الاخلاق، صفحہ ۵۵۶۔

[2] تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، حصہ نظم، صفحہ ۴۸۔

Marfat.com

تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے[۵۱]"

آزاد نے اہل زبان کو غیرت دلائی کہ :—

"کیا حیف کی جگہ نہیں ہے کہ آج ہماری زبان حرفِ تاثیر سے خالی ہو؟ کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ اوروں کے سامنے ہماری زبان ضعف بیانی کے ساتھ ہزاروں نقصوں سے متہم ہو۔"

اس لیے "میرے اہل وطن آؤ! آؤ!! برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو..... تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گی[۵۲]"

آخر کرنل ہالرائیڈ کے ایما سے مولانا آزاد نے ۱۸۷۴ء میں جدید قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرع طرح کے بجائے کوئی عنوان دے دیا جاتا تھا، اس بزم مناظمہ میں مولانا حالی بھی شریک ہوتے تھے، بلکہ وہی رونق محفل ہوتے تھے اور انھیں کی نظمیں سب سے زیادہ پسند کی جاتی تھیں، لوگ ان کی نظمیں "ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور یہ تک بھول جاتے کہ رات بیت چکی ہے.....
سچ تو یہ ہے کہ انھیں کے دم سے ان مجلسوں کی رونق ہے[۵۳]"

مولانا حالی اس بزم مناظمہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :—

"لاہور میں کرنل ہالرائیڈ — کی ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادہ کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نیا تھا، جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم کریں، میں نے اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات، دوسری امید، تیسری رحم و انصاف اور چوتھی حب وطن پر لکھیں[۵۴]"

مشاعرہ کے مقصد کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں :—

"اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در دبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے[۵۵]"

ان مشاعروں کا سلسلہ گیارہ مہینوں تک قائم رہا۔ کرنل ہالرائیڈ حالی کے شیفتہ ہو گئے، حالی اور آزاد مشاعروں کی روح تھے، لیکن کلام حالی قبول عام ہوا، دونوں کا کلام اخبارات میں شائع ہوتا رہتا تھا، آزاد کا کلام آفتاب پنجاب میں اور حالی کا پنجابی اخبار میں چھپتا تھا۔ حالی کی مثنویاں مولانا آزاد کی

---

۵۱ مجموعۂ نظم آزاد، صفحہ ۱۲۔
۵۲ مجموعۂ نظم آزاد، صفحہ ۲۸، ۳۰۔
۵۳ مقالات کارساں دتاسی مقالہ ۱۸۷۴ء صفحہ ۳۵۔
۵۴ مقالات حالی، ترجمۂ حالی، صفحہ ۲۶۸۔
۵۵ مجموعۂ نظم حالی، صفحہ ۱۱۔

Marfat.com

نویوں کے مقابلہ میں زیادہ مشہور ہوئیں اور ادبی حلقوں میں بھی زیادہ پسند کی گئیں۔

"یہ امر حضرت آزاد کی طبع نازک پر گراں گزرا، اس وقت سے ان کا رخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔"[1]

بہرحال حالی سے آزاد کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے۔[2]

مولانا حالی کو لاہور پسند نہیں آیا، یہاں ان کا جی نہیں لگا، وہ دلی کے لیے بے قرار رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح لاہور سے چلے جائیں، شروع شروع میں وہ جب آئے تھے تو غربت و تنہائی کے ساتھ ساتھ امراض دبائی کا بھی شکار ہو گئے تھے۔ پردیس، بیماری اور تنہائی میں وطن کی یاد اس کی صحبتیں اور زیادہ یاد آتی تھیں، اپنی ایک غزل میں انھوں نے اپنے تاثرات قلبی اور احساسات غم کا اظہار کیا ہے۔

نہ واں پرسش نہ یاں تاب سخن ہے — محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے
رہے لاہور میں آکر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف — مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ — نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے

حالی اپنی تنہائی، بے چارگی، کس مپرسی اور بیماری کو بڑی طرح محسوس کر رہے تھے مگر دل کو بھی سمجھاتے بھی جاتے تھے۔

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور — تصور میں مرے کیا انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم — خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے

میر کی طرح حالی نے بھی اہل لاہور کو مخاطب کر کے اپنا تعارف ان الفاظ میں خود کیا ہے۔

بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول — جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس عصر کی بو — جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

بھلا حالی اور الفت سے تو نا لی
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

اس غزل کی نسبت مولانا حالی نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

"یہ غزل تقریباً ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں اس وقت لکھی تھی جب [illegible]
ملازمت دلی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا، اس وقت اول تو دلی سے جدا ہونے کا [illegible]

---

[1] حیات حالی، مولوی خواجہ احمد فاروقی، صفحہ ۱۶۹۔
[2] تفصیل کے لیے دیکھیے ہفتہ وار آفت گورنمنٹ لاہور ۱۸۷۰ء [illegible]

Marfat.com

تھا، دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی، وہاں پہونچتے ہی نہایت سخت وبا آئی اور وبائے مہینہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور شور رہا، آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہوگیا، اس تنہائی اور سراسیمگی، غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے تھے[1]:

مولانا حالی کے دل میں وطن کی یاد میں جو کرب و اضطراب اور درد تھا وہ ان کی مثنویوں برکھا رت اور حب وطن میں کئی جگہ پر ظاہر ہوگیا ہے، آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگے تھے، ملازمت سے مجبور تھے مگر تاب کے۔ موقع کی تلاش میں رہے اور جیسے ہی دلی کے اینگلو عربک کالج میں مدرسی کی جگہ خالی ہوئی۔ حالی لاہور سے دلی چلے آئے۔

مولانا حالی آخر ۱۸۷۴ء یا آغاز ۱۸۷۵ء میں اینگلو عربک اسکول دلی میں عربی کے مدرس اول کی حیثیت سے مقرر ہوئے، یہ ملازمت مولانا کی طبیعت کے موافق تھی، غم لاہور حب وطن میں بدل چکا تھا، وطن میں اور مرضی کے مطابق کام مل جانا، حالی کے لئے نعمت عظمیٰ سے کم نہ تھا، وہ بڑی محنت، توجہ اور دلسوزی کے ساتھ طلبا کو پڑھاتے تھے، طلبا ان کی بڑی عزت کرتے تھے ان کا دل لگ گیا۔ یہی زمانہ ان کے لئے ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوا، تقریباً بارہ برس تک وہ مسلسل کام کرتے رہے۔ اس بارہ برس کے عرصہ میں انھوں نے مہتم بالشان ادبی کام کئے، ان کا زندہ جاوید شاہکار مسدس، مد جزر اسلام، ان کے جذبات غم کا تاج محل۔ مناجات بیوہ، ان کی کردار نگاری کا مرقع، حیات سعدی، اور دوسری چھوٹی بڑی تعلیمی و قومی مثنویاں سب اسی زمانہ (۱۸۷۵ تا ۱۸۸۶ء) کی یادگار ہیں۔

اس بارہ برس کے عرصہ میں متعدد واقعات، اور حادثات ایسے ہوئے جنھوں نے ان کے دل پر کافی اثر کیا۔ قوم و ملک کی تباہی کا غم، زخم نہیں بلکہ ناسور بن چکا تھا، قومی نظموں، تقریروں اور مضامین کے علاوہ مرثیے بھی، ان کے جذبات غم کی ترجمانی کرنے کے لئے ناکافی تھے، اس زمانہ میں انھوں نے مختار الملک سر سالار جنگ کی وفات پر فارسی میں ایک نہایت دردانگیز مرثیہ لکھا، جس کا ایک ایک حرف تصویر غم ہے،

کیست در ہند کزیں غم لب حسرت نہ گزید — کیست از قوم کزیں غصہ گریباں نہ درید
تا بجائے کہ چوں ایں نالۂ جانکاہ رسید — حالی گوشہ نشیں ہم ز جگر آہ کشید

اجل گر تن بے جاں تہ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکو نامیش از یاد بری[2]

---

[1] حاشیہ دیوان حالی، صفحہ ۹۶۔ مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ، پانچواں ایڈیشن۔

[2] مطبوعہ ریاض الاخبار، گورکھپور، جلد ۲ نمبر ۱۱، مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء صفحہ ۶۔

خواجہ امداد حسین جنھوں نے مولانا حالی کو بیٹوں کی طرح پالا تھا ۱۸۸۶ء میں سخت بیمار ہوئے اور علاج کی غرض سے دلی آکر مولانا کے پاس ٹھہرے۔ حالی نے بڑے بھائی کے علاج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کوئی دوا کارگر نہیں ہوئی، چارناگر مجبور تیمارداری بے بس ہو گئے۔ آخر وقت ہو موعود آ ہی گیا، اور خواجہ امداد حسین نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حالی کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا وہ باوجود صبر و ضبط کے عادی ہونے کے اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے، یہ بڑے بھائی کی موت نہیں تھی بلکہ شفیق باپ کی موت تھی۔ حالی نے بچپن ہی سے بڑے بھائی کو باپ کی طرح پالنے والے کے روپ میں دیکھا تھا۔ ان کا پیمانہ صبر چھلک گیا، پچاس سال کے ہوتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

دیکھ کر رو دیئے پڑے آنسو — نہ کر سکے چوٹ دل پہ کھا بیٹھے

یہ قطرہ ہائے اشک جن میں پارہ ہائے جگر، اور لختہائے دل شامل تھے، مرثیہ کی شکل میں قلم کے ذریعہ سے صفحہ قرطاس پر ٹپک پڑے، ایک ایک قطرہ اپنے اندر درد و غم کا بحر بیکراں رکھتا ہے۔

کل سوگ میں بھائی کے اسے دیکھ کے چپ چاپ — حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحر معانی!
ہنستا ہے، نہ روتا ہے، نہ بدلہ ہے نہ نوحہ — کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ٹھانی

غم ہم نے اک آہ کی اور اپنے کرب و اضطراب کی ترجمانی اس طرح کی۔

اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے — دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی
آتے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے — موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی — غم بھائی کا مر جانے کی ہے اس کے نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا — سوکھی ہوئی کھیتی پہ دیا باپ کے پانی
جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے — لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی
یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ! — یہ چپ نہیں مر جانے کی ہے دل کے نشانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پہ
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

باپ کی سوکھی ہوئی کھیتی میں پانی دینے والے کو خود پانی پانے کے لئے ترستا چھوڑ جانے والے بھائی کے غم کی ترجمانی حالی کے قلم نے کی ہے۔

یہ نمونہ اخلاق حسین کی تلمیح کردہ ہے۔

"السلام علی عباد الذین اصطفیٰ" ۱۲ منہ

---

۱۲ دیوان حالی، طبع دوم، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ صفحہ ۱۰۱، سنہ ۱۳۰۱ ہجری درج ہے جو عیسوی سال کے مطابق ہوتا ہے۔ مرثیوں کا یہ مجموعہ پہلی بار ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا تھا۔ سنہ ۱۳۰۱ھ سنہ ۱۸۸۳ء کے مطابق ہوتا ہے

Marfat.com

یہ وہی اخلاق حسین ہیں جن کو خواجہ امداد حسین نے حالی سے لے کر پالا تھا۔ حالی انھیں ہمیشہ برادرزادہ کہتے تھے۔

"یہ تاریخ برادر زادۂ راقم حافظ اخلاق حسین سلمہ اللہ تعالےٰ نے اپنے والد مرحوم کی وفات سے چند روز بعد عین تلاوت کے وقت قرآن مجید سے اقتباس کی تھی جس سے بے کم و کاست سال وفات برآمد ہوتا ہے[1]۔"

جنوری ۱۸۸۸ء میں مولانا حالی اینگلو عربک اسکول دلی سے بدل کر ایچیسن کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبا کے اتالیق مقرر ہوئے، لیکن طلبا کے رکھ رکھاؤ سے وہ بہت جلد دل برداشتہ ہو گئے۔ تین مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ اس عہدہ سے علیحدہ ہو جانے کے لئے بیتاب ہو گئے۔ بالآخر جون ۱۸۸۸ء کو دلی واپس آ کر اپنی جگہ پر کام کرنے لگے[2]۔

انھی دنوں سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام حیدرآباد دکن شملہ آئے ہوئے تھے، سرسید نے ان سے درخواست کی کہ علی گڑھ کالج کا معائنہ فرمائیں۔ سر آسمان جاہ جب علی گڑھ تشریف لائے تو سرسید نے حالی کا بھی تعارف کرا دیا۔ سر آسمان خود بھی حالی کے فضل و کمال سے واقف تھے، سرسید کے تعارف و تعریف اور رد و بدل گفتگو نے مئے سہ آتشہ کا کام دیا، نواب موصوف نے امداد مصنفین کے صیغے سے پچھتر روپیہ ماہوار وظیفہ کئے جانے کا حکم دے دیا، حالی اپنی ملاقات اور وظیفے کے متعلق لکھتے ہیں :-

"میں جب کہ اینگلو عربک اسکول دلی میں مدرس تھا، نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے، اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا، نواب ممدوح نے بصیغۂ امداد مصنفین ایک وظیفہ بتعداد پچھتر روپیہ ماہوار کا میرے لئے مقرر فرما دیا[3]۔"

اسماعیل پانی پتی نے لکھا ہے کہ سرسید نے سر آسمان جاہ کی امداد کے موقع پر مولانا حالی کو دہلی سے بلایا تھا[4]، لیکن حالی کے اپنے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ خود گئے تھے۔ صالحہ عابد حسین نے وظیفے کے متعلق لکھا ہے :-

"واقعہ دراصل یوں ہے کہ حالی سے سرسید نے پوچھا تھا کہ آپ کے لئے کتنا وظیفہ مقرر کیا جائے تو انھوں نے وہی رقم بتائی جو انھیں عربک اسکول سے ملتی تھی[5]۔"

---

[1] دیوان حالی، مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ، صفحہ ۱۷۲۔

[2] مکتوبات حالی حصہ اول صفحہ ۱۲۱۔ و مکتوبات حالی حصہ دوم صفحہ ۹۵ و صفحہ ۱۰۱۔

[3] مقالات حالی، ترجمۂ حالی صفحہ ۲۷۰۔ [4] تذکرہ حالی، اسماعیل پانی پتی صفحہ ۶۵۔ [5] یادگار حالی، صالحہ عابد حسین صفحہ ۴۵

Marfat.com

حالی کو عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ تنخواہ ملتی تھی جس کے تخمیناً پچھتر روپیہ سکہ حالی ہوتے تھے اور حالی کی قناعت پسند طبیعت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ ضرورت سے زائد طلب زر کرکے موقع سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے یہی رقم انھوں نے وظیفے کے لئے بھی بتائی، مکتوبات حالی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وظیفہ فروری ۱۸۸۹ء تک نہیں ملا اور جون ۱۸۸۹ء میں جاری کیا گیا[1]۔ اس موقع پر مولانا حالی نے بطور شکریہ ۲۷۔ اشعار کا ایک قطعہ سرآسماں جاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض — کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے — اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

سرآسماں جاہ سے حالی کے تعلقات یونہی فیوضاً بڑھتے گئے، حالی نے ان کی شان میں کئی قصائد لکھے جن میں حقیقی اوصاف کا بیان اور مبالغہ سے پرہیز ہے۔

وظیفہ مقرر ہو جانے کے بعد حالی نے قناعت و استغنا کا ایسا نمونہ پیش کیا جو صرف خاصان خدا، ہی کا حصہ ہے، وہ ملازمت فکر معاش سے نجات حاصل کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ وظیفہ مل جانے کے بعد یہ فکر جاتی رہی، ان کی طبیعت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ تصنیف و تالیف کے [illegible] بھی لیں اور اسی وقت میں مدرسی بھی کریں اس کو وہ دیانت کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے [illegible] سنہ ۱۸۸۹ء میں معلمی سے استعفا دیدیا اور سکون قلب کے ساتھ تصنیف و تالیف کے [illegible]

حالی کے ذہنی ارتقا، ادبی نشوونما، شعور کی پختگی، کردار کی بلندی میں سب سے زیادہ [illegible] دلی کو ہے۔ شیفتہ کی ملاقات سے پہلے وہ دلی میں تقریباً تین ساڑھے تین سال رہ چکے تھے اور [illegible] برس ۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ وہ روپوش ہو کر طلب علم کے لیے آئے تھے اور دوسری [illegible] جب کہ وہ حصول معاش کے لیے آئے تھے، اس زمانہ میں ان کی تخلیقی قوتوں کی نشوونما [illegible] سنہ ۵۷ء کے حالات نے ان کو عبرت و بصیرت اور بصارت عطا کی، پھر شیفتہ کی صحبت [illegible] ان کی سخن فہمی و سخن سنجی کو وہ شعور بخشا، جس نے ان کو آئندہ چل کر مجدد ادب بنا دیا، [illegible] قیام میں آزاد کے ساتھ نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی، بک ڈپو کی ملازمت نے مغربی [illegible] روشناس کیا۔ حقیقت پسندی کے اس بیدیسر مایۂ ادب کے ساتھ وہ پھر دلی آئے [illegible] میں بارہ سال تک معلمی کرتے رہے، ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ [illegible] جگہ پر رہے۔ حالی کو کام کرنے کے لئے یہ زمانہ سب سے اچھا ملا، ان کی بہترین تخلیقات [illegible] زمانہ میں ہوئیں۔ وحید قریشی لکھتے ہیں:—

"دلی ان کا ادبی وطن تھا یہاں تخلیقی لگن شاعرانہ کی قوت زیادہ تھی۔ [illegible]

---

[1] مکتوبات حالی۔ جلد دوم۔ صفحات ۱۱۱ - ۱۱۲۔

تخلیقات کے لیے دلی سے زیادہ سازگار کوئی جگہ نہیں تھی۔"[۵۱]

صرف منظوم تخلیقات ہی نہیں بلکہ ان کے نثری کارنامے بھی اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

"دہلی کے قیام کا زمانہ حالی کی قابلیتوں کے پختہ اور بارآور ہونے کا زمانہ ہے، ان کی شاعری یہیں معراج کمال کو پہونچی، یہیں انھوں نے نثر نگاری شروع کی، یہیں ان کے نظم و نثر کے شاہکار کارنامے حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری لکھے گئے۔"[۵۲]

ملازمت سے سبکدوش ہوجانے کے بعد حالی چاہتے تو یہی تھے کہ وہ اپنے ادبی وطن کو نہ چھوڑیں اور یہیں تصنیف و تالیف کا کام کریں، لیکن دلی کی علمی فضا کو پہلے ۱۸۵۷ء کے اثر نے نگلا۔ اس کے بعد اقتصادی بدحالی نے برباد کیا۔ رفتہ رفتہ سارے ہمصفیر ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔

غالب ہے نہ شیفتہ، نہ نیر باقی — وحشت ہے نہ سالک، نہ آذر باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

رہنے کی ویرانی نے دل برداشتہ کردیا، قدرشناسوں کے اٹھ جانے کے بعد، دلی میں رہنا قدر گنوانے کے مترادف تھا۔

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدرشناس — قدر یاں کی کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

معاش سے بے فکری ہوجانے کے بعد حالی دلی کو الوداع کہہ کر اپنے آبائی وطن پانی پت ۳ اگست ۱۸۸۹ء کو چلے آئے[۵۳]۔ اور خلوت نشین ہوگئے۔

کی ہے خلوت پسند حالی نے — اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

دلی سے چلا آنا، حالی کے لئے سخت رنج اور تکلیف کا باعث تھا جس کا اندازہ حسب ذیل شعر سے ہوسکتا ہے:

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر — گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

حالی نے پانی پت میں خلوت پسند کی تھی لیکن خلوت کی ہنگامہ آرائیوں سے انھیں نجات نہیں ملی وہ دلی کی مجلس ترک کرکے یہاں آئے تھے، لیکن اپنی ذات سے خود انجمن بن گئے تھے۔ ہر وقت احباب و اعزا اور ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس طرح ان کا زیادہ تر وقت ملاقات کی نذر

---

[۵۱] ماہ نو کراچی اکتوبر ۱۹۵۴ء جلد ۷، شمارہ ۷، صفحہ ۲۲۔

[۵۲] جدید اردو شاعری صفحہ ۹۳۔ حیات سعدی کے علاوہ بقیہ تینوں کتابیں پانی پت میں لکھی گئیں۔ مقدمہ شعر و شاعری ۱۸۹۳ء یادگار غالب ۱۸۹۷ء اور حیات جاوید ۱۹۰۱ء میں، معلوم نہیں سروری صاحب نے کس طرح ان کتابوں کی تصنیف و تالیف کا زمانہ قیام دلی بتایا ہے۔

[۵۳] مکتوبات حالی حصہ دوم، صفحہ ۱۱۹۔

ہو جاتا تھا اس لیے انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ اپنے نئے مکان میں جو بستی سے دور تھا، اٹھ جائیں یہ مکان خواجہ سجاد حسین کے مشورہ اور روپیہ سے تعمیر ہو رہا تھا۔ ۱۸۸۸ء سے اس کی تعمیر شروع ہوئی تھی اور ۱۸۹۲ء میں ختم ہوئی۔[۵۱]

مولانا حالی اس نو تعمیر و نامکمل مکان میں رجب ۱۳۰۸ھ مطابق فروری ۱۸۹۱ء میں اٹھ آئے[۵۲] حالی پانی پت چلے آنے کے باوجود دلی اور علی گڑھ برابر آتے جاتے رہتے تھے، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ان کی شرکت لازمی تھی، ان جلسوں کے لئے انھیں کوئی نہ کوئی نظم لکھنی اور پڑھنی پڑتی تھی، حالی کی شرکت کے بغیر یہ جلسے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ حالی کے ساتھ نذیر احمد اور دوسرے حضرات بھی شریک ہوتے تھے مولانا حالی علی گڑھ کالج کی امداد کے سلسلے میں، سرسید کے ساتھ ۲۳ اگست ۱۸۹۱ء کو حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے، اس وفد میں مولوی ذکاء اللہ، مولوی زین العابدین خاں، حاجی اسماعیل خاں، مولانا شبلی اور دوسرے حضرات شامل تھے، وفد کو یہ توقع تھی کہ وہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد کالج کے لئے جمع کرلے گا۔[۵۳]

مولانا حالی نے اس موقع پر ایک قصیدہ ۶۵ اشعار پر مشتمل لکھا، اس قصیدہ میں انھوں نے نظام دکن میر محبوب علی خاں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے، پھر وکٹوریہ کی تعریف اور اس کے بعد سرسید کے قومی اور ملکی کارناموں کا ذکر ہے، آخر میں حیدرآباد کی سیاسی و سخاوت کا بیان کرتے ہوئے صدر اعظم کی تعریف کی ہے۔ مولانا حالی تحریر فرماتے ہیں:

"۱۸۹۱ء میں جو راقم اور مولانا محمد شبلی نعمانی اور دیگر بزرگان قوم آنریبل سرسید احمد خاں بہادر کے ہمراہ علی گڑھ محمڈن کالج کی طرف سے بطور ڈیپوٹیشن کے حیدرآباد دکن میں تشریف لے گئے تھے، حالی نظام حاضر ہوئے تھے، اس موقع پر ایک عام جلسہ بصدارت نواب وقار الامرا بہادر بشیر باغ میں منعقد ہوا تھا، جس میں راقم نے اور مولانا محمد شبلی نے اور بعض اور دوستوں نے کچھ نظمیں سرکار عالی کے شکریہ میں پڑھی تھیں، جلسے کے بعد جناب صدر انجمن نے مولانا محمد شبلی کو خاص طور پر ہماری نظمیں دوبارہ سننے کے لیے دولت خانہ پر بلایا تھا، وہاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اس وقت موزوں کیا گیا تھا، راقم نے پڑھا تھا"

اس قطعہ میں سات اشعار ہیں، حالی نے اپنا شعری نظریہ ان اشعار میں ظاہر کیا ہے:

شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال ابنائے دہر
جو لیاقت ہم میں ہے دربار و دعوت میں کہیں
گر یہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت
اور جگر انگشت کھسنے کی نہیں چھوٹی کہیں

---

۵۱ یادگار حالی، مصاحبہ عابد حسین، صفحہ ۴۰۔
۵۲ مکتوبات حالی، جلد دوم، صفحہ ۱۲۱۔
۵۳ مکتوبات حالی، حصہ دوم، صفحہ ۱۲۴۔
۵۴ حاشیہ دیوان حالی، انوار مطابع، صفحہ ۱۳۶۔

Marfat.com

رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک قصور — درگزر فرمائیں گے سرکار اس سے، ہے یقیں
اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں، مگر — جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں

سر آسماں جاہ بہادر نے حالی کے وظیفے میں بقدر پچیس روپیہ ماہوار اضافہ کر دیا، اب انھیں سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا، حالی کی شکر گزار طبیعت نے شکریہ کے طور پہ سات اشعار کا ایک قطعہ پیش کیا۔

مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے — شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار
قدردانی گر زمانے میں یونہی ہو جائے عام — پائیں گے مانگے مرادیں اپنی سب امیدوار

تقریباً دو مہینے حیدر آباد میں قیام کر کے ربیع الاول ۱۳۰۹ھ مطابق (اکتوبر ۱۸۹۱ء) کے آخر میں مولانا حالی واپس آ گئے۔ اہالیان حیدر آباد، حالی کی سیرت، شخصیت، قابلیت اور علمیت سے بے حد متاثر ہوئے، مولانا حالی نے ان سب کے دلوں پہ گہرے نقوش چھوڑے۔

اسی سال دسمبر کے آخری ہفتے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس علی گڑھ میں ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ طبقے کے حالات پر مشتمل ایک ترکیب بند پڑھا جس میں متوسط درجے کے درمیانی زندگی کو سراہا ہے۔ آخری بند میں اتفاق و اتحاد پر زور دیا ہے۔

اتفاق قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل — لائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی
مال و دولت نا مبارک ہے نہ ہو گر اتفاق — قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی

پھر انجمن کے کاموں کی افادیت کو بتایا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ قوم کو بیدار کر رہی ہے۔

انجمن ہے قوم کی، ہنگامۂ شادی نہیں — ایک دن کا کام کچھ رو ما کی آبادی نہیں

حالی باوجود اپنی علالت کے اپنے دیوان اور اس کے مقدمے کی ترتیب میں مشغول رہے اسی زمانے میں حاذق الملک حکیم محمود خاں کی وفات ہو گئی۔ حکیم صاحب مشرقی تہذیب و تمدن کی جیتی جاگتی نشانی تھے، ان کی موت ملک و ملت کے لئے ناقابل برداشت سانحہ تھا، حالی کا دردمند دل اس سے بے حد متاثر ہوا۔ "محمود خاں کے دم سے قوم کی پت" جو قائم تھی وہ بھی ختم ہو گئی، جہان آباد کو جس پر ناز تھا وہ بھی رخصت ہو گیا، حالی نے فخر جہان آباد، اور یادگار سلف کی یاد میں ایک دردناک مرثیہ لکھا، عمائدین دلی نے اصرار کیا کہ مولانا حالی خود اس مرثیہ کو پڑھیں، چنانچہ مفتی محمد صدر الدین خاں مرحوم کی کوٹھی پہ ۲۰ محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۲ء بروز یکشنبہ ایک جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ مولانا حالی نے مرثیہ سے پہلے "مرثیہ لکھنے کی ضرورت" پر ایک جامع تقریر کی، اس تقریر میں عرب کے بعض مرثیہ نگاروں کا ذکر کر کے ان کی خصوصیات بتائی ہیں اور کربلا کے متعلق مرثیوں کی خوبیاں بیان کی ہیں،

سلہ مکتوبات حالی: حصہ دوم، صفحہ ۱۵۱۔

Marfat.com

نیز مرثیوں سے جو جو فوائد ہوئے ہیں اُن پر روشنی ڈالی ہے، آخر میں مرثیہ کیوں اور کس لئے لکھے جائیں اور موجودہ زمانہ میں ان کی کیا ضرورت ہے؟ ان پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

"ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ قوم میں سے جب کوئی قوم کا محسن اور خدمت گزار گزر جائے تو اس کی زندگی کے حالات قلمبند کئے جائیں، اس کی خوبیاں اور اس کے محاسن ملک میں شائع کئے جائیں اور شعرا جو قوم کی زبان ہیں تمام قوم کی طرف سے ان کے مرثیے لکھیں تاکہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے اور اس میں ہمدردی کی رمق باقی ہے۔"[1]

یہ مرثیہ مسدس میں لکھا ہے کل ۴۶ بند ہیں اور ہر بند میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ دلی کی خصوصیات اور مرحوم کی خوبیاں، ان کی قابلیت، ان کی انسانی ہمدردی، ان کی جامعیت کا ذکر بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے، جہان آباد کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی — ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی — اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

اگرچہ مولانا حالی مستقل طور پر پانی پت میں رہنے لگے تھے لیکن ادبی و تعلیمی قومی کاموں کی وجہ سے وہ نہ صرف دلی اور علی گڑھ جاتے رہتے تھے، بلکہ دوسرے مقامات پر بھی جایا کرتے تھے پانی پت کے علاوہ ان کا زیادہ تر قیام علی گڑھ یا دلی میں رہتا تھا، ان مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے کام کو نہایت پابندی کے ساتھ کرتے تھے۔ صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بیماری سے کسی طرح نجات نہیں ملتی تھی، لیکن جوانمرد حالی کے عزم و استقلال اور ہمت و محنت میں فرق نہیں آتا تھا، وہ اسی طرح اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے اور ہر سانس کو سرمایہ زندگی سمجھ کر اپنے فرائض نہایت مستعدی اور سرگرمی سے انجام دیتے تھے۔ کیونکہ

دم لینے کی فرصت کوئی کب پاتا ہے — آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام اُن کو جلدی بھگتاؤ — طلبی کا پیام وہ بلا آتا ہے

اسی لئے اپنی علالت، کبر سنی اور نقاہت کے ہوتے ہوئے بھی، وہ [illegible] ان کی تخلیقات نثر و نظم، اردو میں منارۂ نور ثابت ہوئیں۔ مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات سعدی زمانہ کی یادگار ہیں، حیات جاوید کی ابتدا بھی ۱۸۹۳ء میں کر دی تھی، لیکن اپنی علالت کی وجہ سے کام جاری نہ رکھ سکے۔ آپ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

---

[1] مقالات حالی، حصہ دوم، صفحہ ۱۶۔

"میں ایک مہینے سے سید صاحب کی لائف لکھنے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ مصروف تھا، مگر اب تین چار دن سے جب سے کہ یہ اطلاع (علالت کی) پہونچی ہے مطلق کام نہیں ہوتا"[51]

بہرحال حیات جاوید کی تکمیل ۱۹۰۱ء سے پہلے پہلے ہوگئی اور ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء کو حیات جاوید کا انڈکس مطبع میں بھیج دیا۔ اس کام میں ان کے چھ برس لگے۔ لکھتے ہیں:۔

"میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا"[52]

مگر مولانا کی یہ خاکساری ہے، انھوں نے بیسیوں مضامین، مقالے، اور تبصرے لکھے۔ جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے، ان کی حیات کا ایک ایک لمحہ ادبی و علمی کاموں کے لئے وقف تھا۔ یہ نہ رہتے تو بہت سے ادھورے کام سرانجام پا جاتے۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم کی وفات پر ۱۸۹۵ء میں فارسی زبان میں ایک مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ نواب صاحب کے صفات حمیدہ پر آنسو بہاتا ہے اور درد و اثر سے لبریز ہے۔

مستنیداں پُر نہ کردہ دامنِ معنی ہنوز — مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت
یاورانِ قوم را تا زیست یاور بود و یار — ہرچہ بتوانست در تائید شاں کوشید و رفت

انیسویں صدی نے ختم ہوتے ہوتے حالی کے قلب و جگر کو غموں سے فگار کر دیا، وہ خود مستقل طور پر مریض رہنے لگے تھے، محسنان قوم ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے تھے، تاہم وہ ادبی کاموں میں مشغول رہتے، حیات جاوید کی تکمیل کے لئے سخت فکرمند تھے اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد یہ کام پورا ہو جائے، مگر مشیت الٰہی کچھ اور تھی، صاحب حیات جاوید، محسن قوم، ناخدائے کشتیِ ملت اسلامیہ یعنی سرسید احمد خاں، ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ مولانا حالی کے دل پر جو بیتی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ اس صدمہ کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ فارسی میں محتشم کاشی کے طرز پر ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا۔ ایک ایک لفظ درد و اثر کا مجسمہ ہے۔

آہ از ایں تیر گزار اکز کماں انداختند — آہ کز یک ضربہ قومے نیم جاں انداختند
اے عجب کز ملت فردے ز افرادِ بشر — عالمے را از قیامت در گماں انداختند

اس مرثیہ میں کل سات بند ہیں اور ہر بند اس دیرینہ سال پیر کی مفارقت میں اشکہائے خونیں سے لبریز ہے، یہ سرسید کی موت نہیں تھی بلکہ تمدن و تہذیب، تعلیم و ثقافت اور رونق بزم اسلامیاں کی موت تھی۔

---

[51] مکتوبات حالی، جلد دوم، صفحہ ۱۸۰۔
[52] مکتوبات حالی، جلد اول، صفحہ ۴۴۔
[53] نقوش شخصیات نمبر ۲۔ صفحہ ۵۷۷۔

Marfat.com

رفت و با خود رونق بزم مسلمانی ببرد　　ملت از مرگش نہ پژمردہ مسلمانی بمرد

تیسرے بند میں حالی نے مرحوم کی انسانیت پر اپنے قلبی واردات یوں ظاہر کیے۔ پہلے انسانیت کی تعریف کی ہے کہ

چیست انسان؟ تپیدن در غم ہمسائیگاں　　از سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس　　در شبستان تنگ دل از محنت زندان شدن

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم　　گر توانی می نوانی سید احمد خان شدن

جور اخوان دیدن و در عشق اخوان زیستن

زخم پیکاں خوردن و مشتاق پیکاں زیستن

آخری بند کا آخری شعر سرسید اور حالی کے جذبات کا خلاصہ ہے[1]۔

مزد او این بس کہ در اصلاح خود کوشید زود　　کز شما غیر از شما مطلوب او چیزے نبود

غرض اس مرثیہ میں۔

"سرسید کے احسانات کا اجمالاً ذکر ہے اور ان تمام واقعات کی طرف اشارہ ہے جو سرسید کی زندگی میں خصوصیت کے ساتھ پیش آئے اور انھوں نے ان کا مقابلہ کیا[2]"

سرسید مرحوم کے غم میں آنسو خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ۲۴ اگست [illegible] عظیم صدمہ پہونچا۔ مولانا کی اہلیہ دس بجے شب میں اچانک ہیضہ میں مبتلا ہوئیں اور [illegible] گھنٹے کے بعد نو بجے دن میں انتقال کر گئیں۔ ۴۵-۴۶ برس کا ساتھ دفعتہً چھوٹ گیا۔ حالی کو اس ناگہانی موت پر سخت صدمہ ہوا۔ پیرانہ سالی اور مسلسل بیماری کی وجہ سے وہ بے حد پریشان [illegible] رفیق زندگی کا ایک سہارا تھا، وہ بھی ختم ہو گیا، اس پیکر صبر و تحمل کو جو صدمہ [illegible] سے ہو سکتا ہے، بیٹوں کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ کی محبت اور خوبیوں کو ہمیشہ یاد کیا کرو اور ہاتھ دعا کا دراز رکھو

الٰہی! مجھے اپنی محبت، اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی

زیادہ دے"

خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج و غم کا [illegible] ہے

تسلیم و رضا، صبر و تحمل کی یہ تلقین اور اس پر عمل، خاصان خدا کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے؟

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے　　گردن و تن ہو سر راہ میں جو خم ہے بلکہ

---

[1] حالی کا ذہنی ارتقاء صفحہ ۱۵۱۔

[2] یادگار حالی۔ مقالہ عابد حسین۔ صفحہ ۲۵۔

[illegible] حالی کی فارسی شاعری صفحہ ۲۱۳ [illegible] کا ذہنی ارتقاء

فرشتہ خصلت حالی اس کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ رفیق زندگی کے مرنے سے بیس دن پہلے ان کے ایک بھائی محمد علی کا بھی انتقال ہو چکا تھا[۱]۔

ان تمام صدمات کے باوجود، حالی کی ادبی مصروفیات میں کمی نہیں ہوئی وہ ہمت و استقلال کے ساتھ کام کرتے رہے، حیات جاوید کی تکمیل کی، مضامین اور مقالے لکھے، مقدد نظمیں لکھیں، ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے ایک معرکۃ الآرا مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ بھی ترکیب بند میں ہے، اس کے تیسرے بند میں انجیل مقدس کی کوئی نہ کوئی تلمیح موجود ہے، مرثیہ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

شاہ ہوں یا ہوں گدا محکوم ہوں یا حکمراں — وہ نہیں مرتے کبھی جیتی ہیں جن کی نیکیاں
جاگتا ہے ان کا تا روز قیامت نام نیک — گو کہ ہیں وہ بے خبر سوتے لحد کے درمیاں

مولانا نے حسب ذیل اشعار میں انجیل مقدس کی آیات کا مفہوم بڑی خوبی سے ادا کیا ہے[۲]۔

وہ تسلی پائیں گے دنیا میں جو جھیلیں گے غم — ہو چکے غم بس تسلی دے گی اب راحت تجھے
تو مبارک تھی کہ تجھ کو صلح تھی دل سے پسند — دے گا فرزندی کا اب اپنی خدا خلعت تجھے
تو مبارک تھی کہ تھا پہلو میں تیرے پاک دل — ہو مبارک خلد میں دیدار کی نعمت تجھے

یہ مرثیہ علی گڑھ ٹرسٹی کی حیثیت سے لکھا گیا تھا، اس لئے علی گڑھ کالج کی خصوصیات کا ذکر بھی کیا ہے، اس مرثیہ کے علاوہ مولانا حالی نے کئی نظمیں اور مضامین لکھے، جن میں گدایان قوم، قردن اولی کی حق گوئی، اور کلیات دلمیر پر تبصرہ، قابل ذکر ہیں۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے ایک ترکیب بند لکھا، لیکن اپنی علالت کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے۔ اس مرتبہ مولانا کو نمونیہ ہو گیا تھا اور ضعف و نقاہت بھی زیادہ تھا[۳]۔

مولانا اسی حالت میں رام پور گئے اور اپنی نظم پڑھی۔ اس نظم میں تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے اور والی رام پور کے اوصاف اور فضائل بیان کئے ہیں۔

تعلیمی خدمات کے صلے میں حکومت ہند نے عزت پسند حالی کو جون ۱۹۱۰ء میں شمس العلماء کا

---

[۱] مکتوبات حالی، حصہ دوم، صفحہ ۲۹۲۔

[۲] مولانا حالی نے حواشی میں ان اشعار کا حوالہ یوں دیا ہے (انجیل متی باب پنجم) اشعار کی ترتیب سے۔
مبارک وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔
مبارک وہ جو صلح کرانے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے نزدیک فرزند کہلائیں گے۔
مبارک وہ جو پاک دل ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔

[۳] مکتوبات حالی، حصہ اول، صفحہ ۷۴۔

Marfat.com

خطاب مرحمت فرمایا۔ یہ خطاب حالی جیسے خاموش، کم آمیز، اور نام و نمود سے بیزار انسان کے لئے وبال جان تھا، ۲۲ جولائی ۱۹۱۰ء کے خط میں خواجہ سجاد حسین مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہماسے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے، تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا، مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا۔ لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردسر کہاں"

مولانا کی تو یہ حالت تھی، لیکن ملک کے علمی و ادبی حلقے اس معزز خطاب پر مبارک باد دے رہے تھے اور خوشیاں منا رہے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے مختصر مگر بامعنی مبارکباد کا یہ خط بھیجا۔

"مولانا! آپ کو تو نہیں لیکن خطاب "شمس العلمائی" کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔ بخار کی حالت میں اسی قدر لکھ سکتا تھا"

شبلی ۔۔ ۲ جون ۱۹۱۰ء[1]

پانی پت آنے کے بعد مولانا حالی نے اس کی علمی بے مائگی کو محسوس کر لیا تھا۔ شرفاء کی اس بستی میں نہ کوئی انگریزی اسکول تھا، نہ کوئی پبلک دارالمطالعہ، مولانا کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ کوئی مدرسہ یا لائبریری قائم کر کے، عوام میں تعلیم کا شوق پیدا کریں، چنانچہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر جو چندہ جمع کیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کا بہترین مصرف، علمی ادارہ کا قیام سمجھا، ہائی اسکول کے لئے یہ رقم ناکافی تھی اس لئے انھوں نے ملکہ آنجہانی کی یادگار میں ایک پبلک لائبریری قائم کی اور اس کے لئے انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور ہندی کی مفید کتابیں فراہم کیں، یہ لائبریری ۱۹۴۷ء تک قائم رہی، ۱۹۴۷ء کے آتشیں فسادات نے اس کاشانۂ ادب کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔

مولانا حالی کی دیرینہ آرزو، قیام اسکول، کو ان کے فرزند رشید خواجہ سجاد حسین نے پورا کیا اسکول قائم کر کے پورا کیا، یہ اسکول رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۱۹۱۹ء میں حالی کی فاتحہ خوانی کے موقع پر حالی مسلم ہائی اسکول ہو گیا، افسوس ہے کہ یہ علمی یادگار بھی ۱۹۴۷ء کا شکار ہو گئی[2]

اے سحر دونوں نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک[3]

مولانا حالی اپنے نواسے عبدالولی کی بیماری سے سخت پریشان رہتے تھے، یہ پانچ سال سے بصارت میں مبتلا تھے، ان کی بیماری ہی کیا کم پریشان کن تھی کہ ان کے والد یعنی مولانا کے داماد کا

---

[1] یادگار حالی۔ صفحہ ۵۲۔

[2] تذکرہ حالی، اسماعیل پانی پتی، صفحہ ۴۳۔

[3] یادگار حالی، صفحہ ۵۰۔

Marfat.com

بھی انتقال ہو گیا۔ ۱۷ اپریل کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"عبدالولی کا پھر وہی حال ہو گیا جیسا ابتدا میں تھا۔ اس کے باپ کا ۲۰-۲۲ روز ہوئے انتقال ہو گیا۔"[۵۱]

آخر دسمبر ۱۹۱۰ء میں نظام حیدرآباد کی پہلی سالہ جوبلی کے موقع پر حیدرآباد تشریف لے گئے اور نظام کلب میں قیام کیا، مولانا کو جشن چہل سالہ کی روئداد لکھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ ۸ جنوری ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"مجھے یہاں حضور کے جشن چہل سالہ سال گرہ کی روئداد لکھنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ جس میں کسی قدر حضور کے خاندان کا حال اور ان کے عہد حکومت کے بڑے بڑے کام بھی درج ہوں گے۔ ابھی اس کے لئے میٹریل جمع کیا جا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب اور ایک کاتب میری مدد کے لئے مجھے ملے ہیں۔"[۵۲]

اس سلسلہ میں وہ تقریباً چھ ماہ تک حیدرآباد میں رہے، ۷ جون ۱۹۱۱ء کو حیدرآباد سے روانہ ہو کر ۱۲ جون کو پانی پت پہونچ گئے۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں انھوں نے سرسید پر ایک مضمون لکھا، اور چھپنے کی داد لکھی۔ حیدرآباد میں حالی کی موجودگی سے علم و ادب کی شمع روشن ہو گئی، مشاعرے اور ان کی قدر افزائی ہونے لگی اور مستفید ہوتے۔ حالی کے پاکیزہ اخلاق اور خلوص سے سب متاثر ہوئے۔ واپسی کے وقت ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ اہالیان حیدرآباد کی طرف سے پیش کیا گیا اور ان کی ادبی و علمی خدمات کو سراہا گیا، ان کی ذات کو قوم و ملک کے لئے باعث افتخار بتایا گیا۔ منشی عبدالعلی آزر نے ان کی ستائش میں ایک نظم لکھی، جس میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی، چند بند پیش کئے جاتے ہیں :۔

یہ وہ حالی ہیں جن کی آج شہرت ہے زمانے میں
زمانہ ان کا قومی راگ گاتا ہے ترانے میں
انھیں کی کوششیں ہیں قوم مردہ کے جلانے میں
انھیں کی شاعری کی روح ہے قومی فسانے میں
ہر اک شعر ان کا قومی سوز کا دمساز ہوتا ہے
ہر اک ساز اس کا قومی راز کا ہمراز ہوتا ہے

یہ وہ حالی ہیں جو پیدا کریں امرت کو زہروں میں
ہیں ان کے نام کے قائم کلب یورپ کے شہروں میں
معانی کی جگہ جادو بھرا ہے ان کی بحروں میں
مہذب لیڈیاں گاتی ہیں جن کو اپنی لہروں میں
انھیں کے نام کا حالی کلب قائم ہے لندن میں
انھیں کی نظم کے تو ترجمے ہوتے ہیں لزبن میں

مسلم شاعرانِ ہند میں ہے ان کی استادی
نئی نظموں کا رکھا ہے انھیں نے سنگ بنیادی
انھیں نے شاعری کو قید سے دلوائی آزادی
ہیں قدرت کے مناظر شاعری میں ان کے ایجادی

---

[۵۱] مکتوبات حالی، جلد دوم، صفحہ ۱۹۳۔
[۵۲] مکتوبات حالی، جلد دوم، صفحہ ۲۰۶۔
[۵۳] حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۱۹۲۔

موثر نظم، دلکش شعر، درد انگیز مضموں ہے
زباں میں ان کی جادو ہے قلم میں اُن کے افسوں ہے

حیدرآباد کے قیام میں مولانا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۲ جون ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:[1]

"میں حیدرآباد سے تندرست نہیں آیا۔ داہنی آنکھ میں پانی اترتا معلوم ہوتا ہے اس میں برائے نام روشنی باقی رہ گئی ہے اور روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔"

رفتہ رفتہ آنکھ میں پانی اُتر آیا، اس کی بینائی اتنی کم ہو گئی کہ مولانا تصنیف و تالیف کا کام بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری آنکھ بھی متاثر ہونے لگی۔ ۱۹۱۰ء کے شروع میں راجندر ہسپتال پٹیالہ میں آنکھ کا آپریشن ہوا، یہ آپریشن زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ ۱۰ ستمبر کو پھر پٹیالہ جانے کا ارادہ تھا۔[2]

آنکھ کا آپریشن کرانے سے پہلے مولانا حالی نے امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان کی شان میں انیس اشعار کا ایک فارسی قصیدہ لکھا، یہ قصیدہ نواب محسن الملک، کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ قصیدہ کے علاوہ کالج کے حالات سے متعلق ایک مضمون فارسی زبان میں لکھنے کے لیے کہا تھا۔ قصیدے میں کالج کی تعلیمی خدمات کا ذکر ہے، اصل مدح مقصود سے قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے

می رسد گر فرق عزت بگذرد از فرقدان — میزبانی را کہ شاہا چون تو باشد میہماں
گر بہ رقص آید در و دیوار کالج دور نیست — زیں طرب کامد بہ دیدارش امیر کامگار

حالی کا دل اس وقت بے ساختہ بھر آتا ہے۔ بانی کالج کی یاد تڑپا دیتی ہے۔

زندہ کاش! امروز بودے بانی ایں درسگاہ — تا بدیدے پایہ اش بالاتر از وہم و گماں
تا ہمہ امیدہا کاندر دلِ خود بستہ بود — از قدوم شہ بچشم خویشتن دیدے عیاں

اس زمانہ میں مولانا نے رباعیوں کی طرف خاص توجہ کی، دیوان کے جدید ایڈیشن میں بیس نئی رباعیاں شامل کیں۔[3]

۱۹۱۰ء میں علامہ شبلی نعمانی کے حادثہ پا پر رباعی لکھ کر بھیجی۔

شبلی کہ گزند پاش بر دل شکن است — با خستگیش خستگی مقرن است
چنداں کہ بکاہد فزاید ایں حبا — کآراستن چمن ز پیراستن است

۱۱ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو نواب محسن الملک کا انتقال شملہ میں ہو گیا تھا۔ سرسید کے بعد مسلمانوں کی کشتی کے ناخدا اور علی گڑھ کالج کی رونق محسن الملک ہی تھے۔ ان کا انتقال ملت اسلامیہ ہند کے لیے ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ حالی جو ان کی ذات پر فخر کرتے تھے اور ان کے ہر کام اور ہر وقت کے

---

[1] مکتوبات حالی، جلد اول، صفحہ ۲۲۰۔
[2] مکتوبات حالی، جلد اول، صفحہ ۲۲۰۔
[3] مکتوبات حالی، حصہ دوم، صفحہ ۴۰۔

Marfat.com

ساتھی تھے، اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لا سکے، قوم کا یہ آخری سہارا بھی جاتا رہا، سید کا بدل، مشکل سے ملا تھا، وہ بھی رخصت ہوگیا۔

جس وقت کا کھٹکا تھا وہ وقت آگیا آخر — یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار — سر کر کے مہم قوم کی کام آگیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا — پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر

مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

مہدی کی خدمات کا اعتراف کئی رباعیوں میں کیا ہے کہ انھوں نے کالج کی ترقی اور مسلمانوں کے لئے انتھک محنت کی ؎

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا — خدمت کے لیے قوم کی مر مر کے جیا
پیری ہوئی سد راہ اس کی نہ مرض — صدیوں کا جو تھا کام دو برسوں میں کیا

لوکل کمیٹی کراچی اور سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی علی گڑھ نے کراچی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اکیسویں اجلاس کے لیے مولانا حالی کو "غلطی سے پریسیڈنٹ بنانا تجویز کیا"[1]، مولانا نے ہر چند عذر استعفا کیے لیکن اس قدر مجبور ہو گئے کہ انکار کرنے کا محل نہ رہا، چنانچہ ۲۱ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مولانا کراچی کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۲ دسمبر کو وہاں پہونچے، ان کے ہمراہ تقریباً بیس حضرات اور تھے خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السبطین، نواب وقار الملک، میجر سید حسن اور مولوی وحید الدین سلیم بھی گئے۔ کانفرنس میں مولانا نے جو خطبہ صدارت پڑھا، اس سے ان کی مذہبی، تعلیمی، سماجی، ادبی، قومی، ملکی معلومات اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس خطبے میں ۱۸۸۶ء سے کانفرنس کا قیام سر سید اور محسن الملک کی خدمات، محسن الملک کا مرثیہ، سندھ اور عرب کے تعلقات، تعلیمی مسائل اور ان کا حل پیش کیا ہے[2] مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ اب بھی تعلیم و صنعت و حرفت سے غافل رہے تو اپنے تمام ہم وطن قوموں سے پیچھے رہ جائیں گے وقت کی پکار یہی ہے، اس پکار کو سننا چاہیے۔

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو — کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز بچا نو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے — اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو

اسی خطبے میں سودیشی تحریک کو اپنانے پر زور دیا ہے۔ آخر میں ان اشعار پر خطبہ ختم کیا ہے۔

---

[1] مکتوبات حالی، حصہ دوم، صفحہ ۴۱۰۔ [2] حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۲۰۳۔

Marfat.com

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتی نہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ہیں ان کو نگلے جاتے — دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں
سنبھلو وگرنہ رہنمایاں اس طرح پڑے گا — بھیل اور گونڈ جیسے گم نام و بے نشاں ہیں

مولانا حالی کا یہ خطبہ نہ صرف مولانا کی نثر میں بلکہ اردو خطبات میں بھی بہت اہم ہے اور فن خطابت میں اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں اور لطافتوں کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اس میں سرسید اور خود مولانا حالی کی خدمات اور جذبات کا خلاصہ موجود ہے، اور تقریباً نصف صدی کے تعلیمی حالات کا جائزہ ہے[1]۔"

کراچی سے واپس آنے کے بعد مولانا ایک جلسہ میں شرکت کے لیے دلی تشریف لے گئے، یہ جلسہ حکیم اجمل خاں مرحوم کو حاذق الملک کا خطاب ملنے کے سلسلے میں کمپنی باغ ٹاؤن ہال میں ۲۰ جنوری ۱۹۱۰ء کو نواب امیرالدین خاں لوہارو کی صدارت میں ہوا تھا، مولانا نے ایک مختصر تقریر کی اور چند شعر کا ایک قطعہ پڑھا۔

حاذق الملک اس خطاب فرخ و مسعود پر — ایک عالم آپ کو دیتا مبارک باد ہے
پس مبارکباد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام — مستحق ہیں اس کے ہم یا آپ کیا ارشاد ہے

غالباً یہ آخری جلسہ تھا جس میں مولانا شریک ہوئے، اس کے بعد وہ خرابی صحت اور کبرسنی کی بدولت کسی جلسہ میں شریک نہ ہو سکے۔ ستر سال سے زائد عمر ہو چکی تھی، قویٰ میں اضمحلال و انحطاط روبہ ترقی تھا، اعتدال ختم ہوتا جا رہا تھا، پیری و صد ضعف و ناتوانی، کا حالی شکار ہوتے گئے، پھر رشتہ دار دل کی موت نے ان کو اور بھی زیادہ پریشان کر دیا۔ مولانا کی دلی خواہش یہ تھی کہ اس عمر میں انھیں کچھ سکون اور اطمینان نصیب ہو لیکن ع

ما درچہ خیالیم و فلک در چہ خیال

تفکرات بڑھتے ہی گئے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کہیں باہر جا کر اپنے ادھورے کاموں کو پورا کریں مگر عبدالولی کی مسلسل بیماری کی وجہ سے وہ مجبور تھے، ضعیفی اور کمزوری بھی سفر کرنے میں مانع تھی جب ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے تبدیل آب و ہوا کے لیے اورنگ آباد آنے پر زور دیا تو [illegible] نے ان کو لکھا کہ:—

"الحمدللہ آپ اورنگ آباد میں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں آکر رہوں، مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور دراز کی مسافت پر کسی دوست کے پاس جا کر رہنا یا تو اس کو تیمارداری کی تکلیف دینی ہے یا اس پر تجہیز و تکفین کا

---

[1] حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۲۰۶۔

Marfat.com

بار ڈالنا ہے۔"

کچھ عرصے کے بعد مولوی عبدالحق نے اپنے آنے کے متعلق لکھا اس پر مالی کس لطیف پیرائے میں اپنی زندگی سے مایوسی کا ذکر کرتے ہیں۔

"آپنے بہت جلد تشریف لانے کا وعدہ کیا ہے مگر میں اپنی حالت کے لحاظ سے کسی کا یہ شعر پڑھتا ہوں

خدا ہی جانے سحر ہو نہ ہو، جلیں نہ جئیں　　شب فراق کئی احتمال رکھتی ہے

میں اپنی طرف سے تو اس وقت تک زندہ رہنے کے لیے بہت کوشش کروں گا۔"[1]

مولانا اورنگ آباد تو نہیں گئے لیکن مئی ۱۹۱۵ء میں آنکھیں بنوانے کی غرض سے لکھنؤ گئے مگر وہاں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا[2]۔ یہ ضرور ہوا کہ مولانا عینک کی مدد سے کام کرنے لگے۔

اس پیرانہ سالی اور بیماری اور پریشانیوں کے باوجود مولانا کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے تھے کتابوں اور رسالوں پر تبصرے، مضامین اور نظمیں لکھتے تھے، اپنے منتشر اردو، عربی، فارسی سرمایہ کو سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ مخزنِ جاوید جلد اول پر مولانا کا تبصرہ قابل قدر ہے۔ اس میں انھوں نے اردو کی توسیع کے متعلق مشورہ دیا ہے کہ

"ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے۔ اسی طرح (لالہ سری رام کی طرح) تصنیف و تالیف کریں۔ ... اور مسلمان مصنفین بضرورت اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا مال کرنے میں کوشش کریں۔"[3]

مولانا نے تمام عمر خود اسی مشورہ پر عمل کیا۔ اور اردو زبان کو معیاری زبان بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ سیدھے سادے اسلوب میں پوری بات کہہ سکے۔

ستمبر ۱۹۱۱ء میں نظام دکن میر عثمان علی خاں کی مسند نشینی کے موقع پر انتیس اشعار کا ایک قطعہ تہنیت لکھا تھا، اس میں انھوں نے نظام کو اپنی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں　　مبارک تمھیں مسند شہریاری
مبارک تمھیں ملک کی گلہ بانی　　مبارک رعیت کی خدمتگزاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل　　جہاں چپے چپے پہ ہے ذمہ داری
مبارک وہ منصب کہ جن کو ملا وہ　　ہوا چین رخصت فراغت سدھاری

---

[1] یادگار حالی، صفحہ ۶۰-۶۱۔
[2] مکتوبات حالی، حصہ دوم، صفحہ ۴۳۲۔
[3] مقالات حالی، حصہ دوم، صفحہ ۲۱۰-۲۱۱۔

Marfat.com

یہ پورا قطعہ نامکمل ہے، آخر میں سادہ طریقے پر چند دعائیہ اشعار لکھے ہیں۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا درستی صحت کے لیے پٹنہ گئے، لیکن وہاں کوئی افاقہ نہیں ہوا، اس لیے واپس چلے آئے، اور بلاقی بیگم کے کوچے میں قیام کیا۔ یہاں اُردو دیوان مرتب کرنا شروع کیا تھا کہ پھر بیمار ہو گئے۔ آخر اکتوبر ۱۹۱۲ء میں اپنے ہم وطن ڈاکٹر لیاقت حسین کے یہاں فرید آباد چلے گئے، یہاں آرام سے انھوں نے اپنا عربی اور فارسی کلام مرتب کیا مگر ہم افکار نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ آخر شوال ۱۳۳۰ھ شروع جنوری ۱۹۱۳ء میں پانی پت واپس چلے آئے۔

اسی زمانہ میں جنگ طرابلس و بلقان شباب پر تھی، ٹرکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ مغربی قومیں اس کو ختم کرنے کے لیے متحد ہو گئیں۔ ٹرکی کی شکست، تمام اسلامی دنیا کے لیے پیغام موت تھی، خاص طور پر ہندوستانی مسلمان سخت بے چین تھے۔ مولانا فرید آباد ہی سے ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

"ٹرکی کی خبریں جو آج کل آ رہی ہیں، انھوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے۔ ایران اور مراکو تو فاتحہ خیر پڑھ چکے تھے۔ اب ٹرکی کی بھی بظاہر خیر نہیں معلوم ہوتی"[1]

مولانا ٹرکی کے حالات کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اخبارات اور خطوط میں وہ ٹرکی کے حالات پڑھتے۔ انھوں نے ایک پرانا قطعہ بیاض اشعار کا خط میں لکھ کر اپنے دلی جذبات و خیالات کا اظہار کیا:

خیر ہے اے فلک کہ ہر عرصہ — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف — بنتے جاتے ہیں بے نوا ممتاز
تشنہ خوں ہیں بھوکے شیروں کے — حیلہ گر روبہوں کے شکر و ناز
دشمنوں کے ہیں دوست خونخوار جاسوس — اور یاروں کے یار ہیں غمّاز

مولانا ظفر علی خاں نے ٹرکی کی طبی و مالی امداد کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا تھا اور جب وہ روپے کر قسطنطنیہ جانے لگے تو مولانا حالی نے انھیں ایک خط میں لکھا کہ

"مجھے یہ بھی لکھنا کہ ٹرکی کے لیے پانی پت کتنا چندہ جمع ہوا اور وہ کس طرح بھیجا گیا"

جنوری ۱۹۱۳ء میں مولانا پانی پت واپس آ گئے تھے۔ یہاں آ کر انھیں اپنے

---

[1] مکتوبات حالی بنام انصاری، صفحہ ۱۰۔ [2] ۱۹۱۳ء میں اس قطعہ کو غزل کی شکل دے کر حضرت لو یہ عنوان لکھا ہوا کہ یہ اسی سال کا لکھا ہوا ہے حالی کا ذہنی ارتقا، یہ قطعہ غزل کا ایک حصہ ہے، ۱۹۱۳ء کے مطبوعہ دیوان میں ہے۔

[3] مکتوبات حالی بنام انصاری، صفحہ ۵۲۔

Marfat.com

"مولانا کے انتقال سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء میں چھپ کر شائع ہو گیا۔"[۱]

لیکن صباح الدین عبدالرحمن کی رائے یہ ہے کہ

"کتابی شکل میں شائع مولانا کے انتقال کے بعد ہوا۔"[۲]

مولانا نے خود اس کتاب کی طباعت کا ذکر نہیں کیا۔ اکتوبر کے خط میں صرف تکمیل مسودہ کا ذکر ہے۔[۳] مگر صحیح یہی ہے کہ یہ مجموعہ مولانا کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا تھا، چنانچہ مجالس النساء مطبوعہ حالی پریس پانی پت کے ٹائیٹل کے تیسرے صفحہ پر درج ہے کہ

"یہ مولانا مرحوم کی دوسری کتاب ہے جو چند روز ہوئے شائع ہو گیا تھا لیکن عام طور پر مشتہر نہیں ہوا۔"[۴]

مولانا محمد علی جوہر نے جب ہمدرد اخبار جاری کیا تو مولانا حالی اس سے بہت خوش ہوئے، اور انھوں نے ہمدرد کے لیے یہ دو رباعیاں ۲۷ مئی ۱۹۱۳ء کے خط میں لکھ کر بھیجیں، جو ۱۴ جون ۱۹۱۳ء کے اخبار میں شائع ہوئیں۔

تم خوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب — اک ملک کی خدمت کا ہی سودا یارب
ہمدرد کو اس نام سے سمجھو — اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں — چونک اٹھتے ہیں اک ہاں پہ ہاں پیر و جواں
کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں وہ کام — جو کام ایک کارٹون کرتا ہے وہاں

مولانا ظفر علی خاں مدیر زمیندار جب سفر عرب سے واپس آئے تو مولانا نے مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی اسسٹنٹ ایڈیٹر زمیندار کے نام ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو پانی پت سے ایک خط میں ۲۴ اشعار کا ایک خط لکھ کر بھیجا، جس میں ان کی ملی ہمدردی اور ان کے قومی درد کی تعریف ہے۔

اے مالک دفترِ زمیندار — اے نازشِ قوم و فخرِ اقران
اے دینِ کے امتحاں میں جانباز — اے نصرتِ حق میں تیغِ عریاں
ہمدردیِ اہلِ دیں نے آخر — جو ہیرے ترے کر دیے نمایاں
ڈالا یہ تری پکار نے غل — جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
بازار ہے وہ درسگاہ تجھ پر — تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں
زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت — ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

ٹرکی کی شکست اور عالم اسلامی پر مغرب کی یلغار سے، ہندی مسلمان سخت بے چین تھے، پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور غصہ تھا۔ مولانا محمد علی کا کامریڈ اور ہمدرد،

---

[۱] تذکرہ حالی، حصہ دوم، صفحہ ۸۲۔ [۲] یادگار حالی، صفحہ ۶۱۔
[۳] مکاتیب حالی، حصہ دوم صفحہ ۹۴۔ [۴] مجالس النساء حصہ اول مطبوعہ حالی پریس پانی پت صفحہ ٹائیٹل

Marfat.com

اور مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال، مسلمانوں میں احساس زیاں، اور جذبۂ حریت و آزادی پیدا کرنے میں پیش پیش تھے۔ ابھی یہ خونریزی جاری تھی کہ کانپور میں مچھلی بازار کی مسجد کا ہنگامۂ خونیں مسلمانوں کے زخموں پر نمک مرچ چھڑکنے کا کام کر گیا۔ سترہیں ملامسن کی حکومت مسلمانوں کے خون کی پیاسی تھی اور اس نے اپنی پیاس مسلمانوں کے خون سے بجھائی، بے گناہ بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کو خدا کے گھر کی حفاظت اور اس کو بے حرمتی سے بچانے کے جرم میں شہید کر دیا گیا، ملک بھر میں آگ لگ گئی، شہیدوں کا خون رنگ لا کے رہا مظلوموں کی خون سے لتھڑی اور تڑپتی ہوئی لاشوں نے دلوں کو پاش پاش کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے قلم نے شعلے برسانے شروع کر دیئے۔ مولانا شبلی نے نہایت پر درد پر سوز نظم میں شہیدان کانپور کا سوگ منایا۔ مولانا حالی کا دل بھی کافی متاثر ہوا، اس موقع پر انھوں نے تین رباعیاں لکھیں جو ہمدرد مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئیں

یارانِ وطن نے قوم کا ساتھ دیا — دی قوم نے دادِ قوم بے روریا
ہر سو بھڑک اٹھی آگ ہمدردی کی — ہنگامۂ کانپور نے کام کیا

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا — گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے — جو کام دکھایا ہے مصیبت نے کیا

تائید میں حق کے جو بلا آتی ہے — ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے — روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

ان رباعیوں کے بعد مولانا کا کوئی کلام یا کوئی مضمون ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا، اس لئے ہنگامۂ کانپور پر ان کے کلام کا بھی خاتمہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کا کوئی علمی کام نظر نہیں آتا۔

۷۰ برس کی عمر میں بیمار و ضعیف، اور افکار و آلام سے پریشان حالی کے دل میں قومی درد اب بھی جوانوں سے زیادہ تھا۔ وہ ہمہ وقت اسی فکر میں رہتے تھے کہ ملت اسلامیہ کو سکون و اطمینان حاصل ہو، اور جب تک ان کا جسم و دماغ کام کرتا رہا وہ قوم کی بھلائی و بہبودی کے لئے [illegible] لیکن قدرت کے کرشمے عجیب ہیں، قوم کے سچے غمگسار حالی کا دماغ انتقال سے چند [illegible] ان کے دماغی اعصاب پر کچھ ایسا اثر ہو گیا تھا کہ وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ خاموش تھی، یوں ہی وہ خاموش طبع انسان تھے لیکن اب اس بیماری نے [illegible] ایک حرف بھی بول نہیں سکتے تھے۔

لب از گفتن چناں بستہ کہ گوئی — زبان در کام گم کردہ است یا دیگر [illegible]

کیسی بے باکی و بیباکی متی کوئی بات کہنا سمجھا جاتا لیکن جواب نہ دے سکتے تھے سب کی

---

[1] حیات حالی از ذہنی رفیق، صفحہ ۲۲۰۔

Marfat.com

سن لیتے مگر اپنی نہ کہہ پاتے۔ عمر بھر مولانا سب کی سنتے رہے، زبان رکھتے ہوئے بھی کسی کو جواب نہیں دیا۔ اپنے آخری وقت تو یہ گویائی نے بالکل جواب دے دیا تھا صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:۔

"کوئی بات کرتا تو مسکرا دیتے، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھ چمکنے لگتی لیکن جب تک جواب دماغ سے زبان تک آئے، اعصاب جواب دیدیتے اور مسکراہٹ ہونٹوں ہی میں رہ جاتی۔"[1]

مولانا بغرض علاج دہلی تشریف لے گئے اور ایک کوٹھی میں قیام کیا، اس وقت گویائی بالکل مفقود نہیں ہوئی تھی، دو ایک لفظ جوں توں بول لیتے تھے۔ خواجہ عبدالمجید دہلوی لکھتے ہیں:۔

"پہلی مرتبہ جب سول سرجن صاحب کو آپ میں حاضر تھا دیکھا کہ میز پر بیٹھے لکھ رہے تھے اور میز پر سے قلم اٹھا کر سول سرجن نے ان کے سامنے کی اور پوچھا یہ کیا ہے؟ یہ امتحان کے طور پر کرتا، عالی صاحب کی عادت تھی جب ان سے سوال کیا جاتا تو سلسلۂ کلام خیر کے لفظ سے شروع کرتے، اور یہ ایک خاص انداز میں ہوتا تھا۔ پھر ایک تبسم کی کیفیت چہرے پر نمایاں ہوتی جس کا لطف دیکھنے ہی پر منحصر ہے، چنانچہ اس وقت بھی خیر کا لفظ عادت کے موافق آہستہ سے کہا اور مسکرائے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سول سرجن کے اس سوال پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ایسا بیہوش نہیں ہوں، پھر قلم کا لفظ منہ سے نکلا۔ اس کے بعد حالی پانی پت چلے گئے اور میرے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی کہ وہاں سے جو کیفیت مریض کی لکھی ہوئی آئے، سول سرجن سے کہہ دیا کروں، جو جواب ملے لکھ بھیجا کروں، یہ کام چند ماہ تک جاری رہا۔۔۔ جس دن میں ان کو چپ دیکھتا آپا پتا دل خود بخود طرح متاثر تھی، اس حالت میں یہ چند شعر موزوں ہوئے۔۔۔۔۔

ہے زندہ مگر اس کو چپ لگ گئی ہے — ہے حال حالی کا خواجہ سے کہنہ
مگر کس بلا کی یہ کاریگری ہے — یہ حالی نہیں اس کی کایت ہو تو ہو
خموشی و مرہم اجل موت کی ہے"[2] — سکوت مجسم، تعجب کی جا ہے

یہ عالم بے چارگی و خاموشی مریض کے لیے تو تکلیف دہ تھا ہی لیکن تیمارداروں کے لیے بھی سخت کرب و اضطراب کا باعث تھا، جو دیکھنے آتا آبدیدہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مشیت الٰہی کے سامنے سب مجبور تھے۔ طبیب خوش الحان کی زبان بندی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دوا علاج میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔

آخر کار وقت موعود آپہونچا، ملک بقا کے قاصد لوحا کی نے خوش آمدید اور عمر فانی کو الوداع کہا

السلام اے قاصد ملک بقا — الوداع اے عمر فانی الوداع

---

[1] یادگار حالی، صفحہ ۶۲۔

[2] کیا خوب آدمی تھا۔ صفحہ ۱۸۔ ۱۹۔

Marfat.com

آہ وہ گھڑی آگئی جب ان کا جہاز حیات کنارے پر آ لگا اور انھوں نے فانی زندگی کو الوداع کہا۔

آ لگا حالی کنارے پر جہاز　　الوداع اے زندگانی الوداع

۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء (مطابق ۱۴ صفر ۱۳۳۳ھ) ایک طرف سال کے آخری دن کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، تو دوسری طرف علم و ادب، اخلاق و سیر کا خورشید درخشاں بھی ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حالی کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں:

"دو دن سے کرسٹ پیدا ان تشریف اور باد عیہ تھے 31 دسمبر کو انتقال ہو گیا۔"[1]

مولانا حالی کی آخری آرام گاہ قلندر صاحب کی درگاہ میں ہے۔ قبر سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور حوض مسجد کے کنارے واقع ہے۔ حافظ شیرازی کے مزار کی طرح حالی کا مزار بھی ولدادگان علم و ادب کے لیے زیارت گاہ ہے۔

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را　　تولائے ادبیاں ہا افگند شورے

حالی کی موت، علم و ادب کے سب سے بڑے شیدائی ہی کی موت نہیں تھی بلکہ ملک و ملت کے سچے ہمدرد و خیر خواہ، نیکی اور اخلاق کے مجسمے اور ایک فرشتہ خصلت انسان کی موت تھی۔ علم و ادب میں صف ماتم بچھ گئی۔ اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن سب ہی نے اس پاک انسان کی ذات اور سنودہ صفات انسان کی موت پر اشک بار ہوئے، اخبارات و رسائل سے پرچم ادیب و شاعر، معلم و متعلم اور واعظ و خطیب نے انجمنیں، تعلیمی و غیر تعلیمی ادارے حالی کا سوگ منایا۔ ہندوستان کے ہر مرکزی مقام پر تعزیتی جلسے کیے گئے۔ ہر شخص کو موت کا غم ابھی تازہ تھا اور آنسو خشک ہونے بھی نہ پائے تھے کہ اردو ادب کے معاصرین کا آخری مگر سب سے اہم عنصر حالی بھی سدھار گیا۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں　　حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس راہ تو

علامہ شبلی نے ۱۰ نومبر ۱۹۱۴ء کو جب ۱۳۳۲ھ کی صبح میں ایک ہی شب [illegible]

۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حالی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ [illegible]

کسوف پر مولانا احسن مارہروی نے ایک [illegible] کسوف الشمسین، غم شبلی و ماتم حالی پر لکھا ہے جس میں علامہ شبلی و مولانا حالی کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات لکھی ہیں۔ [illegible]

---

[1] مرأۃ الشعراء، جلد دوم، صفحہ ۴۰۔

Marfat.com

نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اس میں اکابر ملت، مشاہیر ادب، والیان ریاست شریک ہوئے۔ اس یادگار کے موقع پر حالی کے متعلق کتابیں اور رسالے شائع ہوئے، منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کانپور نے اس جشن کے متعلق بالتفصیل لکھا ہے یہاں اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"یہ مبارک جشن یادگار ۲۶-۲۷-اکتوبر کو منعقد ہونے والا تھا لیکن معزز اور والا قدر مہمانوں کی تشریف آوری کا سلسلہ ۲۴ر اکتوبر سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی تاریخ کو سید راس مسعود اور ڈاکٹر سر محمد اقبال تشریف لائے اور نواب صدر یار جنگ، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ڈاکٹر عابد حسین، مسٹر شعیب قریشی اور مولوی محمد امین صاحب زبیری اور بہت سے دیگر حضرات ۲۵ر کی شام تک پہونچ گئے اور رات کو ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی وغیرہ بھی تشریف لے آئے، اس طرح ۲۶ر اکتوبر کی صبح تک تقریباً چار سو مہمانان عزیز کا شاندار مجمع ہو گیا تھا ۲۶ر اکتوبر کی صبح کو ۱۰ بجے کے قریب ہز ہائینس نواب بھوپال نے نزول اجلال فرمایا۔ سید راس مسعود، سر محمد اقبال، نواب محمد اسماعیل خاں، آقائی صلاح الدین سلجوقی اور مسٹر شعیب قریشی وغیرہ نے نواب بھوپال کا خیر مقدم کیا۔ سر اکبر حیدری، مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر عبد الحلیم، سر عبد الرحمٰن اور دیگر مشاہیر ملک تشریف لائے۔ جلسہ کا آغاز مولانا چودھری محمد اسلام صاحب نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ خواجہ سجاد حسین نے مجلس استقبالیہ کی طرف سے خیر مقدمی ایڈریس پیش کیا۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار جو خاص اسی موقع کے لئے انھوں نے فرمائے تھے جناب لطیف احمد صاحب ماسٹر حامی ہائی اسکول نے پڑھے۔

مزاج ناقہ را مانند حرفی نیک می دانم — چوں محمل را گراں بینم حُدی را تیز تر خوانم
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو — ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم
طوافِ مرقدِ حالی سزد ار بار بیستی را — تو اے اوبجاں یا اُفگند شوے کہ من دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازم
تو بر طاکش کہ من برگِ گل افشانم

حسب ذیل حضرات نے مولانا حالی پر مقالہ ہائے پڑھے اور تقاریر کیں:—

۱۔ مولوی عبد الحق صاحب	مقالہ	مولانا حالی بحیثیت نثر نگار
۲۔ خواجہ غلام السیدین صاحب	تقریر	مولانا حالی بحیثیت مصلح قوم
۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب	تقریر	مولانا حالی بحیثیت ایک محب وطن
۴۔ حفیظ جالندھری	نظم	در مدحِ حالی

سپاسنامے کے جواب میں ہز ہائینس نے فرمایا:—

Marfat.com

"جب مجھے اس جلسہ کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ایک ایسے شخص کی یادگار میں یہ جلسہ منعقد ہو رہا ہے جو کسی ایک خطے یا طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ جس کی ذات پر ہر زمانہ اور ہر ملک فخر کر سکتا ہے اور اس کی عالمگیر اہمیت کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس میں اپنی شرکت کو اپنی دیگر گوناگوں مصروفیتوں پر مقدم رکھا"۔۔۔۔۔

"مجموعی طور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی مرحوم جن کے یوم ولادت کی صد سالہ سال گرہ منانے کے لئے آج ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، ملک کے ایک سچے ہی خواہ اور قوم کے ایک مخلص ہمدرد تھے، انھوں نے اپنی ساری عمر اپنے وطن کی اصلاح و تربیت کی کوشش میں صرف کی۔ ان کی ہر بات و وعظ و نصیحت تھی اور ان کا ہر کام خلوص و محبت کا"۔

"میرا یقین ہے اور غالباً اس سے کسی شخص کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ ان تمام پہلوؤں سے مرحوم گزشتہ صدی کے اکابر ملک کی صف اول میں تھے اور وہ ہر حیثیت سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کے احسان شناس ہر ممکن ذریعے ان کی یادگار قائم رکھیں تاکہ نوجوانوں میں ان کی تقلید اور تتبع کی تحریک ہو"۔

"بلاشبہ ان کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہے حقیقت میں وہ اردو شاعری کے دور جدید کے بانی اور موجد تھے اور جیسا کہ آپ نے کہا ہے اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے کہ اردو ادب، تنقید اور شاعری کی شعبہ ثانیہ تمام تر انھیں کی مرہون منت ہے"۔

"اردو شعراء میں سب سے پہلے انھوں نے شاعری کے اصلی مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور یہ محسوس کیا کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ قدرت کی نیرنگیوں کے مشاہدے سے جو اثر اس کے احساس اور ادراک دل و دماغ پر مترتب ہوتے ایسے دلکش انداز اور موزوں الفاظ میں [illegible] اعلیٰ ترین احساسات برانگیختہ ہوں اور نظام فطرت کے [illegible] متعلق جو نتائج وہ اخذ کرتا ہے وہ دوسروں کے دلوں میں [illegible] اور ان کی فکر [illegible] خیالات اور ادنیٰ جذبات سے پاک ہو"۔

اس کے بعد مولانا حالی کی تصانیف پر اجمالی تبصرہ ہے، مسدس کا [illegible] کا ذکر ہے۔ اس وقت کے موجودہ نصاب تعلیم کی خامیوں کا بیان ہے اور یادگار حالی یعنی حالی اسکول کے متعلمین کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی تعلیم کا مقصد [illegible] نہ قرار دیں، بلکہ اپنا نصب العین اس سے بلند رکھیں یعنی وہ تعلیم کو تعلیم کی غرض سے حاصل کریں۔

پانی پت کے علاوہ حسب ذیل مقامات پر جشن حالی منایا گیا۔

۱۔ اورنگ آباد دکن — عثمانیہ کالج کے طلبا اور اساتذہ نے مشترکہ طور پر یوم حالی منایا، جس میں مولانا کے متعلق کئی قابل قدر مضامین پڑھے گئے۔ جن کا دلچسپ مجموعہ یادِ حالی کے نام سے جامعہ پریس دہلی نے شائع کیا۔

۲۔ کلکتہ — ۱۵ر دسمبر ۳۵ء کو ینگ انڈیا ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام یوم حالی منایا گیا۔ ڈاکٹر ایس۔ کمار جی پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی نے مولانا مرحوم کے ذاتی اوصاف بیان کرتے ہوئے کہا کہ انسانیت کے بلند پایہ شاعر اور وطن پرستی کے جذبات ابھارنے والا ان کا جیسا قرار دیا۔ ڈاکٹر کالی داس ناگ اور پروفیسر نظر علی نے بھی مولانا کی سیرت پر روشنی ڈالی۔

۳۔ مدراس — مولانا محوی لکھنوی نے مولانا کی یاد میں جلسہ کیا اور اپنی نظم پڑھی۔

۴۔ بریلی — مولوی عبدالشافع صدیقی کے زیر اہتمام جلسہ کیا گیا۔

ان کے علاوہ لاہور، لکھنؤ، عظیم آباد پٹنہ اور دیگر مقامات پر ادبی انجمنوں نے یوم حالی منایا ادبی رسائل اور اخبارات نے بھی حالی کے سلسلے میں مخصوص مضامین لکھے جن میں جامعہ دہلی۔ پیام تعلیم دہلی۔ اور الناظر لکھنؤ قابل ذکر ہیں[۵۱]۔

رسائل میں زمانہ کانپور نے ایک مکمل و مبسوط حالی نمبر یادگار حالی کے نام سے شائع کیا۔ ۳۵ء کے بعد حالی پر سیکڑوں مقالے لکھے جاتے رہے ہیں، کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور رسالے مخصوص نمبر نکال رہے ہیں[۵۲]۔ ادبی انجمنیں حالی پر تقاریر اور مباحثے کراتی ہیں[۵۳]۔ ریڈیو اسٹیشنوں سے حالی پر مخصوص پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ غرض حالی کے ادبی خلوص کا دھارا حصار مرتضوی (علی گڑھ) سے نکل کر خاک ہند و ارض پاک کے چمنستان ادب کو سیراب کر کے سرسبز و شاداب کر رہا ہے

---

۵۱ اقتباس از زمانہ کانپور (حالی نمبر، یادگار حالی) صفحہ ۹۵ تا ۱۰۱۔

۵۲ اردو کراچی نے حالی نمبر شائع کیا۔ فروغ اردو لکھنؤ نے دو جلدوں میں حالی نمبر نکالا۔

۵۳ دسمبر ۵۸ء میں انجمن نوجوان مصنفین بمبئی نے حالی پر چھ لکچروں کے لئے پروفیسر احتشام حسین کو مدعو کیا۔ ان میں حالی کے تمام ادبی پہلوؤں کو بیان کیا گیا۔

سیرت واخلاق

سیرت واخلاق، حالی کی کتاب زندگی کا نہایت روشن، جامع اور بے داغ باب ہے۔ ان کی پوری زندگی 'با دوستاں تلطف' با دشمناں مدارا' اور 'لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش' پر عامل رہی ہے۔ ان کا اخلاق نہایت وسیع تھا، وہ شرافت، خلوص محبت اور ہمدردی کی مجسم تصویر تھے۔ سر راس مسعود نے اپنے پدر بزرگوار ڈاکٹر سید محمود کا یہ فقرہ جو انھوں نے مولانا کے متعلق ایک خاص نشست میں اپنے والد سر سید احمد خاں سے کہا تھا، نقل کیا ہے:-

"ابا جانی! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، ان میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لئے تیرا دل تیار ہو جائے، تو میرے پاس اس کا جواب حاضر ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے۔"

ہفت سالہ مسعود اپنی ماں سے پوچھتے ہیں کہ

"یہ کون صاحب ہیں جن کی پرستش کرنے کے لئے میرے والد صاحب تیار رہیں اور جنھوں نے مجھے پیار کیا ہے؟"

اور ان کی والدہ محترمہ جو جواب دیتی ہیں اس سے

"پہلی دفعہ مولانا کی عظمت کا بیج میرے دل میں بویا جاتا ہے، اور جب کبھی میں ان کو دیکھتی ہوں تو اپنے دل میں کہتا ہوں کہ یہ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ باوجود اس کے کہ اب میری عمر پچاس سال کی ہو گئی ہے میرے دل میں وہی عظمت ان کی ہے اور وہی محبت اُن سے ہے جو بچپن میں تھی۔"[1]

مولانا ظفر الملک مرحوم کی نظر میں حالی حسن خلق و نیکی کی سراپا تصویر تھے، لکھتے ہیں:-

"وہ لوگ جو مولانا سے ممدوح کے حالات سے زیادہ واقف نہیں آپ کو ایک ولی کامل اور بزرگ کامل کے مانند جانتے تھے کیونکہ آپ کی ذات بابرکات حسن خلق و نیکی کی سراپا تصویر اور پاکیزگی و خلوص کی پیکر مجسم تھی۔"[2]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:-

"مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری ... یہی شان ان کے کلام میں ہے، ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔"

مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے آج تک نہیں ملا۔ نواب عماد الملک

---

[1] مسدس حالی مدی ایڈیشن، صفحہ ۲۳-۲۴۔ [2] الناظر لکھنؤ جنوری ۱۹۱۵ء صفحہ ۶۲۔

فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا، اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہونچتے تھے۔"

"خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے، جو کوئی ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر ان کے حسن اخلاق کا مداح رہتا تھا، اور ان کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت فرمایا کرتے تھے، لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔"[۵۱]

خواجہ غلام الثقلین نے عصر جدید میں مولانا کے اخلاق و عادات کے متعلق تحریر فرمایا:۔

"مولانا یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے، کبھی کسی کی برائی ان کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند کرتے تھے۔ خاص صفت عدل و میانہ روی تھی۔ "اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ یعنی عدل و میانہ روی اختیار کرو، یہ بات تقوے سے قریب ہے" عزیزوں سے محبت، غریبوں کی امداد، بے تعصب و اعلیٰ خیال، بے نفس، محب اہل بیت، معمولی منش، سنی تھے۔ مذہبی اختلاف کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔"

رحم و مروت، اعلیٰ درجہ کا اعتدال، اخلاق و عادات، برتاؤ، مروت فیاضی مزاج میں تھا، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی، مستغنی المزاج، قانع اور خادم قوم و ملک تھے۔"[۵۲]

خواجہ غلام السیدین لکھتے ہیں:۔

"سرسید کے حلقۂ احباب اور رفقا میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا۔ حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی۔"[۵۳]

صاحب مرأۃ الشعرا نے مولانا حالی کے شمائل و خصائل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:۔

"آپ کے شمائل و خصائل کا باب نہایت وسیع ہے اور حق یہ ہے کہ آپ کے اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ آپ انسان تھے لیکن فرشتہ صفت، آپ فرشتہ تھے لیکن انسانی خصائص کے ساتھ۔ آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہونے سے قلب کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ وہ

---

۵۱ چند ہم عصر صفحہ ۱۵۵-۱۵۶۔
۵۲ عصر جدید، ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء
۵۳ مسدس حالی صدی ایڈیشن، صفحہ ۵۶۔

Marfat.com

سکون اور اطمینان خاطر نصیب ہوتا تھا جو اولیائے کرام کی صحبت میں لوگوں کو حاصل ہوتا ہے

بہت جی خوش ہوا حالی سے ملکر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

عدل و میانہ روی کے ساتھ ساتھ رحم و مروت کی صفات بھی تھیں[۱]"

سر سید رضا علی نے اعمال نامہ میں سر سید کے نورتنوں کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا حالی کے متعلق یہ رائے دی:-

"اعلیٰ خصائل کے اعتبار سے مولوی حالی کا درجہ بہت اونچا تھا، ان کی خدمت اور صحبت نوجوانوں کے لئے سبق آموز تھی۔ مزاج نہایت سنجیدہ اور متین تھا[۲]"

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مولانا کے اخلاق و عادات پر یوں رقم طراز ہیں:-

"مولانا حالی پرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق و ملنسار، حلیم الطبع اور سچے ذہانی قوم تھے، دنیوی جاہ و ثروت کا خیال ان کے دل میں مطلق نہ تھا، ان کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی، جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا، قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، مگر اس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے وہ بالکل علیحدہ تھے۔ ان کا مطمح نظر بہت بلند تھا اور لم تقولون مالا تفعلون کے وہ پورے عامل تھے[۳]"

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"وہ ان میں تھے جن کی طبیعت میں مصائب و آلام کی جگہ سوز دل کی دھیمی دھیمی گرمی اور درد کی میٹھی میٹھی کسک پیدا ہوتی ہے۔ دوسروں سے نفرت کی جگہ انہوں سے محبت بڑھتی ہے، جو بجائے جلانے اور بھسم کرنے کی جگہ سعی پیہم کا عزم کرتے ہیں[۴]"

منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کانپور حالی کو نیکی کا اوتار سمجھتے تھے۔ وہ مولانا کے سچے بھگتوں میں تھے۔ اپنے دیوتا کی سیرت کے گن گاتے ہوئے انھوں نے لکھا:-

"عادات و خصائل سے مولانا حالی ایک فرشتہ صفت انسان تھے، مزاج میں حد درجہ کا تحمل اور استغنا تھا، طبیعت متین منصف، اعتدال پسند اور میانہ روی واقع ہوئی تھی۔ بہ لحاظ ذاتی اوصاف اور کیا باعتبار ادبی خدمات آپ ہر حیثیت سے ملک کے ایک برگزیدہ بزرگ اور اردو کے بہت بڑے محسن گزرے ہیں[۵]"

---

[۱] مراۃ الشعرا، جلد دوم صفحہ ۴۸ [۲] اعمال نامہ، صفحہ ۴۴۹ [۳] تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۰۰

[۴] سہیل، علی گڑھ، جولائی ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۵۰، حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے۔

[۵] زمانہ، کانپور، حالی نمبر (یادگار حالی) صفحہ ۴۰۔

Marfat.com

کوئی تو بات تھی کہ حالی کے سخت سے سخت مخالف بھی ان کی پاکیزہ نفسی اور نیک طینتی کا دم بھرتے تھے اور انھیں مصلح قوم اور فرشتہ صفت انسان سمجھتے تھے، ان کے کلام پر ہزاروں اعتراضات کیے گئے اور نکتہ چینی، بدباطنی و بدبینی اور اتہام کی حد تک بڑھ گئی مگر ان کے جذبۂ اخلاص و اصلاح کی قدر و منزلت معترضین و مخالفین نے بھی کی، چنانچہ

"حالی صاحب کے تقدس اور بزرگی اور قومی مرثیہ گوئی کی تعریف کرنے والوں کو یہ مان لینا چاہیے کہ ان کے ان صفات پر کبھی اعتراض نہیں کیا گیا.... ہم ان کے قومی درد کو مانتے ہیں، جس کا بارہا نہیں سالہا امتحان ہم لوگوں نے دیا ہے"[51]

حقیقت یہ ہے کہ حالی کی ذات ستودہ صفات، مرجع خاص و عام تھی، جہاں دوست، دشمن اپنے پرائے سبھی آتے اور اکتساب فیض کرتے، ان کا یہ فیض آخر دم تک سب کے لئے جاری رہا۔ عزیز و اقارب، ملازم و خدمتگار، دوست و احباب، چھوٹے اور بڑے، بچے اور بوڑھے، مرد اور عورت، ہندو اور مسلمان سب پر ان کی شفقت یکساں تھی سب سے وہ خلوص و محبت، ہمدردی و دلسوزی کے ساتھ ملتے، تصنع و تکلف نام کو بھی نہ تھا، کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی، کبھی کسی کی غیبت نہیں کی، کبھی کسی کو برا نہیں کہا۔ بنی نوع انسان کا اتنا بڑا اور سچا ہمدرد اس صدی میں مشکل سے نکلے گا۔

لسان القوم حضرت صفی مرحوم نے سچ کہا ہے۔

سعدی و عطار اس صدی کا　　طینت میں اثر نہ تھا بدی کا
دل آئنہ عشق سرمدی کا　　پرتو خلق محمدی کا
تھا حسن عمل سے جس کو رشتہ
قالب میں بشر کے اک فرشتہ

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:—

"مولانا حالی بہت نیک طینت، متواضع اور خاکسار بزرگ تھے، بڑوں کا کیا ذکر ہے وہ چھوٹوں سے بھی چھوٹے ہو کر ملتے تھے"[52]

صادق قریشی نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:—

"آپ حق پرست، صاف دل، پاک باطن انسان تھے..... قوم کی عزت افزائی، شہرت اور عظمت کے باوجود عجز و انکسار کے مجسمہ تھے"[53]

حالی نے اپنی پوری زندگی خدمت خلق اور محبت بنی نوع انسان کے لئے وقف کر دی تھی۔

---

[51] ریاض الاخبار، گورکھپور جلد ۳ نمبر ۸ صفحہ ۲ مطبوعہ ۲۸ جنوری ۱۹۰۵ء
[52] حیات شبلی، صفحہ ۹۴۷۔　　[53] ذکر حالی، صفحہ ۱۵-۱۶۔

Marfat.com

ان کی عظمت و بزرگی کا راز یہی ہے کہ وہ قوم و ملک کے سچے ہمدرد اور مخلص خادم تھے، اور "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" غلط نہیں ہے اور سید القوم خادمھم ہی ہوتا ہے۔ حالی اپنی بے لوث خدمت کی بدولت نہ صرف مخدوم اور سردار بن گئے، بلکہ صلحا رو ابرار کی صف میں جگہ پا گئے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں:۔

"جب کبھی میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اطمینان قلب میسر ہو جاتا تھا اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہتی تھی..... جب ۱۹۲۵ء میں پانی پت گیا تو مولانا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی غرض سے پہونچا۔ سچ کہتا ہوں کہ مولانا کی قبر پر بھی وہی سکون قلب مجھے حاصل ہوا جو اُن کی خدمت بابرکت میں حاصل ہوتا تھا۔

مردان خدا، خدا نہ باشند
لیکن ز خدا جدا نہ باشند"[1]

ڈاکٹر سید عابد حسین کی رائے میں حالی کی سیرت اور اُن کا کلام لازم و ملزوم ہیں۔ حالی کی سیرت کو آپ

"صاف روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ان کے کلام کا مطالعہ کیجئے"[2]

اس سلسلے میں موصوف نے دوسرے دور کا کلام پیش کیا ہے، اس سے قبل حالی کی سیرت پر اختصار اور جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

"ایک سن رسیدہ عالم، شاعر، حق پرست، حق گو، صاف دل، پاک باطن، حکیم، منکسر، خود دار، غیرت مند، محبت کا پتلا، اخلاق کا مجسمہ، دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا ہمدرد، پانی پت میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے، اس کی زندگی قوم کے لئے وقف ہے، کس کی محبت اور خدمت؟ علم و ادب کی، ملک و قوم کی، خاندان کی، ہمسایوں کی۔ ادھر تصنیف و تالیف کا شغل جاری ہے، ادھر لوگ اپنی نظمیں اور کتابیں اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں۔ علمی کاموں میں مشورہ طلب کرتے ہیں، ادبی مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ یہ شخص سب کی فرمائش پوری کرتا ہے، سب کو جواب دیتا ہے۔ ادراس عجز و انکسار کے ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہو، کوئی تعریف کرے تو شرمندہ ہوتا ہے، بے جا اعتراض ہو چپ ہو رہتا ہے، دشمن گالیاں دیتے ہیں، یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے، دوستوں میں سے کوئی جواب دینا چاہتے تو [illegible] بغض و حسد کے بادل برستے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں۔ سلام کا دیا ہوا پیسا جاتا ہے"[3]

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کا اخلاق غیروں کے ساتھ نہایت وسیع اور پاکیزہ ہوتا ہے،

---

[1] حالی میری نظر میں، صفحہ ۴۶۔

[2] مضامین عابد، صفحہ ۱۰۔

[3] مضامین عابد، صفحہ ۹۲۔

لیکن اپنوں اور اعزا و اقربا کے ساتھ یہ خصوصیات قائم نہیں رہتیں، جس سے عزیز و اقارب متنفر ہو جاتے ہیں، اور گھر جہنم کدہ بن جاتا ہے، حالی کا بے ریا دل ان تمام عیوب سے پاک تھا. ڈاکٹر عابد حسین ہی کے الفاظ میں، ان کی کنبہ پروری محبت اور شفقت، ملاحظہ ہو :-

"کنبہ بہت بڑا ہے، اپنی اولاد، بھائی بہنوں کی اولاد، اولاد کی اولاد، مگر یہ مرد خدا اتنا بڑا دل رکھتا ہے جس میں ایک ایک کی گنجائش ہے، قریب کا عزیز ہو یا دور کا، سب کے ساتھ ایک سی شفقت، ایک سا سلوک، محبت جب نا محدود ہو تو قریب اور بعید کا فرق باطل ہو جاتا ہے، اور اس شخص کی محبت محض رقت قلب نہیں، عملی محبت ہے، وہ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہے، مشکلوں میں ہدایت کرتا ہے، ضرورت کے وقت دستگیری کرتا ہے۔ بیماری میں تیمار دار ہے، مصیبت میں غمخوار ہے۔ خاندان بھر کے بچوں کی تعلیم کا کفیل اور تربیت کا نگراں ہے اور خاندان کے باہر بھی ہمسایوں کے ہونہار لڑکوں کو اپنی قلیل آمدنی میں سے وظیفے دے کر مدرسے پڑھنے بھجواتا ہے، جو پڑھ چکے ہیں ان کی معاش کی فکر کرتا ہے، جو برسر کار ہیں اُن کی ترقی میں کوشاں ہے۔"

"وہ سچا دیندار ہے، مومن ہے، عابد ہے، زاہد ہے، احکام ظاہر کا پابند ہے، طریق باطن کا سالک ہے مگر نہ اسے دین کا گھمنڈ ہے، نہ ایمان کا، نہ عبادت کا، نہ زہد کا، نہ شریعت کا، نہ طریقت کا، وہ اپنی نجات کا وسیلہ دو چیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں "محبت اور خدمت"[1]

ہندی کے مشہور ادیب ایودھیا پرساد گوئیلی لکھتے ہیں :-

"حالی کی شخصیت اور اُن کے برتاؤ سے لوگ متاثر ہوتے تھے۔ ان کے دل میں کسی برائی کے تیر نہیں پہونچاتے تھے، وہ اپنی قوم کی بدحالی کی وجہ سے بے چین رہتے تھے ..... وہ سچائی، سادگی، سیدھائی اور رحم دلی اور صبر کی مجسم تصویر تھے"[2]

صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں :-

"مولانا حالی کی زندگی میں سچے ایثار کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، خود ان کا کلام ان کی سیرت کی اس اہم خصوصیت کی تفسیر ہے، یہ اعلیٰ صفات دراصل اس گہرے مذہبی احساس نے ان میں پیدا کی تھیں جو حالی کے دل میں بچپن سے موجود تھا..... جس نے ایک طرف اپنے خالق کی سچی محبت پیدا کی تو دوسری طرف انسانیت کا سچا درد عطا کیا"[3]

---

[1] مقالات عابد، صفحہ ۸۱-۸۲۔

[2] شعر و سخن (ہندی)، حصہ اول، صفحہ ۲۰۷ (۱۹۵۱ء)

[3] یادگار حالی، صفحہ ۱۰۰۔

शेर-ओ-सुखन भाग ... पृष्ठ ...

Marfat.com

غرض مولانا حالی اخلاق حسنہ کی مجسم تصویر تھے وہ اپنے اس شعر کی آپ ہی تفسیر تھے ؎

چیست انسانی ؟ تپیدن از غم ہمسائیگاں از سموم حادثہ ہا غلطیدن چو زاں رستہ

سیرتِ حالی کی یہی وہ نمایاں خصوصیت ہے، جس نے انھیں انسان نما فرشتہ اور بزرگ کامل بنا دیا۔ ضرورت ہے کہ ان کی ادبی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی خوبیاں بھی تفصیل سے لکھی جائیں، اور ادیب ادب اور اخلاق میں جو گہرا رشتہ ہے اس کا تجزیہ کیا جائے، نیز اس نا طائفہ کو جو عقیدہ کی حد تک مذہب اربابِ جدید ادب میں داخل ہو چکا ہے دور کیا جائے کہ ہر ادیب کو دین اخلاق کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ہر بے راہ روی و گمراہی کو روشن خیالی اور ترقی پسندی کا مترادف قرار دیا جانے لگا ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ حالی کی سیرت اور ان کے ادب کا مطالعہ بہت سے پیدا شدہ غلط عقیدہ کو ختم کر سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق :-

"انسانیت، پاکیزہ اخلاق اور صحیح ذوق کے اکتساب کے لیے، ان کے کلام اور ان کی سیرت کا مطالعہ ہماری قوم کے افراد خاص کر نوجوانوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔"

"شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی ..... دنیا کبھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہی، جن کے صاحب علم و فضل، باکمال، ذی درایت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں ہے۔"[52]

"ایسے پُر خلوص، دردمند، بلند فکر اور اعلیٰ اخلاق کے ادیب ہمیں صدہا سال میں پیدا ہوتے ہیں۔"

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

---

[52] حالی میری نظر میں، صفحہ ۲۰۔
[53] حالی میری نظر میں، صفحہ ۲۰۰۔

Marfat.com

مولانا حالی کے جانشین

اولاد اور شاگرد

نامناسب نہ ہوگا کہ مولانا حالی کی اولاد اور اُن کے شاگردوں کا مختصر طور پر ذکر کر دیا جائے۔

مولانا حالی کے کُل چھ بچے ہوئے، ۴ لڑکے اور ۲ لڑکیاں۔ جن میں سے دو لڑکے اور ایک لڑکی بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک بچہ تو پیدا ہونے کے صرف چند مہینے ہی زندہ رہا دوسرے صاحبزادے اعتقاد حسین اپنی عمر کی سات یا آٹھ بہاریں دیکھ سکے کہ خزاں آگئی اور گلشنِ حالی کا یہ گُلِ نورس ہمیشہ کے لئے مرجھا گیا۔ صاحبزادی رقیہ خاتون بھی کشمکشِ حیات کی تاب نہ لا سکی اور دس گیارہ برس کی عمر ہی میں عالمِ فانی سے رخصت ہو گئی۔

مولانا حالی کا نام حسب ذیل اولادوں سے روشن ہوا:۔

۱۔ **خواجہ اخلاق حسین**۔ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے انھیں متبنیٰ کر لیا تھا۔ حالی نے انھیں ہمیشہ برادرزادہ کہا۔ یہ اپنے باپ کے سچے جانشین تھے۔ عجز و انکسار، سنجیدگی و خاموشی، زہد و پرہیزگاری میں مشہور و ممتاز تھے۔ شاہ عبدالصمد سہسوانی کے مرید ہو گئے تھے۔ ۲۰ فروری ۱۹۲۴ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ آپ کے حسب ذیل چار اولادیں ہوئیں۔

مشتاق فاطمہ — خواجہ غلام الثقلین سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ خواجہ غلام السیدین اور صاحبزادی جیلن انھیں کے چشم و چراغ ہیں۔

اعتاق حسین — یہ ڈپٹی کمشنر رہتک کے دفتر میں اسٹینوگرافر تھے۔

اکرام حسین — عالمِ شباب میں انتقال کر گئے۔ ان کے دو لڑکے انعام حسین و افضال حسین ہوئے۔

صدیقۃ النساء — ان کی شادی خواجہ احمد حسین سے ہوئی تھی۔ ۹ فروری ۱۹۳۵ء میں انتقال ہو گیا کوئی اولاد نرینہ نہیں۔ چودھری نبی احمد کی لڑکیاں عباس فاطمہ، مجتبائی اور ارشاد فاطمہ ہیں

۲۔ **عنایت فاطمہ**۔ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئیں، خواجہ عبدالعلی سے ان کا نکاح ہوا۔ مولانا ان کو بہت چاہتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دو لڑکے خواجہ فرزند علی اور خواجہ عبدالولی اور ایک لڑکی سعیدہ بیگم چھوڑی۔ مولانا حالی کو اپنے ان نواسوں اور نواسی سے بے حد محبت تھی۔ سعیدہ بیگم کی شادی نلنشی حامد علی تحصیلدار سے ہوئی، ان سے دو لڑکے محمود علی اور مسعود علی ہوئے۔

۳۔ **خواجہ سجاد حسین**۔ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کیا۔ محکمۂ تعلیمات میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر ممتاز رہے۔ علمی و ادبی اور قومی حلقوں میں

Marfat.com

مولانا کے سچے جانشین تھے، مولانا سے آپ کو بہت محبت تھی، اپنے باپ کی یادگار قائم کرنے میں آپ نے اپنی ملازمت، دولت اور صحت کو قربان کر دیا۔ حالی مسلم ہائی اسکول آپ ہی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مولانا کی تصانیف کی اشاعت کا اہتمام آپ نے ہی کیا تھا، اور آپ ہی کی وجہ سے مولانا کے بہت سے قیمتی مسودات محفوظ رہ سکے اور ان کی طباعت ہو سکی۔

شاگردانِ حالی:—

مولانا حالی معلم اخلاق بھی تھے اور معلم ادبیات بھی۔ عمر کا بیشتر حصہ انھوں نے درس و تدریس میں صرف کیا تھا، اس لئے ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ یہاں شاگردوں سے مراد ایسے حضرات سے ہے جنھوں نے شعر و شاعری میں باقاعدہ اصلاح لی تھی۔ یوں تو تمام قومی و اخلاقی شاعر مولانا حالی کے شاگرد ہیں، جیسا کہ مولانا عبدالحق نے لکھا ہے کہ

"تقریباً کل قومی یا اخلاقی شاعران کے شاگرد ہیں"[1]

لیکن مولانا حالی سے کلام میں اصلاح لینے والے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان سے مشورۂ سخن بہتوں نے کیا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاگرد بنانے کے حق میں نہ تھے۔ صرف چند تلامذہ کا علم ہو سکا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ حکیم آزاد انصاری — انھیں آزاد انصاری کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کا نام حکیم سید احمد حسن تھا۔ آپ ۱۲۹۱ھ میں ناگپور میں پیدا ہوئے۔ خود لکھتے ہیں "مجھے مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل ہے"۔

۲۔ مولوی انصار حسین خاں — "شاعر دلی میں مولانا حالی کے قدردانوں میں سے ہیں"۔

۳۔ مولوی عبدالحق — مولوی صاحب نے بھی مولانا حالی سے اصلاح لی تھی۔

۴۔ بہادر یار جنگ — نواب صاحب کے بعد خواجہ الطاف حسین سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔

۵۔ چودھری خوشی محمد خاں ناظر — کردار و شاعری پر مولانا حالی کی نگاہ تھی۔

۶۔ سلیم پانی پتی — مولوی سید الدین سلیم پانی پتی بھی فن سخن میں مولانا حالی سے تلمذ رکھتے تھے۔

---

[1] تذکرۂ اشعار، صفحہ ۱۰۔

[2] یادگار حالی، صفحہ ۱۰۔

[3] یادگار حالی، صفحہ ۱۰۔

[4] ہندوؤں میں اردو، رفیق مارہروی، صفحہ ۲۰۰-۲۰۱۔

[5] تذکرۂ اشعار، صفحہ ۱۰۔

[6] یادگار حالی، صفحہ ۲۰۰-۲۰۱۔

[7] تذکرۂ اشعار، صفحہ ۱۰۔

[8] یادگار حالی، صفحہ ۲۰۰-۲۰۱۔

۸۔ سید — منشی سید اکبر مرزا (رئیس) ..... مولانا حالی سے بھی نسبت تلمذ حاصل کیا تھا۔

۸۔ شادان — مرزا حسین خاں ... مرزا غالب کے یہ کمسن مولانا حالی سے مشورہ سخن کیا۔

۹۔ عاشق — صاحبزادہ احمد سعید خاں نے نکات شاعری خواجہ الطاف حسین حالی سے حاصل کئے۔

۱۰۔ مولوی عبدالرحیم خاں ہیدی — آپ اکثر اپنی غزلیں مولانا حالی کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔

۱۱۔ کیفی دہلوی — پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کو فن شعر میں مولانا حالی سے تلمذ تھا۔ مسدس حالی کے طرز پر بھارت درپن لکھا۔

۱۲۔ مولوی محمد حسن نساز بہاری — فن شاعری میں مولانا حالی کے شاگرد تھے۔ آپ فارسی زبان و ادب کے بڑے فاضل تھے۔

۱۳۔ [illegible] عبدالدین حیدر خاں — مرزا غالب کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی ثاقب اور مولانا حالی سے مشورہ کرتے رہے۔

ثاقب

درحقیقت مولانا حالی نے شعر و سخن کے لئے ایسی شاہراہ قائم کی جو سیدھی صاف اور سب کے لئے ہر ادیب یا شاعر اس راستے پر شعوری یا غیر شعوری طور پر چلنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ مولانا کی تقلید نہ صرف قومی و اخلاقی شاعری میں کی گئی۔ بلکہ غزلوں، رباعیوں، مرثیوں اور دیگر اصناف و موضوعات میں انہیں کا طرز اختیار کیا گیا۔ صداقت، خلوص اور سادگی کا اثر کب نہ ہوتا؟

۷۔ [illegible] صفحہ ۱۰۱ - ۳۰۱۔

۹۔ [illegible] صفحہ ۳۰۰۔

۱۰۔ مکاتیب حالی، صفحہ ۳۰۔

۱۱۔ تذکرہ مفتاح المتغزلین اسماعیل پانی پتی نقوش صفحہ

۱۲۔ مکاتیب حالی۔ اسماعیل پانی پتی صفحہ ۲۵۔

۱۳۔ [illegible] غالب و مالک رام ایجوکیشنل بک ہاؤس صفحہ ۲۰۔

Marfat.com

تحلیلیا سیتا مالی کا تعارف

مولانا مالی کی شاعری، ان کی نثر نگاری پر بحث سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اگرچہ مولانا نے تصنیف و تالیف کا کام نظم سے شروع کیا تھا، لیکن مولانا کی نثر کی تصانیف کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے۔ مولانا کی ابتدائی تصانیف اردو نثر میں ہیں اور سب سے پہلی کتاب انھوں نے عربی میں لکھی۔

۱۔ عربی کا رسالہ
۱۹۵۲-۵۳ء

مولانا مالی جب [illegible] تھے اور [illegible] پڑھتے تھے۔ اس وقت [illegible] کی تائید میں لکھا تھا [illegible] "رسالہ آگرہ نمائیہ" [illegible] ہوئی تھا۔ اس [illegible] مولانا مالی [illegible]

۲۔ مولود شریف
۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء
کے درمیان

مولود شریف [illegible] کا لکھا ہوا مجلد مسودہ [illegible] کے مطابق ہوا جو ہو نقل کرنے کے بعد کاتب کو واپس کیا گیا اور اب خانوادۂ مولانا [illegible] کے کتب خانہ میں مولانا مرحوم کے دستخط [illegible]

[illegible]

یہ مسودہ [illegible] حس کے [illegible] اس سن [illegible] مولانا کی زندگی [illegible] عبارت [illegible] متقی و متجمع اور [illegible] میں پائی جاتی ہیں۔ [illegible] مولانا مالی نے [illegible] لکھی تھی۔ شروع میں نثر میں مناجات لکھی ہے جو نہایت دلکش ہے۔ [illegible]

سلہ مولود شریف، مطبوعہ مالی پریس، پانی پت، ۱۳۲۵ھ۔

Marfat.com

"الٰہی! وہ جلوہ دکھا جس کا حجاب اسی کی یکتائی ہے۔ جس کی اوٹ دیدۂ تماشائی ہے۔ جو علم و ادراک کے پردوں میں مستور ہے۔ جس کا منشا، خدا غایت غلو ہے، جس کے طالب کو وصول سے قطع نظر ہے، جس کا ملنا حوصلۂ توقع سے باہر ہے، جو تقریر میں نہ آئے، جو تحریر میں نہ سمائے سے وہ مانگتا ہوں جس کے بیان سے زبان گنگ ہے ۔۔۔ اے ولیٔ اگر روا ہو مطلب فقیر کا"

۳۔ تریاق مسموم

۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء

۱۸۵۷ء کے بعد عیسائی مبلغین نے اپنے سیاسی اقتدار کے بل بوتے اور حکمران طبقے کی اشارے پر مذہب اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم اور باقاعدہ پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔ پادریوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ اسلام کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ علمائے اسلام بھی ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا کا ہم وطن پادری عماد الدین نے ایک کتاب ہدایت المسلمین[1] لکھی جس میں اسلامی تعلیمات پر سخت حملے تھے۔ مولانا نے اس کتاب کے جواب میں "تریاق مسموم" لکھی، جو دلائل و براہین سے مزین لیکن لب و لہجہ میں قدرے تلخی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلا مسلمان کا پہلا جواب ہے۔ بعد میں دوسرے علماء خصوصاً مولانا محمد علی مونگیری مرحوم نے جوابات تحریر فرمائے۔

۴۔ تاریخ محمدی یہ منصفانہ رائے

۱۸۶۸ء

پادری عماد الدین نے تاریخ محمدی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں پیغمبر اسلام کی ذات گرامی پر رکیک حملے کئے۔ مولانا عالی، جو اس کی برداشت نہ کر سکے، نے اس کتاب پر مختصر تنقید لکھی اور پادری کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا۔ اور اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

۵۔ شواہد الالہام

۱۸۷۲ء

اس رسالہ میں مولانا نے عقلی دلائل سے نبوت اور الہام کی ضرورت کو ثابت کیا ہے۔ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر جامع ہے اور اپنی افادیت کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

۶۔ تذکرۂ رحمانیہ

۱۸۷۲ء

مولانا حالی نے اپنے استاد محترم مولانا عبدالرحمٰن کے حالات ۱۸۷۲ء میں لکھے اور اس کا نام تذکرۂ رحمانیہ یا سوانح مولانا عبدالرحمٰن رکھا۔ یہ تذکرہ مختصر ہونے کے باوجود مکمل ہے۔

مولانا حالی نے قیام لاہور کے زمانہ میں محکمہ تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی کے لئے دو کتابیں لکھیں۔

---

[1] مولود شریف مطبوعہ حالی پریس پانی پت ۱۳۲۲ھ صفحہ ۹۸۔ (کتاب میں صفحہ نمبر نہیں پڑا ہے)

[2] تذکرہ حالی میں اس کتاب کا نام تحقیق الایمان لکھا ہے۔ صفحہ ۱۱۹۔

Marfat.com

۷۔ طبقات الارض
سنہ ۱۸۷۲ء

اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی جس کو کسی مصری فاضل نے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ مولانا نے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کا حق تصنیف پنجاب یونیورسٹی کو بغیر کسی معاوضے کے دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں یہ یونیورسٹی نے اس کو شائع کیا۔

تذکرہ حالی اور دوسری کتابوں میں سن طباعت ۱۸۶۸ء درج ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ مولانا حالی نے اس کو قیام لاہور کے زمانہ میں لکھا تھا اور لاہور میں آنے کا سال ۱۸۷۲ء ہے۔[1]

۸۔ اصول فارسی
سنہ ۱۸۷۲ء

محکمہ تعلیم پنجاب کے لئے فارسی قواعد پر یہ کتاب لکھی تھی۔
"کتاب اُردو میں ہے اور فلسکیپ سائز کے ۲۵۹ صفحات پر نہایت خوشخط لکھی ہوئی ہے"[2]
یہ کتاب غالباً شائع نہیں ہوئی۔

۹۔ مجالس النساء
سنہ ۱۸۷۴ء

عورتوں کی اصلاح اور لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مولانا نے یہ کتاب ناول کی صورت میں دو حصوں میں لکھی، یہ ناول
"دلچسپ اور مفید ہونے کے علاوہ آسان اور سنجیدہ اُردو نویسی کا عمدہ نمونہ ہے"[3]
یہ کتاب عرصہ تک پنجاب اور یو۔پی کے نصاب میں داخل رہی۔ اس کتاب پر مولانا کو گورنمنٹ کی طرف سے چار سو روپیہ کا انعام بھی ملا تھا۔ دونوں حصے ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔

ادبی تصانیف:

۱۰۔ سوانح عمری حکیم ناصر خسرو علوی
حکیم ناصر خسرو علوی نے اپنا سفرنامہ قدیم فارسی میں لکھا تھا جس کا قلمی نسخہ نواب ضیاء الدین احمد خاں لوہارو کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ مولانا نے اس نسخہ کو ایڈٹ کیا اور بڑی تحقیق کے ساتھ حکیم کے سوانح حالات فارسی میں لکھے۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں۔
"یہ مضمون بہت طویل تھا اور بڑی محنت سے تیار کیا ہے اور اس وقت جتنے مشہور تذکرے یا کتابیں زیر دسترس پر مل سکتے تھے ان سے استفادہ کیا ہے ..... ان کے علاوہ فرانسیسی فاضل چارلس شیفر نے بھی اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے"[4]

---

[1] حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۲۹۔ (ترجمہ حالی بھی ملاحظہ ہو)
[2] تذکرہ حالی، صفحہ ۱۳۱ میں اس کتاب کا سن تصنیف ۱۸۶۹ء لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔
[3] مجالس النساء مطبوعہ حالی پریس ۱۸۷۴ء۔ ٹائٹل کا تیسرا صفحہ۔
[4] حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۱۶۔

Marfat.com

اصل سفرنامہ میں ۱۳۲ صفحے ہیں، مولانا حالی نے ۲۲ صفحوں میں حالات لکھے ہیں۔

۱۱۔ حیاتِ سعدی سنہ ۱۸۸۴ء

شیخ سعدی شیرازی کی مکمل و مبسوط سوانح عمری ہے جس میں دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں سعدی کے حالات تحقیق کے ساتھ لکھے ہیں، دوسرے حصہ میں کلام پر تبصرہ ہے۔

حیاتِ سعدی اردو میں سب سے پہلی کتاب سیرت نگاری پر ہے۔ مولانا شبلی اس کو دل سے پسند کرتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ:-

"یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ، محققانہ سوانح عمری ہے .... واقعی بے مثل ہے[۵۲]"

مولانا ابوالکلام آزاد اس کو حالی کی سب سے بہتر تصنیف سمجھتے تھے:-

"مولانا حالی کی سب سے بہتر کتاب حیاتِ سعدی ہے[۵۳]"

۱۲۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ یہ مقدمہ دیوان حالی کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا، یہ سنہ ۱۸۹۳ء کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں شعر کی تعریف اور اس کے خصائص پر مفصل بحث کی ہے۔ شعر و شاعری کے تاثرات اچھے اور برے دونوں کا ذکر کیا ہے۔ دوسرا حصہ اردو شاعری اور شاعروں پر مشتمل ہے۔

مولانا حالی ۱۸۸۲ء سے مقدمہ کے لئے مواد فراہم کر رہے تھے، عربی و فارسی ادب سے انھوں نے براہ راست اور انگریزی، لاطینی، یونانی ادب سے بالواسطہ ترجموں کے ذریعہ سے استفادہ کیا۔ مئی جون ۱۸۹۳ء میں کوہ نانی پر مقدمہ اور دیوان کو ترتیب دینا شروع اور ستمبر ۱۸۹۳ء تک مکمل کر لیا۔ یہ مقدمہ تنقید شعر و ادب پر خود ایک مستقل تصنیف ہے، اس کی اہمیت و افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۳۔ یادگارِ غالب سنہ ۱۸۹۷ء

مرزا غالب پر کتاب لکھنے کا خیال، مولانا کو ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء سے پیدا ہوا تھا، اور اسی وقت سے اس کی بھی ترتیب کرتے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ:-

"غالباً ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے .... مولوی صاحب اس زمانے میں حیاتِ جاوید کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ یادگارِ غالب کو بھی ترتیب دے رہے تھے[۵۴]"

---

۵۱ حیاتِ سعدی کے سن تصنیف میں اختلاف ہے، ڈاکٹر سید صادق حسین نے ۱۸۸۵ء (جامعہ دہلی اکتوبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۹۷) تذکرہ حالی میں غالباً ۱۸۸۴ء داستان تاریخ اردو میں ۱۸۸۶ء اور ۱۸۸۷ء درج ہے، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے مکاتیب حالی سے بدلائل ثابت کیا ہے کہ اوائل ۱۸۸۴ء میں حیاتِ سعدی شائع ہوئی۔ (حالی کا ذہنی ارتقاء صفحہ ۹۸)

۵۲ مولانا شبلی کا خط بنام غلام رسول مہر ۲ جنوری ۱۹۱۲ء (نقش آزاد۔ غلام رسول مہر، صفحہ ۴۲۶ طبع ۱۹۵۵ء)

۵۳ چند ہم عصر، صفحہ ۱۵۴۔

Marfat.com

یادگارِ غالب نے مرزا غالب کو زندۂ جاوید بنا دیا، اس میں ان کے حالاتِ زندگی ہیں، ان کے اُردو فارسی کلام پر تبصرہ ہے، مشکل اشعار کا مطلب ہے اور انتخاب ہے۔ غالب پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن یادگارِ غالب کو جو مقبولیت نصیب ہوئی وہ کسی اور کتاب کو نہ ہو سکی۔ اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۱۴۔ حیاتِ جاوید — سن ۱۹۰۱ء

مولانا حالی نے سرسید کے حالات مئی ۱۸۹۴ء سے لکھنا شروع کر دیے تھے[۱]۔ اس سے پہلے وہ سرسید کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکے تھے جیسا کہ یادگارِ غالب کے سلسلے میں مولوی عبدالحق نے تحریر فرمایا ہے "خود مولانا نے ستمبر اور اکتوبر ۱۸۹۳ء میں یہ مصمم ارادہ ظاہر کیا کہ وہ علی گڑھ میں رہ کر سرسید کی لائف لکھیں گے"[۲]۔ لیکن اپنی مسلسل علالت اور دوسری پریشانیوں کی وجہ سے حالی حیاتِ جاوید ۱۸۹۷ء سے پہلے مکمل نہ کر سکے اور سرسید کی زندگی میں شائع نہ کر سکے۔ ۱۸۹۸ء سے یہ کتاب چھپنا شروع ہوئی اور مارچ ۱۹۰۱ء میں جاکر حالی نے انڈکس مطبع میں بھیجا لکھتے ہیں کہ:۔

"حیاتِ جاوید کی انڈکس بڑی مشکل سے تیار ہوئی اور کل مطبع میں بھیج دی گئی"[۳]۔

غرض وہ مسلسل چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ تب کہیں جا کر تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل "حیاتِ جاوید" شائع ہو سکی۔ حالی نے سرسید کے حالات کافی تحقیق و تلاش سے جمع کیے اور ان کے کل واقعاتِ زندگی من و عن بیان کر دیے۔ اُردو میں سوانح نگاری کی ایسی کوئی کتاب پہلے نہیں تھی۔ حیاتِ جاوید نے [illegible] اور بدلتی ہوئی [illegible] حیاتِ جاوید [illegible] کی تفصیلات ملتی ہیں۔

۱۵۔ مضامینِ حالی — سن [illegible]

۱۸۷۵ء سے سن ۱۹۰۱ء تک کے مضامین کو جمع کر کے مولوی وحیدالدین صاحب سلیم پانی پتی نے چھپوایا تھا۔ یہ مضامین مختلف مسائل تہذیب و اخلاق معارف، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔

۱۶۔ مقالاتِ حالی — مولانا حالی نے مختلف عنوانات اور موضوعات پر جو مضامین [illegible]

دو حصے — پر تبصرے کیے، دیباچے لکھے اور تقریظات [illegible]

سن ۱۹۴۴ء — ترقی اُردو نے دو جلدوں میں شائع کیا۔ [illegible]

جلدیں تقریظات، تبصرے اور آرا پر مبنی۔ [illegible]

مقالاتِ حالی [illegible] مضامین کو جمع کر کے مسعود [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

Marfat.com

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، محمڈن اورینٹل کالج میگزین معارف، رفیق ہند، عصر جدید وغیرہ میں شائع ہوئے۔

مقالات حصہ دوم — اس میں ۱۲ تقاریر اور ۲ تبصرے ہیں جو مختلف کتب و رسائل پر کئے تھے

۱۷۔ مکتوبات حالی — مولوی اسماعیل پانی پتی نے مولانا حالی کے تمام خطوط، خواجہ سجاد حسین کی زیر ہدایت مرتب کئے تھے۔ یہ خطوط اردو ادب میں اہم اضافہ ہیں۔

دو جلد

سنہ ۱۹۲۵ء — پہلی جلد میں دوست احباب کے نام خطوط ہیں اور اس میں ۲۰۰ صفحات ہیں۔ دوسری جلد میں خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تفرق حسین کے نام خطوط ہیں اور اس میں ۱۵۰ صفحات ہیں۔

۱۸۔ مکاتیب حالی — مولانا حالی کے نادر و نایاب خطوط کو مولوی اسماعیل پانی پتی نے جمع کرنے

سنہ ۱۹۵۰ء — سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں ۲۱۰ خطوط ہیں جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے تھے۔ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ اردو خطوط ۵۲ — دوسرا حصہ فارسی خطوط ۹ — تیسرا حصہ عربی خطوط ۷

نامکمل مسودات:

۱۔ رسالہ تذکیر و تانیث۔ اس موضوع پر حالی کتاب لکھنا چاہتے تھے، لیکن صرف چند صفحات مسودات ہی لکھ سکے۔

۲۔ روداد جشن چہل سالہ نظام دکن۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں مولانا حیدرآباد جشن میں شرکت کی غرض سے گئے تھے، وہاں ان سے روداد جشن لکھنے کے لئے کہا گیا اور جملہ سامان فراہم کر دیا گیا، لیکن مولانا علالت کی وجہ سے تکمیل نہ کر سکے اور وطن واپس آ گئے۔

۳۔ مرزا داغ کے کلام کا انتخاب۔ مولانا حالی نے داغ کے کلام کا انتخاب کرنا شروع کیا تھا مگر مکمل نہ کر سکے۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں:۔

"مولانا حالی کچھ عرصے سے مرزا داغ مرحوم کے کلام کا انتخاب فرما رہے ہیں جس کے شائع ہونے کا ہر ایک مشتاق سخن کو نہایت اشتیاق ہے"[1]

۴۔ الناسہ۔ مولانا نے ۱۹۱۵ء میں ایک الناسہ فارسی میں لکھا، جس میں ہر فرقے اور ہر گروہ پر چوٹ کی گئی ہے۔ پچاس ساٹھ الفاظ کے اس مجموعے میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے تعصب، تنگ نظری، حماقت، جہالت اور خود غرضی کو

---

[1] مخزن لاہور، جلد دوم، صفحہ ۳۵۸۔

بڑے دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھا ہے[1]۔

ان کے علاوہ مولانا کی دلی تمنا یہ تھی کہ وہ

۱۔ آنحضرت صلعم کی ایک مکمل و مبسوط سوانح عمری لکھیں لیکن یہ سعادت شبلی کو ملی۔

۲۔ اصلاح معاشرت پر ناولیں۔ سلیس اور دلچسپ انداز میں لکھیں، سید ہاشمی فرید آبادی اور مولوی عبدالحق صاحب نے اس کا ذکر بھی کیا تھا لیکن بیماری نے مہلت نہ دی اور وقت موعود آ پہونچا[2]۔

تصانیف نظم

مولانا حالی کی شاعری کا میدان نہایت وسیع ہے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اور عفونت میں سنڈاس سے بدتر شاعری کو عطر بیز و مشک آمیز بنایا ہے، اور دشت شاعری کا سرسبز و شاداب چمن انھیں کی آبیاری کا ممنون ہے۔ انھوں نے شاعری کے خزاں رسیدہ چمن کو اپنے خون جگر سے سیراب کرکے حیات تازہ بخشی۔ اردو شاعری میں حالی کے کارنامے ہر حیثیت سے بلند اور رفیع ہیں۔ ان کی شاعری پر آئندہ صفحات میں مفصل بحث کی جائے گی، یہاں صرف ان کی تخلیقات نظم کو بصورت تعارف، کے پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا حالی نے نثر کی طرح نظم میں بھی مذہب سے ابتدا کی۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ ان کا ابتدائی کلام ضائع ہوگیا۔ حالی سے پہلے وہ خستہ تھے خستہ کی شاعری کا اچھا خاصا ذخیرہ رہا ہے لیکن اس میں سے صرف چند یادگار ہے۔

۱۔ خمسہ نعتیہ — ماجی جان عمدوسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر ایک تضمین لکھی، جس میں پانچ بند ہیں

سنہ ۱۸۵۶ء

۲۔ قصیدہ نعتیہ — یہ قصیدہ نعت میں ہے اس میں [illegible] ہیں مدحت سلطان دوجہاں کے لئے پاکیزہ زبان کے [illegible]

سنہ ۱۸۶۴-۶۵ء

یہ قصیدہ دیوان حالی میں شامل ہے۔

مولانا کی غزل گوئی کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا اور وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بھی مشق سخن کرتے تھے اور اپنا کلام مرزا غالب کی خدمت میں اصلاح کے لئے [illegible]

---

[1] مکتوبات حالی بنام دلگداز، نمبر ۲۲۔ اس سے دو سال قبل اگست ۱۹۱۴ء میں [illegible] ایک [illegible]

جواب دہ [illegible] نمبر ۳۔ ۱۸ [illegible] نمبر ۲۰ [illegible]

[2] تذکرہ حالی، صفحہ ۱۴۰۔ ۱۴۹۔

Marfat.com

۳۔ مرثیہ غالب
۱۸۶۹ء

اپنے استاد مرزا غالب کی وفات (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) پر حالی پھوٹ بہے اور ترکیب بند میں جس میں اسی بند اور سو اشعار ہیں، اپنے دلی جذبات اور تاثرات کو پیش کیا۔ یہ مرثیہ درد و اثر، روانی و برجستگی، خلوص و محبت، فصاحت و صداقت میں آپ اپنی مثال ہے۔ اس مرثیہ نے اردو میں نئے طرز کے مرثیہ لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ یہ دیوان میں شامل ہے۔

استاد کی موت کے بعد شیفتہ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ حالی تنہا رہ گئے۔ اس مدت میں ان کا کلام بہت کم ملتا ہے۔ چند غزلیں اور ایک قصیدہ میں بھی ہیں جن کا مطلع یہ ہے "۷۵ اشعار کا قصیدہ جو دیوان حالی میں موجود ہے۔ اس کے بعد وہ لاہور کے زمانۂ قیام میں شعر سخن کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور وہیں ان کی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ انگریزی نظموں کے ترجموں نے خیالات بدلے۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں نے جدید نظم کی عمارت تعمیر کی۔

۴۔ ایوانہوی کا کام
۱۸۷۴ء

یہ نظم انگریزی حکایت سے ماخوذ ہے۔ اس میں ۱۰۷۰ اشعار ہیں۔ نظم نہایت رواں اور سلیس ہے۔ مجموعہ نظم حالی میں شامل ہے۔

۵۔ لاہور کے مشاعرہ کی مثنویاں
۱۸۷۴ء

لاہور کے مشہور مناظمہ میں جس کی بنیاد آزاد مرحوم نے کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ڈالی تھی۔ مولانا حالی نے حسب ذیل چار مثنویاں پڑھی تھیں جو نہایت مقبول اور مشہور ہیں۔ یہ مثنویاں مجموعہ نظم حالی میں شامل ہیں۔ اور علیحدہ کتابی شکل میں بھی "چہار گلزار حالی" کے نام سے شائع ہوئیں۔

۱۔ برکھا رت۔ اس میں ۱۴۵۔ اشعار ہیں۔ ہندوستان کی برسات پر بہترین مثنوی ہے۔

۲۔ نشاطِ امید۔ اس میں ۹۲۔ اشعار ہیں۔ یہ نظم مایوسیوں کو ختم کر دیتی ہے۔

۳۔ حبِ وطن۔ اس میں ۲۱۵۔ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی اردو میں شاہکار ہے۔

۴۔ مناظرہ رحم و انصاف۔ اس میں ۱۱۹۔ اشعار ہیں۔ رحم و انصاف کی خصوصیات پر دلچسپ بحث ہے۔ زبان و بیان نہایت دلکش ہے۔

۶۔ ترکیب بند زمزمہ قیصری
۱۸۷۴ء

اس ترکیب بند میں ۳۵ بند ہیں اور ہر بند میں ۷۰ اشعار ہیں[1]۔ اس نظم کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

---

[1] ڈاکٹر مصطفےٰ صاحب نے ذہنی ارتقا میں ۳۶ بند لکھے ہیں صفحہ ۵۰ جو صحیح نہیں معلوم ہوتے کیونکہ مجموعہ نظم حالی اور کلیات نظم حالی جلد دوم دونوں میں ۳۵ بند ہیں۔

Marfat.com

"یہ نظم ایک انگریزی پوئم Poem کے تین حصوں میں سے اول حصہ کا منظوم ترجمہ ہے شاید مسٹر ایسٹوک اس کے مصنف ہیں..... اس نظم کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذکر ہے، دوسرے اور تیسرے حصہ میں تمام ہندوستانی رئیسوں کا جو دربار قیصری میں شریک ہوئے تھے عموماً اور حضور نظام کا خصوصاً تذکرہ ہے[1]"

مولانا حالی نے ترجمہ بڑی احتیاط سے کیا ہے اور جہاں کوئی لفظ حسب ضرورت بڑھایا ہے اسے قوسین میں لکھ دیا ہے۔ تشریح طلب الفاظ کی وضاحت بھی کر دی ہے۔

۷۔ **مسدس مدوجزر اسلام** اس مسدس میں ۴۵۶ بند یعنی ۱۳۶۸ اشعار ہیں، پہلے ۲۹۴ بند تھے، بعد میں ۱۶۲ بند کا اضافہ کیا گیا۔ حالی کی قومی شاعری کا آغاز ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء ہوا جب انھوں نے علی گڑھ کے مدرسہ کی افتتاح کے موقع پر ایک نظم مبارک باد، سرسید کو دہلی بھیجی تھی۔

مژدہ ہو کہ وقف جہاں گنج سعادت ہے آج فتنۂ اہرمن سے سب کو فراغت ہے آج

مسدس، مولانا حالی کا عظیم الشان اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔ سب سے پہلے یہ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا اور باوجود روکھی پھیکی اور سیدھی سادی نظم میں ہونے کے بہت جلد ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گیا۔

پہلے پہل اس نظم کا خاتمہ دلشکن اشعار پر ہوا تھا جس سے قوم میں مایوسی پیدا ہو گئی قوم نے حالی کو متوجہ کیا اور انھوں نے ۱۸۸۸ء میں ضمیمہ کے طور پر ۱۶۲ بندوں کا اضافہ کیا اور قدیم مسدس میں بھی جستہ جستہ تصرف کیا۔ حالی لکھتے ہیں:-

"قدیم مسدس میں بھی جستہ جستہ تصرف کیا گیا ہے..... نظم نہ پہلے اپنے کے قابل تھی اور نہ اب ہے مگر الحمدللہ کہ درد اور سچ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ امید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا[2]"

حالی کی یہ امید پوری ہوئی اور درد اتنا پھیلا اور سچ اتنا چمکا کہ ساری قوم اس سے متاثر ہوئی۔ مسدس کے سیکڑوں ایڈیشن ہزاروں کی تعداد میں اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور برابر شائع ہو رہے ہیں۔

۸۔ **ترکیب بند مدرسۃ العلوم مسلمانان ۱۸۸۰ء** اس ترکیب بند میں گیارہ بند ہیں اور ہر بند میں پانچ اشعار ہیں۔ پہلے چھ اشعار میں نظم حالی اور کلیات سے نظم حالی دونوں میں شامل ہے۔ اس ترکیب بند

---

[1] مجموعہ نظم حالی، صفحہ ۱۰۸۔

[2] دوسرا دیباچہ مسدس حالی، مطبوعہ نامی پریس کان پور، صفحہ ۱۱۳۔

Marfat.com

مولانا حالی نے مسلمانوں کی تعلیم، علی گڑھ مدرسہ کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ نظم نہایت سلیس اور رواں ہے۔

۹۔ مثنوی تعصب و انصاف ۱۸۸۷ء — اس مثنوی میں ۲۰۶، اشعار ہیں، یہ مجموعہ نظم حالی میں شامل ہے۔ اس مثنوی میں حالی نے قوم کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور تعصب کی برائیاں لکھی ہیں، نیز بعض فقراء، علماء، حکماء، اغنیاء اور دوسرے لوگوں کی ریاکاری اور نام کاری کا ذکر کیا ہے، اور سرسید اور ان کے رفقاء کو قوم کا سچا محسن بتایا ہے۔ یہ مثنوی سلاست اور روانی میں سہل ممتنع کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

۱۰۔ مثنوی کلمۃ الحق ۱۸۸۸ء — اس مثنوی میں کل ۱۲۰، اشعار ہیں۔ یہ بھی مجموعہ نظم حالی میں شامل ہے۔ راستی، راست گوئی، اور اس کے نتائج پر یہ مثنوی بڑے دلکش و پُر اثر انداز میں لکھی ہے، بچوں پر پہلے جو جو مصیبتیں آتی ہیں اور ان کے بعد انعام، جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے، ان سب کو بڑے لطیف پیرایہ میں لکھا ہے۔

۱۱۔ مناظرہ واعظ و شاعر ۱۸۸۳ء — اس قطعہ میں ۱۳۹، اشعار ہیں، یہ مجموعہ نظم حالی میں موجود ہے، مولانا حالی نے اس نظم کو شعرائے فارسی کے انداز میں لکھا ہے، اس میں شاعر اور واعظ کی زبان سے شاعری کے وہ تمام عیوب بیان کر دیئے جو واقعی موجود ہیں۔ شاعر اور واعظ کی نفسیات کو بھی بڑی خوبی سے سمجھایا ہے۔

۱۲۔ مناجات بیوہ ۱۸۸۵ء — یہ دو اشعار ڈھربی ہوئی مثنوی ۴۴۹ اشعار پر مشتمل ہے، کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ غم و یاس کا یہ حسین تاج محل اردو شاعری میں اپنی تاثیر اور کشش میں لاجواب ہے، بقول رام بابو سکسینہ:۔

"اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کاش! ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ ملتے اندوز ہوتے"[1]

اس نظم کے ترجمے دوسری زبانوں میں بھی ہوئے، اور کافی مقبول ہوئے۔

۱۳۔ مسدس نشاط خدمت ۱۸۸۶ء — اس مسدس میں ۵۵ بند یعنی ۱۶۵، اشعار ہیں، اور یہ مجموعہ نظم حالی میں شامل ہے، مولانا حالی نے اس نظم میں ملازمت کے علاوہ دوسرے تمام پیشوں کو خاص کر تجارت کو افضل و بہتر ثابت کیا ہے، قوم کی غفلت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

۱۴۔ پیوپٹ اور ایکے کا مناظرہ ۱۸۸۷ء — اس مثنوی میں ۱۴۸، اشعار ہیں، یہ مجموعہ نظم حالی میں موجود ہے۔ یہ مثنوی مناظرہ رحم و انصاف کے رنگ میں لکھی ہے، ایکے کی خوبیاں تو سب

---

[1] تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، صفحہ ۷۱۳۔

Marfat.com

جانتے ہیں، لیکن چھوٹ کی خوبیاں لکھنا حالی کا دل گردہ تھا، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

ہند میں کرتی نہ اگر میں وطن　　پھیلتے مغرب کے نہ یاں علم و فن

۱۵۔ **دولت اور وقت کا مناظرہ** ۱۸۸۷ء

اس مثنوی میں کل ۱۴۷ اشعار ہیں، یہ مجموعہ اور دیوان میں موجود ہے۔ حالی نے نہایت خوبی سے دولت اور وقت دونوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، لیکن عظمت اور بڑائی وقت ہی کو دی ہے اور اس کی اک اک آن کو انمول ثابت کیا ہے۔

۱۶۔ **مثنوی حقوق اولاد** ۱۸۸۸ء

اس مثنوی میں ۳۴۳ اشعار ہیں، یہ کسی مجموعہ کلام میں نہیں ہے، علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ یہ مثنوی اُن والدین کے لیے سبق آموز ہے جو بے جا لاڈ و پیار کر کے اپنے بچوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ مولانا حالی نے بڑے دلکش انداز میں ان خرابیوں کو بیان کیا ہے۔ یہ نظم اس لائق ہے کہ ہر گھر میں بچوں کے والدین پڑھتے رہیں اور اس سے سبق حاصل کریں، تاکہ بچوں کی نفسیات سے بھی واقف رہیں۔

۱۷۔ **شکوۂ ہند** ۱۸۸۸ء

اس ترکیب بند میں ۱۳ بند ہیں اور ہر بند میں آخری شعر سمیت ۱۱ شعر ہیں یعنی کل ۱۴۳ اشعار ہیں۔ یہ کلیات نظم حالی جلد دوم میں موجود ہے۔ اس نظم میں مولانا نے مسلمانوں کی پستی و بدحالی کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے اور اس کی وجہ بتائی ہے۔

"کہ کل کیا تھے اور آج کیا ہو گئے"

اس شکوہ کے ہر بند میں علیحدہ علیحدہ مسلمانوں کی [illegible] کے متعلق ملتا ہے۔ ہر بند میں اس کا ماتم کیا ہے۔

"عقابی شان سے جھپٹے جو تھے بے بال و پر نکلے"

درحقیقت اس نظم میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ملک کے باشندوں [illegible] اس ملک کی آب و ہوا کے موجب ہوتے ہیں اور جب غیر ملکی [illegible] اُن میں بھی رفتہ رفتہ مقامی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں [illegible] مسلمانوں کا ہوا۔

۱۸۔ **قصیدہ غیاثیہ یا عرض حال** ۱۸۸۸ء

بارگاہ نبوت میں یہ عرض حال ۱۰۶۳ اشعار پر مشتمل ہے [illegible] آخر میں شامل ہے۔

[illegible] کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۱۱۰-۱۱۱۔

Marfat.com

سرورِ کائنات کی جناب میں شاعر نے مسلمانوں کی حالت پر یہ عرض حال پیش کر کے امت مرحومہ کے غم میں آنسو بہائے ہیں۔ سب کہیں سے مایوس ہو کر رحمت عالم کے دربار میں فریاد کرنے حالی حاضر ہوئے اور اس سوز و گداز کے ساتھ فریاد کی کہ سننے والوں کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔

ملک خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے — اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
فریاد ہے اے کشتیِ اُمت کے نگہباں — بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
اے چشمۂ رحمت بابی انت و اُمّی — دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

رحمت عالم سے ہر مسلمان کو روحانی و قلبی تعلق ہے اور اس پر وہ فخر کرتا ہے۔

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے — نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے
کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں — خطروں میں بہت جس کا بہا آ کے گھرا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی — ہاں ایک نہ تیری کہ مقبول خدا ہے

اسی فریاد سے متاثر ہو کر آغا حشر کاشمیری نے شکریہ یورپ میں یہ دعا لکھی۔

اے دعا یاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے — اے خدا! اب پھیر دے رُخ گردشِ ایام کے

۱۹۔ مسلمانوں کی تعلیم اس ترکیب بند میں ۱۲ بند اور کل اشعار ۱۳۶ ہیں، یہ مجموعہ نظم حالی اور کلیات سنہ ۱۸۸۹ء نظم دوم میں موجود ہے۔ محمڈن ایجوکیشنل کے چوتھے اجلاس میں مقام علی گڑھ یہ پڑھا گیا تھا، اس میں دار العلوم کی اہمیت، افادیت اور سرسید احمد خاں کے احسانات کا ذکر ہے

۲۰-۲۱۔ **ترجیع بند** مولانا حالی نے اینگلو عربک اسکول دہلی کے طلبا کے لئے، پنجاب کے **برائے طلبا** گورنر کی تشریف آوری کے موقع پر دو ترجیع بند لکھے، جو مسدس کی شکل سنہ ۱۸۸۹ء میں ہیں۔ پہلا ترجیع بند سات بند کا ہے۔ اور دوسرا ترجیع بند ۱۲ بند کا ہے آخری دیوان میں موجود ہے، پہلا مکتوبات حصہ دوم میں۔

۲۲۔ **مجموعہ نظم حالی** مولانا حالی نے یہ مجموعہ خود شائع کرایا تھا، اس میں حسب ذیل نظمیں شامل سنہ ۱۸۹۰ء ہیں۔ جوانمردی کا کام، برکھا رت، نشاط امید، حب وطن، مناظرہ رحم و انصاف، ترکیب بند نمرمۂ قیصری، ترکیب بند مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ، تعصب و انصاف، کلمۃ الحق، مناظرہ واعظ و شاعر، نرنگ خدمت، جشن جوبلی، ہپوٹ اور لکیے کا مناظرہ

سلہ تذکرہ حالی میں صرف چودہ نظمیں (دولت اور وقت کا مناظرہ کو چھوڑ کر) ہیں۔ لیکن مجموعہ نظم حالی مطبوعہ حالی پریس پانی پت ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء میں ۱۸ نظمیں تھیں، یہ مجموعہ نایاب ہے۔ مجموعہ نظم حالی مطبوعہ عالمگیر لیکٹرک پریس لاہور میں مذکورۂ بالا پندرہ نظمیں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ غالباً ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔

Marfat.com

دولت اور ذلت کا مناظرہ، مسلمانوں کی تعلیم۔

۲۳۔ **قوم کا متوسط طبقہ** یہ نظم ترکیب بند ہے جس میں ۷ بند ہیں اور ہر بند ۱۵ شعر کا ہے کل ۱۰۵ اشعار ہیں۔ یہ ترکیب بند مولانا حالی نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۸۹۱ء چھٹے اجلاس بمقام علی گڑھ پڑھا تھا۔ اس کی وجہ تصنیف مولانا حالی خود لکھتے ہیں:۔

"اس نظم میں متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت کو فقر اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے[1]"

دم سے وابستہ ہے ان کے قوم کا سارا نظام یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

یہ نظم کلیات نظم حالی جلد دوم اور دیوان حالی، دونوں میں ہے۔

۲۴۔ **مرثیہ حکیم محمود خاں** یہ مرثیہ مسدس کی شکل میں ہے، اس میں ۴۶ بند یعنی ۲۳۸ شعر ہیں۔ یہ ۱۸۹۲ء دیوان میں موجود ہے۔ یہ مرثیہ نہیں بلکہ دلی کے علوم و فنون اور اسلامیان ہند کے زوال و ادبار کی نہایت حسرتناک اور دردناک داستان ہے، ایک ایک لفظ درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا مرثیہ ہے ایک کا اپنی ساری قوم کا

۲۵۔ **دہلی کا جلسۂ کانفرنس**۔ اس کانفرنس میں مولانا نے ایک ترکیب بند [illegible] کا پڑھا، اس میں ۱۸۹۲ء ۶۲ شعر ہیں، اور یہ دیوان حالی، نیز کلیات نظم دوم میں شامل ہے، اس ترکیب بند میں پہلے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر ہے، پھر قومی جشن کی اہمیت بتائی ہے اور سرسید کی خدمات کا تذکرہ ہے اور قوم کے خواہ [illegible] مخلصانہ کوشش کی ہے

یہ غفلتیں مبادا اب روز بد دکھائیں ڈھونڈھنے سے پھر نشاں بھی کہ مٹ جائیں

۲۶۔ **دیوان حالی** مولانا حالی نے اپنا سرمایۂ شاعری، غزلیات، قطعات، رباعیات وغیرہ یکجا کر کے دیوان کی صورت میں مطبع انصاری دہلی میں چھپوایا اور ۱۸۹۳ء اس کا ٹائٹل نامی پریس کانپور میں[2]۔ اس میں دیباچہ کے ساتھ مقدمہ بھی شامل کیا۔ بعد میں مقدمہ شعر و شاعری کے نام سے علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ دیوان کا کلام مضامین کے حساب سے ترتیب ذیل ہے:۔

ا۔ قطعات ۔۔۔ ب۔ غزلیات قدیم [illegible] ۔۔۔ ج۔ رباعیات ۱۰۸

---

[1] کلیات نظم حالی، جلد دوم، صفحہ ۲۷۔

[2] مکتوبات حالی، دوم، صفحہ ۲۹۔ تذکرہ حالی میں مولوی اسماعیل پانی پتی نے دیوان کی طباعت بھی نامی پریس کانپور لکھی ہے صفحہ ۱۰۲۔

Marfat.com

آخر میں سب ترتیب، تین مرثیے، دس بارہ مکمل اور نامکمل قصیدے، دو ترکیب بند جو کانفرنس کے جلسوں میں پڑھے گئے، تین چار ناتمام غزلیں، اور اسی قدر قطعے، ایک ترجیع بند، ایک مثنوی، اردو، فارسی اور عربی میں منظوم رقعات، شادی اور وفات کی تاریخیں، قطعے اور نقرے وغیرہ شامل ہیں۔ مجموعہ نظم حالی کی نظمیں یا دوسری مشہور نظمیں جو شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں جیسے مناجات بیوہ، حقوق اولاد، شکوۂ ہند وغیرہ دیوان میں شامل نہیں کی ہیں۔

اس کے بعد ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۱ء تک حالی کا منظوم اردو کلام نہیں ملتا ہے۔ صرف چند رباعیاں نظر سے گزری ہیں، اس کی خاص وجہ ان کی مسلسل علالت اور نثر کی تصانیف میں مصروفیت ہے۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مولانا حالی نے ان کا مرثیہ بھی اردو کے بجائے فارسی میں لکھا۔

۲۷۔ سرسید کا مرثیہ — یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے اس میں سات بند ہیں اور ہر بند میں آخری شعر کے علاوہ نو نو شعر ہیں۔ حالی کو سرسید سے جو گہری عقیدت تھی، اور سرسید نے قوم کے لیے جو کام کیے اور تکلیفیں برداشت کیں، اس مرثیہ کے ایک ایک لفظ سے ان کا اظہار ہوتا ہے۔

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم — گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

۲۸۔ ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ — یہ مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے اس میں چھ بند اور کل ۶۶ شعر ہیں۔ یہ جواہرات حالی میں ہے۔ اس میں مولانا نے کالج کے ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے اظہار غم کیا ہے، تیسرے بند میں انجیل مقدس کی تلمیحات ہیں۔ آخر میں کالج کا بھی ذکر کیا ہے۔

۲۹۔ گدایان قوم و ۳۰۔ صدائے گدایان قوم — پہلی نظم میں دس شعر اور دوسری میں ۶۵، اشعار ہیں۔ جواہرات حالی میں شامل ہیں، یہ دونوں نظمیں مولانا نے پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی جماعت "گدایان قوم" کے لیے لکھی تھی۔ یہ جماعت انجمن کے لیے چندہ وصول کرنے کی غرض سے ریاست بھاول پور جانا چاہتی تھی لیکن غالباً جا نہ سکی۔ ان نظموں میں قوم کے لیے چندہ دینے کے جذبات ابھارے ہیں۔

۳۱۔ شکریہ والی رام پور — محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس رام پور کے لیے مولانا نے یہ ترکیب بند لکھا تھا جو بیماری کی وجہ سے نامکمل رہا، اس میں چار بند اور کل ۵۲، اشعار ہیں، اس ترکیب بند میں تعلیم کی اہمیت، اسلاف رام پور کی خوبیاں اور جاری معمول کے خاتمہ کا بیان کیا ہے، اور حسب معمول فصاحت و سلاست اور روانی کے

دریا بہائے ہیں۔ کلیات نظم حالی جلد دوم میں شامل ہے[1]

۳۲۔ تحفۃ الاخوان سنہ ۱۹۰۶ء — یہ نظم ترکیب بند ہے اس میں کل سات بند ہیں، اور آخری شعر کے علاوہ پہلے بند میں ۱۰، دوسرے میں ۱۳، تیسرے میں ۱۴، چوتھے میں ۹، پانچویں میں ۱۴، چھٹے میں ۱۳ اور ساتویں میں ۲۰ شعر ہیں، کل ۱۰۱ اشعار ہیں، یہ نظم کلیات دوم میں شامل ہے۔ یہ نظم مولانا نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سولھویں سالانہ اجلاس منعقدہ دلی میں پڑھی تھی۔ اس نظم میں غیرت قومی کا جوش دلا کر قوم کو جہالت، پستی اور تنزل سے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نظم کے سنتے ہی ساری محفل مجلس عزا بن گئی..... نظم کے مسودہ کو نیلام کیا گیا جو ۲۰۱ روپے میں چھپا[2]

۳۳۔ فلسفۂ ترقی سنہ ۱۹۰۳ء — محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سترھویں جلسے میں یہ ترکیب بند مولانا نے پڑھا تھا۔ اس میں چھ بند ہیں اور کل ۶۰ اشعار ہیں۔ یہ کلیات نظم حالی جلد دوم میں شامل ہے۔ مولانا نے فلسفیانہ انداز میں قوموں کی ترقی اور تنزل کے اسباب دلکش انداز میں بیان کئے ہیں۔ [illegible]

نظم کا اقتباس پیام حالی کے نام صدیق بک ڈپو محفوظ خانہ میں ہے

۳۴۔ مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت — یہ ترکیب بند ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ مولانا نے اسٹریچی سنہ ۱۹۰۴ء ہال علی گڑھ میں مسٹر آرنلڈ کی روانگی کے وقت پڑھا تھا۔ اس میں [illegible] بند ہیں اور ۲۵ اشعار ہیں[3]

۳۵۔ ترکیب بند برسات — اس میں چھ بند ۴۰ اشعار ہیں، یہ کلیات نظم دوم میں شامل ہے[4]

انجمن حمایت اسلام لاہور انجمن کی خدمات کا ذکر کیا ہے [illegible] سنہ ۱۹۰۴ء مؤثر ہے[5]

۳۶۔ ترغیب امداد یتیماں — اس نظم میں ۵۴ شعر ہیں۔ کلیات نظم دوم میں [illegible] انجمن سنہ ۱۹۰۵ء مؤید اسلام دہلی کے جلسے میں پڑھی گئی۔ اس میں مولانا نے قوم کو غیرت دلائی ہے کہ ان کی بے غیرتی کی وجہ سے [illegible]

۳۷۔ چپ کی داد — اس میں [illegible] سنہ ۱۹۰۶ء یہ [illegible] نظم عورتوں کے [illegible]

اور کس مپرسی پر لکھی تھی، مولانا کی یہ نظم [illegible] کے ایک جلسہ میں جس کی صدارت [illegible]

---

[1] اسماعیل پانی پتی نے کلیات نظم دوم اور [illegible] میں [illegible]
[2] کلیات نظم دوم، صفحہ ۹۰۔
[3] و [4] ڈاکٹر وقار عظیم مصطفےٰ خاں نے [illegible]
[5] تذکرہ حالی اردو [illegible]

ان کے علاوہ مولانا حالی نے چھوٹی چھوٹی کئی نظمیں لکھیں، جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں :-

۳۸ - ناظرین کے لئے الوداعی نظم ۱۹۰۵ء
۳۹ - محسن الملک کا مرثیہ ۱۹۰۷ء
۴۰ - سید بچہ کے لئے نظم ۱۹۰۸ء
۴۱ - قطعہ تہنیت حکیم اجمل خاں مرحوم ۱۹۱۰ء
۴۲ - قطعہ تہنیت نظام دکن ۱۹۱۱ء
۴۳ - حاضرین کانفرنس سے خطاب۔
۴۴ - قوم کی طرف سے نظام کا شکریہ۔
۴۵ - علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے۔
۴۶ - جنگ ٹرکی و بلقان۔
۴۷ - شکریہ مولانا ظفر علی خاں۔
۴۸ - ہنگامہ کانپور پر رباعیاں ۱۹۱۳ء یہ مولانا کا آخری کلام ہے۔

آخری دور کا کلام پانچ چھ نظمیں، اور اسی قدر غزلیں نیز پچاس سے زائد رباعیاں ہیں۔
آپ کی آخری تینتیس رباعیاں ہنگامہ کانپور پر ہیں۔

۴۹ - مجموعہ اردو کلیات نظم حالی : مولانا حالی نے اپنی عربی و فارسی نظم و نثر کو جمع کر کے کلیات میں ۱۹۱۰ء بطور ضمیمہ شائع کیا تھا، جو مشتہر نہیں ہوا، مولوی اسماعیل پانی پتی نے بڑی تلاش کے ساتھ مولانا حالی کے کلام کو جمع کر کے حسب ذیل شکل میں شائع کیا۔

۱ - جواہر الحالی : مولانا کا وہ تمام منتشر کلام جو مختلف اخبارات و رسائل یا قلمی مسودات کی شکل ۱۹۱۵ء میں تھا، اس مجموعہ میں شامل ہے

۲ - کلیات نظم حالی جلد اول : اس کے تین حصے ہیں۔ حصہ اول میں ۸۳ قطعات ہیں۔ حصہ دوم میں ۱۹۱۵ء ۱۲۲ غزلیات ہیں۔ حصہ سوم میں ۱۵۰ رباعیات ہیں۔[1]

۳ - کلیات نظم حالی جلد دوم ۱۹۱۵ء - اس کلیات میں صرف بارہ ترکیب بند ہیں۔

مولانا اسماعیل پانی پتی کلام حالی کو چار جلدوں میں ترتیب دینا چاہتے تھے۔ ہر ایک جلد متعدد حصص پر تقسیم کی تھی صرف دو جلدیں شائع کر سکے۔ بقیہ دو جلدیں ہنوز مکمل نہ کر سکے، ان جلدوں میں قصائد، مرثیے وغیرہ ہیں۔

مولانا حالی کا حسب ذیل کلام کتابی شکل میں متعدد بار مختلف مطابع سے شائع ہوتا رہا ہے (دیوان مسدس اور دیگر مطبوعہ نظموں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے)۔

۵۰ - رباعیات حالی - یہ مجموعہ عقل و دانش سیکڑوں بار شائع ہو چکا ہے۔
۵۱ - قطعات حالی - یہ مجموعہ بھی سرمایۂ علم و حکمت ہے۔ مختلف مطابع سے شائع ہو چکا ہے۔
۵۲ - بچوں کے حالی - اس نام سے سعید انصاری نے ایک کتابچہ شائع کیا۔ اس میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو منتشر ہیں۔ ان کو جمع کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

---

[1] کلیات نظم اول میں بعض قطعات جو دیوان میں موجود ہیں، چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جیسے عقل اور نفس کی گفتگو، ناقصوں کا دعویٰ۔ ان کے علاوہ تین ناتمام غزلیں بھی نہیں ہیں۔

Marfat.com

باب دوم

عہد حالی اور اُس کا پس منظر

حالی کے عہد کی سیاسی و سماجی، مذہبی و اصلاحی،
ادبی و تعلیمی تحریکیں، مشرق و مغرب کی کشمکش، مختلف
مکاتبِ ادب، اخبارات و رسائل کا ذکر
حالی پر ان سب کے اثرات

Marfat.com

ترتیب

عنوان	صفحات
عہد اور ماحول کے اثرات	۹۵
سیاسی و سماجی حالات	۹۷
مذہبی و اصلاحی تحریکیں	۱۰۶
علمی و ادبی پس منظر	۱۱۸
اخبارات و رسائل	۱۲۹
تعلیمی پس منظر	۱۳۰
حالی پر اثرات	۱۳۵

عہد حالی اور اُس کا پس منظر

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(ادب اور ادیب دونوں اپنے عہد اور ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر عہد اپنے ماضی کی روایات صالحہ اور کاذبہ کا آئینہ دار ہوتا ہے، ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ ازمنہ ثلاثہ بظاہر الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت میں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، جو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کی جا سکتیں۔)

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات ہیں ایک دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

پس کسی عہد کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے ماقبل اور مابعد دونوں زمانوں کو بھی بخوبی سمجھا جائے۔ حالی جس عہد میں پیدا ہوئے اس عہد کی روایات کیا تھیں؟ یہ روایات کس طرح ظہور میں آئیں؟ ان روایات کا ماضی سے کیا تعلق تھا؟ اس عہد میں عوام کی طبیعتوں کے رجحانات کیا تھے؟ سوسائٹی کا مذاق کیا تھا؟ علوم و فنون نے کس حد تک ترقی کی تھی؟ سیاسی اور سماجی، مذہبی اور اخلاقی، علمی اور ادبی حالات کیا تھے؟ وقس علیٰ ہذا، حالی پر ان کے اثرات کیا کیا پڑے؟ یہ سب سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات معلوم کرنے کے لیے ہمیں تاریخ کے اوراق پلٹنے ہوں گے۔ سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی، تعلیمی و ادبی، مذہبی و اخلاقی قدروں کا جائزہ لینا ہوگا، اور اس کا تجزیہ کرنا ہوگا کہ حالی کی شخصیت کی تعمیر میں ان سب کا کہاں تک اثر ہے؟

ادب اور دور کا کیا تعلق ہے؟ اختر اورینوی لکھتے ہیں:-

"کسی دور کے ادب کو صحیح نظر سے سمجھنے کے لیے اس دور کو سمجھنا ضروری ہے یعنی اس دور کا ادب ماقبل کے میلانات کا سلسلہ لازمی ہے۔ ایک دور کی روایات [illegible] ہیں اور جدید رجحانات بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دلیل حیات [illegible] ملے ہوتی رہتی ہیں۔"[1]

یہی خیال بلکہ اصول ادیب کے لیے بھی صادق ہے کیونکہ

"ہر شاعر (ادیب) کے کلام میں ایک خاص رنگ اور ایک مخصوص پیغام نمایاں ہوتا ہے جو اس کے

---

[1] تنقید جدید۔ اختر اورینوی۔ صفحہ ۱۰۴۔

Marfat.com

کلام پر حاوی و ساری نظر آتا ہے، لیکن یہ تمام اجزاء، زمان و مکان کی ہم آہنگی، ترتیب و تشکیل کے داخلی اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور شاعر صحیفۂ فطرت کا مرقع نگار ہے وہ اسرار حقیقت کا سب سے زیادہ محرم ہے اور اخلاق کا سب سے بڑا معلم اور واقعات کا سب سے بڑا مبصر۔ اس کے نزدیک زندگی کا نام ہی اضطراب پیہم ہے۔ شاعری محض تفریح طبع کا سامان نہیں ہوتی بلکہ اپنے اندر ایک خاص مقصد ایک مستقل کیفیت، ایک مخصوص اثر رکھتی ہے۔ اس کا وجود عالم فطرت کا ایک آئینہ ہے، جس میں ماحول کے ہر موثر منظر کا عکس ضروری ہے[۵۱]۔

لیکن شاعری میں ماحول کے ہر موثر منظر کا عکس ہی ضروری نہیں ہوتا، بلکہ شاعر کی فطرت شناس اور نکتہ رس نظر، معمولی سے معمولی مناظر میں بھی اسرار حقیقت دیکھ لیتی ہے اور ببانگ دہل اعلان کرتی ہے

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نداشت　　دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

تاہم "ادیب کسی عالم بالا کی مخلوق نہیں ہوتا اور نہ اس کی دنیا خلق اللہ کی دنیا سے بے تعلق اور بے نیاز رہ سکتی ہے، ادیب ایک مخصوص دور اور ایک مخصوص ہیئت اجتماعی اور ایک مخصوص نظام خیالات کی مخلوق ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسان یا مزدور، اور ادیب بھی خارجی اسباب و حالات کو اسی طرح اثر قبول کرتا ہے جس طرح ہمارے اور حرکات و سکنات، اگر شاعر کی زبان کو الہامی زبان مان بھی لیا جائے تو پھر یہ الہامی زبان دراصل زمانہ اور ماحول کی زبان ہوتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر یا ادیب جو کچھ کہتا ہے ایک اندرونی تحریک یا اپج سے کہتا ہے۔ جس کو ہم خداداد اور انفرادی چیز سمجھتے ہیں، لیکن یہ اپج دراصل ان اثرات و میلانات کا غیر شعوری نتیجہ ہوتی ہے جن کو مجموعی طور پر نظام تمدن یا سماج کہتے ہیں[۵۲]"

"اسے دوسری طرح یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر یا ادیب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے محرکات گرد و پیش کی اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں، جہاں تمام انسان زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ محرکات خود اس سماجی اور اقتصادی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کی شیرازہ بندی کرتا ہے، اس لئے اعلیٰ شاعری یا ادب ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ترجمان ہوتا ہے[۵۳]"

حالی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے، اسی سن میں آخری مغل شہنشاہ، بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے یہ عہد انقلاب انگیز اور ہنگامہ خیز عہد تھا، مغرب سے آئی ہوئی قوموں نے تاجرانہ لباس اتار کر

---

۵۱ زمانہ کانپور، ۱۹۳۶ء، اردو شاعری پر ایک نظر، صفحہ ۲۳۔

۵۲ ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری، صفحہ ۱۴۶۔

۵۳ نیا ادب، ترقی پسند مصنفین کی تحریک، علی سردار جعفری، صفحہ ۹۷۔

Marfat.com

شاہانہ تاج رکھ لیا تھا۔ انگریز مغرب کی دوسری قوموں کو سیاست اور تجارت کے میدان میں شکست فاش دے چکے تھے۔ اب وہ تن تنہا ہندوستان جنت نشان کے مالک بنتے جا رہے تھے ہگلی کے کنارہ کا ایک قطعہ زمین، اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ پورا ملک اسی کے اندر سما گیا۔

سب سے آخر کو لے گئی بازی ایک شائستہ قوم مغرب کی (حالی)

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کی یہ قوم انگریز بظاہر نہایت مہذب اور شائستہ تھی، دانشمندی اور تدبر میں اس کا جواب نہیں تھا، لیکن اس کی خصلت روباہی تھی، وہ تعلیم و تہذیب اور تجارت کے پردے میں ہندوستانیوں کو جاہل، وحشی اور خانہ بدوش بنانے جا رہی تھی۔ اس کی دوستی آسمان کی دشمنی سے بھی زیادہ خطرناک اور تباہ کن ثابت ہو رہی تھی۔ ہندوستان کی تمام ریاستیں ایک ایک کر کے اس کی پُر فریب سیاست کا شکار ہوتی جا رہی تھیں۔ ملک کی دولت ہر ممکن طریقہ سے لوٹی جا رہی تھی اور اس لوٹ کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا ذمہ دار کلائیو تھا سلطنت ساز کلائیو، درحقیقت غارت گر ہندوستان تھا، جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

"حکومت نام نہاد تجارت تھی اور تجارت یکسر لوٹ، اس کی اور مثالیں دنیا کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں، اور یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ طریق کار برسوں نہیں بلکہ نسلوں تک مختلف ناموں سے جاری رہا۔"[1]

غرض ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی (مصحفی)

خود مولانا حالی نے اس کو شائستہ لوٹ کہا ہے۔

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن ۔۔۔ مذمت اس لٹیرے کی جو لوٹے بے علمی و بے سلیقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں ۔۔۔ یہ گن پن ہے بہاری گلشن سے تجھ میں بیشتر آتی

ایک طرف یہ دانا یان فرنگ تھے جو اپنی حکمت عملیوں سے ہندوستانیوں کا مکمل استحصال کرتے جا رہے تھے، دوسری طرف پدرم سلطان بود، اور ہمچوں من دیگرے نیست، کے نشہ میں مست و سرشار، سیاست افرنگ سے ناآشنا، تعیش و تغافل کا شکار ہندوستانی فرنگیوں کی حمایت پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ میر جعفر اور میر صادق جیسے غداران وطن انگریزوں سے مادر وطن کی غلامی کا سودا کر چکے تھے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن ۔۔۔ ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن (اقبال)

لیکن سراج الدولہ نے آزادی پر غلامی کو ترجیح دی اور نہ ٹیپو سلطان نے روباہی خصلت اختیار کی۔

---

[1] ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ ۲۵۴۔

Marfat.com

دونوں نے اپنی مادر وطن کے لیے، اپنی اپنی جانیں قربان کر دیں۔

انگریز کا بڑھتا ہوا اقتدار دیکھ کر نانا فرنسویس نے ۶ مئی ۱۷۸۸ء کو حسب ذیل خط ا
وکیل مقیم دہلی کو لکھا تھا:۔

"معلوم ہوا ہے کہ کلکتہ کے انگریز دہلی کے شہنشاہ کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کرتے ہوئے شہنشاہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں، اس لئے تمہیں چاہیئے کہ شہنشاہ اور نجف خاں کو مندرجہ ذیل حقائق سے آگاہ کر دو۔"

ٹوپی کا رول کا طرز طریق نامناسب اور عیارانہ ہے وہ ابتدا میں ہندی نامداروں کو اپنے ساتھ متحد ہونے کے مفاد بتاتے ہیں لیکن آخر کار ان کی مملکتوں پر قابض ہو کر انھیں زندانوں میں بند کر دیتے ہیں، مثال کے طور پر شجاع الدولہ اور محمد علی خاں پیش کئے جا سکتے ہیں، تمہیں چاہیئے کہ اہل مغرب کو اچھی طرح دبا دو ورنہ یورپ کے یہ اجنبی تمام علاقہ پر قابض ہو جائیں گے اور یہ اچھا نہیں، شہنشاہ کو چاہیئے کہ وہ عزت و ناموس کے لیے اس مسئلہ کی طرف توجہ کرے[۵۲]"

لیکن دربار دہلی کی حالت ڈاکٹر تارا چند کے الفاظ میں:۔

"دربار دہلی کے اندرونی معاملات کی یہ حالت تھی کہ مختلف امراء، نائب وزیر بننے کے لیے سازشیں کرتے رہتے تھے، کبھی کوئی کامیاب ہو جاتا تھا اور کبھی کوئی..... ان سازشوں میں مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اور نواب اودھ نے نمایاں حصہ لیا[۵۳]"

اور اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے، ہندوستان کی حالت ایک دم توڑتے ہوئے انسان کی طر ہو گئی تھی۔ مغلیہ سلطنت پر مرگ آفریں زوال آ گیا۔ سارا ملک بدنظمی و بدامنی کا شکار ہو گیا، اور اس نتیجہ یہ ہوا کہ:۔

"اندرونی جھگڑے پیدا ہو گئے، سلطنت کا سارا اختیار و اقتدار جاتا رہا اور پردیسیوں نے بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کا خاتمہ کر دیا[۵۴]"

حالانکہ "ہندوستان میں مغلیہ سلطنت صرف حکومت نہ تھی، وہ عظمت انسانی، تہذیب و شائستگی، اور علم و فن کے بیکراں ترقی و اشاعت اور اس بشارت گیتی نورد کی بھی نمائندہ تھی جو عرب سے بلند ہو کر ایشیا، افریقہ اور یورپ میں بھی گونجی، اور جس سے دنیا کا کوئی متمدن خطہ

---

۵۱ کمپنی کی حکومت کے مصنف نے نجیب خاں لکھا ہے، جو بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں ہوا۔ اس لیے سر نجف خاں ہی صحیح ہے، کیونکہ دربار میں اس کا اثر کافی تھا۔

۵۲ کمپنی کی حکومت مصنفہ باری صفحہ ۱۳۱-۱۳۲۔ ۵۳ اہل ہند کی مختصر تاریخ، صفحہ ۳۴۲-۳۴۳۔

۵۴ اہل ہند کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر تارا چند، صفحہ ۳۹۷۔

Marfat.com

ناآشنا نہ رہا۔ اس نے ہندوستان کے اخلاقی روایات اور تہذیبی امکانات کو نمو اور تازگی بخشی
جو اجتماعی رواداری، اور فنون لطیفہ میں پوری ہوئی[۵۱]"

ن انگریزوں نے اس اجتماعی رواداری کو باہمی اختلاف سے بدل دیا اور رفتہ رفتہ یہی اختلاف
ہی اور غلامی کا سبب بنا۔ اس زمانہ کی بے کسانہ زندگی اور سماجی حالت کی جھلک ادب
آرٹ میں نمایاں ہے۔

"اس کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ لوگ مصیبت اور ذلت میں گرفتار اور زندگی
سے بیزار تھے۔ اٹھارھویں (انیسویں) صدی کا ادب، مذاق طبیعت، طرز ادا اور نفس مضمون
تینوں کے لحاظ سے گرا ہوا ہے۔ اگرچہ الفاظ کی شوکت، ترکیبوں کی ندرت اور تشبیہوں کی
صنعت گری نے اس پر ملمع کر رکھا ہے، کمزور مغل بادشاہوں اور صوبیداروں کے دربار میں
شاعری تصنع، مبالغے اور جذبات پرستی سے معمور تھی، اس زمانہ میں سوسائٹی کی جو حالت تھی،
اس کی تصویر اردو شعرا میں، میر نے سوز و گداز کے ساتھ، سودا نے بجو طنز کے پیرائے میں
اور ناسخ و آتش نے صنعت گری اور جذبات پرستی کے رنگ میں کھینچی ہے۔ بنگالی زبان میں
بھارت چندر، رام پرشاد اور ان کے ہمعصروں کی شاعری میں انھیں رجحانوں کی جھلک نظر آتی ہے[۵۲]"

انیسویں صدی انگریز تاجروں کے لئے نزلہ حکومت ہند سے کرنا نظر آتی ہے[۵۳]
نے شہنشاہیت اور حکومت کے اختیارات اعلیٰ حاصل کر لئے۔ انگریز تاجروں نے ہندوستان کی
صنعت و حرفت، دولت و تجارت تباہ اور برباد کر دی۔ میجر باسو کہتا ہے:-

"یہ تجارت ظلم کی ایک مشین ثابت ہوئی۔ جس سے بدقسمت اور مجبور کاشتکار تباہ ہونے لگے۔ ان پر
ان کے انگریز آقا طرح طرح کی مہذب بربریت کا استعمال کرتے تھے اور اس سے محظوظ ہوتے تھے[۵۴]"

ہچنسن Hutchenson کے الفاظ ہیں

"یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ برطانوی نواب، تاجر اور کارخانہ دار بے خبر انقلابی تھے
ان کو تو لوٹ اور نفع کی طمع ہندوستان لائی تھی[۵۵]"

کمپنی کے اس ظلم و استبداد کو بعض منصف مزاج انگریز بھی ناپسند کرتے تھے، جن میں مسٹر برک کا نام
زندہ رہے گا۔ اس نے انگریزوں کے مظالم کے خلاف، پارلیمنٹ میں [illegible]

---

۵۱ تقابل صفحہ ۳۱۰ کوئی جملہ کہ [illegible]

۵۲ ہندی مختصر تاریخ۔ صفحہ ۳۹۰۔

۵۳ انگریزی سلطنت کا انتظام انتیسویں صدی۔ صفحہ ۵۔

۵۴ امپائر آف دی نابس، صفحہ ۲۱۲ Empire of the Nabobs Page 224

اور صاف صاف کہا :-

"تاتاریوں کی یورش سے ہندوستانیوں کو بے شک نقصان پہنچا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستانیوں کو تباہ کیے ڈالتی ہے، نوعمر لڑکے ملک پر حکومت کر رہے ہیں، جہاں کے باشندوں سے نہ ان سے میل جول ہے اور نہ ان سے ہمدردی ہے، دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کہ کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوتی ہے اور ملک میں ان کی آمد کا ایک تانتا لگا ہوا ہے، ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہونچ جاتی ہے، ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک ان موسمی شکاری پرندوں کے نئے نئے غول اسی طرح آتے جاتے رہیں گے۔ جن کی بھوک ہر مرتبہ اور زیادہ تیز ہوتی جائے گی، دراں حالیکہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائے گی۔"[1]

اسی طرح ڈبلیو ہوسٹ نے اپنی کتاب "آبادکاری اور مسیحیت" (مطبوعہ لندن ۱۸۴۸ء) میں ایک انگریز کے خط کا حسب ذیل اقتباس پیش کیا ہے :-

"ہماری شہنشاہی کی بنیاد کسی باہمی صلاح و مشورہ پر قائم نہیں ہے، یہ وہ شہنشاہی نہیں ہے جو کسی قانون سے ہاتھ آئی ہو، یہ تو زبردستی حاصل کی گئی ہے، اور اس پر اب بھی براہ راست قوت اور دباؤ سے حکومت کی جا رہی ہے، ملک کے کسی حصہ نے اپنی مرضی سے الحاق قبول نہیں کیا ہے۔ ہم کو پہلے پہل صرف اپنا مال بیچنے کے لیے ساحل پر قدم رکھنے کی اجازت دی گئی تھی لیکن آخر کار رفتہ رفتہ کبھی زبردستی اور کبھی دھوکے اور فریب سے ہم نے دیسی بادشاہوں کو ختم کر دیا۔ ہم نے امراء سے تمام اختیارات چھین لیے ان کو بالکل بے بس بنا دیا اور ان کی صنعت اور ذرائع آمدنی کو بالکل تباہ کر دیا۔"[2]

قصہ مختصر "کمپنی نے اپنی تجارت اور حکومت کے مخلوط عہد میں حکومت کے پردہ میں خوب زر کشی کی۔ ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کیا، انھیں بڑے عہدوں سے خارج کیا۔ دارالتجار کو ذریعہ آمدنی قرار دینے کے بعد ہندوستانیوں کے ساتھ تحقیر کا برتاؤ کیا۔ ان شکایات اور دیگر وجوہ کی بنا پر پارلیمنٹ نے ۱۸۱۳ء میں کمپنی سے تجارت کرنے کا حق چھین لیا۔"[3]

اس قانون کی رو سے کمپنی کو صرف چین کی تجارت کرنے سے محروم کر دی گئی اور اس کو انگریزی مقبوضات سے حکومت کرنے کا حق حاصل ہو گیا، گویا اب وہ پورے اختیارات کے ساتھ

---

[1] تہذیب مغرب، جلد سوم، صفحہ ۷۸-۷۹۔

[2] کاروان معیشت۔ نجم الدین شکیب، صفحہ ۲۳۴۔

[3] مسلمانوں کا روشن مستقبل، طفیل احمد، صفحہ ۸۔

ہندوستانیوں کو شاد اور برباد کر کے غلام بنا سکتی تھی۔ کمپنی کا یہ دور ۱۸۵۷ء تک قائم رہا۔ اس دور میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار پورے ملک پر قائم ہو گیا اور ان کے نظام حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ ڈاکٹر تارا چند نے انگریزوں کی حکومت اور مغربی تعلیمات اور ایجادات سے جو نتائج مرتب ہوئے، ان پر مفصل بحث کی ہے، یہاں ان کی رائے کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"اس عہد میں ہندوستان میں جو نئی قوتیں کار فرما ہیں ان میں بعض مادی ہیں اور بعض ذہنی ..... مغربی مشینوں کے استعمال نے ..... ہندوستان کی اقتصادی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا ہے ..... آبادی کی ترقی اور غیر آباد زمینوں اور جنگلوں کے آباد ہو جانے کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں اتصال پیدا ہو گیا ہے اور ہندوستانیوں کا متحد ہو جانا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ یہ تو مادی قوتیں ہیں۔

"اب رہے وہ ذہنی اسباب جن سے یہ انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ قومیت کے احساس کا پھیلنا، تحقیق و تنقید کا شوق ہونا، ترقی اور اثبات خودی کا جوش پیدا ہونا۔ یہ سب مغرب کے سائنٹفک اور جمہوری زندگی کے نمونے اور انگریزوں کے بنائے ہوئے [illegible] علاوہ انگریزوں کے اپنے مکمل نظام اور قوانین کو ہندوستان کے [illegible] ان سب کی بدولت [illegible]

[illegible]

غرض ہندوستانی شعوری طور پر انگریزوں کی تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونے لگے اور [illegible] رنگ میں رنگنے لگے لیکن بعض رنگ اتنے گہرے اور پختہ تھے کہ ان پر مغربی رنگ چڑھ نہ سکا اور یک کشمکش کی ابتدا ہوئی۔ اسی کو ہم مغربی و مشرقی خیالات کی کشمکش کہتے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی تھی اور مضر بھی۔ مفید اس لیے کہ انگریزوں کی اندھی تقلید سے ہندوستانی محفوظ اور ہوشیار ہو گئے مضر اس لیے کہ [illegible] اچھی باتوں کی بھی مخالفت کی۔ انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے یہ معنی نہیں تھے کہ مشرقی تہذیب و اخلاق کا جنازہ نکل جائے۔ اس میں کوئی شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ مشرقی اخلاق و تہذیب بعض خصوصیات میں [illegible] بڑھا ہوا تھا اور [illegible] میں بعض ایسی باتیں [illegible] زوال کی علامتیں تھیں لیکن بہت سی اور بہت سی باتیں [illegible] زیادہ شریفانہ اور [illegible] تھیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر یہ انیسویں صدی کے نصف دوم میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار ہندوستان پر مسلط

سلسلہ [illegible] کی [illegible]

Marfat.com

ہو چکا تھا، مگر ان کا تہذیبی اقتدار ہنوز قائم نہیں ہوا تھا۔ ہندوستانی اپنی پرانی تہذیب سے مطمئن تھے، اور اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا سیاسی انحطاط دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہے، ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں، ان کے ادب اور فنون لطیفہ میں، حقیقت کی روح کم اور تصنع کا رنگ زیادہ ہو گیا اور مجموعی طور پر ان کی تہذیب اس قدر جامد ہو گئی ہے کہ اس میں نشوونما پانے کی اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی[1]۔

ڈاکٹر صاحب مغربی تہذیب کی مخالفت کی ایک اور وجہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"مغربی تہذیب اپنے ساتھ نئے حالات اور نئی زندگی کے جو فرحت بخش جھونکے لائے تھے، انھیں [illegible] ہندوستانی سیاسی اور سماجی غلامی کی زہریلی گیس کی بو آتی تھی[2]۔

[illegible] ہندوستانی اپنی تہذیب کی حفاظت اور وطن کی آزادی کی خاطر [illegible] کے لئے کمربستہ ہو گئے لیکن یہ سیلاب رکا نہیں، کیونکہ

"یہ حقیقت بھی ہمیشہ [illegible] ہندوستان پر راج کرنے والے انگریز ایسی قوم سے متعلق تھے جو خود سائنس، دین، صنعتی، تہذیبی نظر کے کونوں (نقطۂ نظر) سے ہر دن ترقی پذیر اور ترقی پسند تھی۔ سیکڑوں قابل افراد کی بدولت اور جہازوں معلوم اور نامعلوم ذریعوں سے انگریزوں کی ترقی کا اثر ہندوستان پہنچتا تھا[3]۔

مرکزی حکومت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا، انگریز نے اپنے مفاد کی غرض سے جو چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنائی تھیں، ان کو انگریزی حکومت کا اژدہا ایک ایک کر کے نگلتا جا رہا تھا۔ انگریز کی پُرفریب سیاست کے دام میں ہندوستانی مدبر و حکمراں پھنستے گئے۔

اپنی منقاروں سے اپنے آشیانے کو ہے آپ چمن پر خود گرے تنکے جو تھے بجلی کا کام آسماں کا

صیاد کے اقبال نے مرغانِ چمن کو اسیر کر لیا، پھولے پھلے اور ہرے بھرے چمن پر خزاں آ گئی، آشیانے جلا کر خاکستر کر دیے گئے۔

رہی کیا تھا جو فلک بے رحم کو منظور دیکھا کیے آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

کچھ عرصہ [illegible] ناتواں اسیر اس قابل بھی نہیں رکھے گئے کہ وہ اپنے اجڑے ہوئے چمن کو حسرت سے بھی دیکھنے کی جرأت کر سکیں، محکومی و غلامی، ذلت و رسوائی، مجبوری و بے چارگی، مفلسی و افلاس، غربت و بدحالی کی یہ دردانگیز داستان، سیلکم لوٹن جج عدالت العالیہ

---

[1] و [2] قومی تہذیب کا مسئلہ، ڈاکٹر سید عابد حسین، صفحہ ۱۸۹، ۱۹۰۔

[3] ہندوستانی سماجیات، ڈاکٹر جعفر حسن، صفحہ ۱۲۰-۱۲۱۔

مدراس ممبر کونسل، ان الفاظ میں لکھتا ہے :-

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا، ان کے قدیم [illegible]
بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم و رواج کی [illegible]
جاگیریں ضبط کرلیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا [illegible]
انھیں تکلیف دے کر مالگزاری وصول کی، [illegible]
انھیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کئے"[1]

مجاہد حریت، علامہ فضل حق خیرآبادی انھیں باتوں کے [illegible]
گیا تھا، برطانی نصاریٰ کی پُرفریب سیاست کے متعلق اپنے رسالہ عذریہ میں لکھتے ہیں :-

"برطانوی نصاریٰ جب ممالک ہند دیہات و بلاد پر قابض ہو گئے اور [illegible]
مضبوط کرلیا تو تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل و خوار اس حد تک کر دیا کہ وہ [illegible]
کو جنبش نہ دے سکتے تھے اس کے بعد یہ لوگ [illegible]
تاکہ پھر یہ لوگ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
انگریز کی ایسی ہی نیت تھی کہ کسی طرح ہندوستان کو [illegible]

کرجائے، اس مقصد کے پیش نظر [illegible]
اجراء کے لئے مسلسل اور باقاعدہ جدوجہد کرنا شروع کی، مسٹر [illegible]
ایک رپورٹ کا اقتباس جو انھوں نے [illegible]
ہے کہ اس ملک میں انگریزی تعلیم جاری کرنے سے انگریز [illegible]

"یہ بعض انگلستان کے فضلاء میں [illegible]
اور یہ [illegible]
کے ساتھ تمام عقلی باتوں کی عمارت [illegible]

غلط باتوں کا مطلب یہ ہندوستان کی [illegible]
ہے؟ جواب تک سیکڑوں برسوں سے اور [illegible]

---

[1] نوری بشارت صفحہ ۱۲ [illegible]

Marfat.com

سب کو ختم کر کے اپنے فنون، فلسفہ اور مذہب کی تعلیم دینے کا خاص مقصد وہی تھا جس کی طرف علامہ فضل حق خیر آبادی مرحوم نے اشارہ کیا ہے۔

"مگر بلا شبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوگی۔"

گویا تعلیم کے پردے میں مذہبی تبلیغ کا کام جاری کیا گیا، اور سب کو دین مسیحی قبول کرنے کی جبریہ دعوت دی گئی۔

"مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوؤں کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔"

"ہندو اس قدر کمزور دل ہیں کہ ان میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہونے کی ہرگز امید نہیں ہے۔"

"اس اندیشہ سے کہ تعلیم پھیلنے سے کسی زمانہ میں ہماری حکومت متزلزل ہو جائے، اور ہمارے فوائد کو نقصان پہنچے، ہمیں ہندوستانیوں کو سچے مذہب (یعنی مذہب مسیحی) سے اور بہترین اخلاق سے اور علوم و فنون کے اصول سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔"

"جس طرح کہ مسلمانوں نے دفتر کی زبان فارسی کر دی تھی، اسی طرح انگریزی جاری کرنے سے بہت سے اور دقتوں کے کام میں آسانی ہوگی اور ہندوستان سے خوشی سے حاصل کریں گے کیونکہ اس سے ان کی وقعت اور اہمیت بڑھے گی۔"[1]

اقتباس نمبر ۳ سے یہ امر ثابت ہے کہ مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانے میں ہندوؤں کے مذہب پر کسی قسم کا اثر یا دباؤ نہیں ڈالا تھا، انھیں پوری پوری آزادی تھی، اور ہندو مسلمان دونوں شیر و شکر کی طرح رہتے تھے۔ انگریزوں نے جس طرح حاکم و محکوم میں ہر قسم کا فرق رکھا تھا مسلمانوں کے زمانہ میں اس فرق کا نام و نشان بھی نہیں ملتا، ہندوؤں کے مذہبی، سماجی اور دینی عقائد اسی طرح قائم تھے، مسلمان حاکم ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں کے مذہبی جذبات اور روایات کا احترام کرتے تھے، روزمرہ کے کاموں میں وہ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، اپنے ہندو حلوائی کی دوکان سے، دور سے کھڑے ہو کر مٹھائی لینے میں ذلت نہیں محسوس کرتے تھے، اسی طرح اپنے ہندو بھائی سے چھو سے پانی پینے میں اور وہ بھی دور رہ کر، انھیں عار نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کے عقائد میں چھوت چھات کی اہمیت ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے۔ اس لئے وہ ان تمام باتوں کو برا نہیں مانتے تھے اور ایک اچھے حاکم، مخلص بھائی، ہمدرد پڑوسی کی طرح رہتے تھے۔

---

[1] تاریخ التعلیم از سید محمود صفحہ ۱۷۷ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷۔

Marfat.com

ان کا وطن ہندوستان ہی ہوگیا تھا، اس لیے ان کی ترقی و فلاح بھی اسی میں تھی کہ وہ باہم مل جل کر رہیں۔ وہ اس راز سے بخوبی واقف تھے کہ

"کوئی قوم ترقی اور سعادت کے راستہ پر چل ہی نہیں سکتی اگر وہ دوسری قوم کے ساتھ مدنا ہمت اور رفاقت کا جذبہ اپنے اندر پیدا نہ کر سکے، جن طبعی اور تاریخی عناصر پر ہندوستان مشتمل ہے اس کا تقاضہ یہی رہا ہے کہ وہ یک رنگی میں بوقلمونی اور بوقلمونی میں یک رنگی پیدا کرے"[1]

یہ شعور اور تجزیہ، یہ وسیع النظری اور انسانی ہمدردی، ان کی مذہبی تعلیمات، ان کی عالمگیر حکمرانی کی بدولت تھی۔ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی تو مغربی قوموں بالخصوص انگریزوں کی تھی۔ ان کی ترقی اور بقا بھی اسی پالیسی پر منحصر تھی۔ اس لیے انھوں نے ہر طریقہ سے اختلاف و افتراق کو ہوا دی۔ ہندو مسلم کے گنگا جمنی تعلقات کو ختم کرنے کی منظم سازش اور باقاعدہ جدوجہد کی[2]۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، دوستی، دشمنی سے، محبت، نفرت سے بدل گئی۔ حالانکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ برطانوی عہد سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات انتہائی شگفتہ تھے، زندگی کے ہر شعبہ میں خلوص و محبت، اتحاد و یگانگت کے اثرات کارفرما تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک مشترک علمی اور ادبی ذوق پیدا کر لیا تھا۔ ان کی ایک متحدہ و مشترکہ زبان بن چکی تھی، دونوں ہندی و سنسکرت، عربی و فارسی کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سب کے امتزاج سے ایک نئی زبان اردو وجود میں آ چکی تھی جس کی آبیاری میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ زبان و ادب کے علاوہ مذہبی رواداری مثالی تھی، ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میلوں ٹھیلوں، محفلوں اور سبھاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ سماجی تعلقات عزیزوں سے زیادہ گہرے تھے، شادی بیاہ، موت و زندگی میں برابر کے شریک ہوتے تھے، ہندو مسلمان ایک خاندان کی حیثیت سے رہتے تھے۔ غرض انگریزوں سے پہلے ہندو مسلم فساد کا نام تک نہیں تھا۔ یہ لعنت تو صرف مہذب انگریز کی بدولت ہندوستان میں آئی اور کچھ عرصہ کے بعد ہر ہندی کی گردن میں یہ طوق لعنت پڑ گیا، اس کا انجام بجز غلامی و محکومی کے اور کیا ہوتا؟

انگریزوں کی غلامی کا ردعمل مختلف تحریکوں کی شکل میں نمودار ہوا لیکن کوئی تحریک اتنی زیادہ کامیاب نہ ہو سکی کہ انگریز کا اقتدار ہندوستان سے ختم ہو جاتا۔

---

[1] نقد غالب، صفحہ ۳۱۵۔ (کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ رشید احمد صدیقی)

[2] اس سلسلہ میں انگریزوں کے خطوط اور احکامات موجود ہیں۔ مراد آباد کے کمانڈر انچیف کرنل جوہن نرمن نے لکھا:۔
حکومت ہند کو لڑانے اور حکومت کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔ لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی نے ۱۸۵۹ء کو لکھا:۔
لڑا کر حکومت کرنا دونوں کا شیوہ تھا اور یہی شیوہ ہمارا بھی ہونا چاہیے۔ (کوائف و حقائق ۱۸۵۷ء صفحہ ۱۰)

Marfat.com

سب سے پہلے مذہبی تحریک کا ذکر مختصر طور پر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہی تحریک تمام تحریکوں کا محرک ہے۔ مشرق و مذہب لازم و ملزوم رہے ہیں۔ مشرق کا مزاج ہر مذہبی تحریک کو بہت آسانی سے قبول کر لیتا ہے اور ہر مذہبی رہنما کی قیادت پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے، جس سے خود غرض اور ریاکار مذہبی رہنماؤں کی بن آتی ہے اور قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہونچتا ہے۔ البتہ مخلص اور بے لوث مذہبی پیشوا اس جذبۂ ایمانی سے ظاہر خواہ فائدہ حاصل کرتے ہیں، اور وہ خدا کی مخلوق کو راہ راست پر چلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ انھیں باکمال بزرگوں میں ہیں جنھوں نے ملت اسلامیہ کی شکستہ اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے پار نکالنے کی کوشش کی اور ایک تحریک شروع کی جو ولی اللہی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی، یہ تحریک مذہبی اور سیاسی تھی۔ شاہ صاحب کے نزدیک زوال قوم کا خاص سبب اقتصادی بدحالی ہے، ان کا قول ہے کہ:۔

"جس سماج میں اقتصادی توازن نہ ہو وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے[۵۱]"

لیکن حقیقت میں ولی اللہی تحریک، خالص مذہبی تحریک تھی، جہاں تک مذہب اسلام کا تعلق ہے سیاست اس سے علیحدہ نہیں ہے، اس لیئے مسلمانوں کی کوئی بھی تحریک ہو، غیر مذہبی ہوتے ہوئے بھی بڑی حد تک مذہبی ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب کی تحریک بھی اپنے اندر جامعیت و وسعت رکھنے کے باوجود بنیادی طور پر مذہبی تھی، یہ تحریک اس لیئے شروع کی گئی تھی کہ مسلمانوں میں مذہب کے نام پر جو غیر اسلامی عقائد پیدا ہو گئے تھے ان کی اصلاح کی جائے۔ شاہ صاحب کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ

"مسلمانوں کو بھی تکلفات اور ہندی رسموں سے بچنا اور عہد رسالت کی سادہ عربیت کی طرف پلٹنا چاہیئے[۵۲]"

اگرچہ "سیاسیات میں انھوں نے براہ راست کوئی مؤثر عملی حصہ نہیں لیا، لیکن بعض تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ تیموری خاندان کی حکومت سے بہت بیزار اور مایوس ہو گئے تھے[۵۳]"

اسی لیئے شاہ صاحب نے ہر کردہ کو مخاطب کیا:۔

"انھوں نے بادشاہوں، امیروں، عسکریوں، مشائخ، واعظوں، عابدوں اور گنج نشینوں کو خاص طور پر اور ہر قسم کی برائی دور کرنے کی ہدایت فرمائی، عوام کو بھی ان کی گمراہی اور بے خبری پر متنبہ کیا[۵۴]"

---

[۵۱] نوائے آزادی، صفحہ ۱۔
[۵۲] ماہ نو کراچی، مئی ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۶، شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک۔
[۵۳] خیر کثیر، صفحہ ۱۱۳۔
[۵۴] تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلوی، مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم (ماخوذ)

Marfat.com

شاہ صاحب کا انتقال ۱۷۶۲ء مطابق ۱۱۷۶ھ میں ہوگیا۔ ان کے بعد مسند شاہیہ پر ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز جلوہ افروز ہوئے۔ آپ کی مذہبی و اصلاحی خدمات محتاج تعارف نہیں، شاہ صاحب کے علاوہ ان کے دوسرے بھائی حضرت شاہ رفیع الدین رح، حضرت شاہ عبدالقادر رح اور حضرت شاہ عبدالغنی رح بھی اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔ شاہ اسمٰعیل شہید انہیں شاہ عبدالغنی رح کے فرزند تھے، جو سید احمد بریلوی رح کی تحریک کی روح تھے اور بالاکوٹ میں شہید ہوئے

"شاہ عبدالعزیز رح نے، شاہ ولی اللہ رح کی مذہبی اور سیاسی تحریک کو جاری رکھا، حضرت شاہ رفیع الدین رح اور شاہ عبدالقادر رح نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ شاہ ولی اللہ رح کی تحریک سے متاثر تھے، اور ان کی تحریک اصلاح کو چلانے میں طاقتور انجن ثابت ہوئے۔ [illegible] زیر نظر زمانے میں دہلوی اردو ملک کے اکثر اقطاع کی مشترک زبان بن گئی تھی اور اس کے [illegible] ہر گوشے میں گونجنے لگے تھے تاہم علم و ادب کی مجلس میں [illegible] کو ایک [illegible] مغل شاہی دربار کے بجائے دلی الٰہی خانوادے نے اسے عطا کیا تھا۔[1]

"شاہ عبدالعزیز رح کے بعد درس و افتاء کی مسند پر مولوی محمد اسحاق بیٹھے اور ان کے بعد مولوی عبدالغنی عمری صدر مدرس ہوئے۔ مولانا محمد قاسم رح اور مولانا رشید احمد گنگوہی انہیں کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مدرسہ رحیمیہ بند ہوگیا۔ لیکن امن و امان ہونے کے بعد دیوبند میں ۱۸۶۶ء میں مدرسہ قائم ہوا۔ یہ مدرسہ رحیمیہ کی بازگشت ہے، غرض شاہ ولی اللہ رح کا تعلیمی چشمہ اب تک [illegible] تشنہ کاموں کو سیراب کر چکا ہے اور [illegible]

حضرت شاہ ولی اللہ رح کی اصلاحی تحریک [illegible] کے نمائندے [illegible] ہزرگان ملت کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ مولانا [illegible] آئے۔ شاہ عبدالعزیز رح کے [illegible] اصلاح و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ مولانا [illegible] کو ہمراہ لے کر آپ نے ملک کا دورہ کیا اور اپنے [illegible] بیدار کیا۔ آپ کے قول و عمل میں تضاد نہ تھا۔ شیخ [illegible]

"ان کی بات میں بڑی تاثیر تھی۔ ان کی اپنی وضع قطع [illegible] سے خالی ہوتا تھا۔ علماء میں سید احمد شہید [illegible] لیتے تھے۔ طبیعت میں خاصہ [illegible]

---

[1] و [2] شاہ ولی اللہ رح کی اصلاحی تحریک [illegible]

[illegible]

Marfat.com

کہ جو الفاظ زبان سے نکلتے، سامعین کے دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتے۔"

مولوی محمد اسمٰعیل شہید نے آپ کے ارشادات کو جمع کر کے فارسی میں صراط مستقیم کے نام سے شائع کیا یہ کتاب مسلمانوں کے اندر پھیلی ہوئی بدعتوں، مذہبی و معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کا علاج بتاتی ہے۔ اس نے اصلاح المسلمین میں بڑا حصہ لیا ہے۔ سید صاحب کے حلقۂ اثر میں بہت سے جلد جلیل القدر علماء آ گئے، شمالی ہند میں آپ کے مریدین کی تعداد کافی ہو گئی۔ مسلمانوں میں اسلامی زندگی کا احیاء ہوا۔ آپ کے زمانہ میں پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا، ان کے لئے مذہبی فرائض کی بجا آوری ناممکن تھی، عزت و آبرو، دین و ایمان سب پر ڈاکہ ڈالا جا رہا تھا۔ سید صاحب نے اپنے خلیفہ مولوی محمد اسمٰعیل شہیدؒ کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا اور تصدیق ہو جانے کے بعد علم جہاد بلند کیا، دربار لاہور کو اطلاع دی گئی، مسلسل چار برس تک مصروف جہاد رہے جون سنہ ۱۸۳۴ء میں پشاور پر قابض ہو گئے۔ احکامات شرعی جاری کئے گئے۔ امن کا اعلان کیا گیا۔ سید صاحب کی کوششیں کامیاب ہوئیں، لیکن ان کے مخالفین بھی خاموش نہیں تھے، سازشیں ہونے لگیں۔ زر و مال کے انبار، غداران ملت کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ علمائے سو نے اپنے اپنے ترکش سے کفر کے فتووں کے تیر نکالے۔ زر پرست خوانین اور ان کے سرداران مخالف ہو گئے، مجاہدین کو بیک وقت شہید کر دینے کا پروگرام بنا۔ بالآخر

"یہ مردان خدا جو انتخاب ملک ہندوستان کے تھے، مثل گائے اور بکریوں کے ظالموں کے ہاتھ سے ذبح کئے گئے۔"[۵۲]

اس دردناک واقعہ کے بعد سید صاحب نے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ کے ساتھ مجاہدین بھی تیار ہو گئے اور بالاکوٹ پہنچے اور اسی مقام پر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو معرکۂ حق و باطل میں آپ نے اپنے رفقاء مولوی محمد اسمٰعیل شہید، مولوی خیر الدین اور ارباب بہرام خاں کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں پاکانِ پاک طینت را

سید صاحب نے صرف پینتالیس سال کی عمر پائی، مگر اس تھوڑے عرصہ میں آپ پورے شمالی ہندوستان پر چھا گئے۔ آپ نے حق پرستوں کی ایک مخلص اور باعمل جماعت قائم کر دی جس نے آپ کے مقدس مشن کو زندہ رکھا۔ مولوی ولایت علی عظیم آبادی اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی عنایت علی نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ بنگال، مدراس اور دوسرے دور دراز مقامات کا دورہ کر کے

---

[۵۱] موج کوثر، شیخ محمد اکرام صفحہ ۵۔ [۵۲] موج کوثر، شیخ محمد اکرام، صفحہ ۲۴۔
[۵۳] سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر صفحہ ۲۱۔ ماخوذ۔

Marfat.com

مسلمانوں میں احساس ملی بیدار کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں :۔

"یہ لوگ مثل مشنریوں کے ان تھک کام کرتے تھے، وہ بے لوث اور بے نفس لوگ تھے، جن کا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا۔ اور روپیہ اور آدمی بہم پہونچانے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے، ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔"[۵۱]

مولوی عنایت علی نے سرحد جاکر سردار گلاب سنگھ گورنر کشمیر سے معرکہ آرائی کی اور تمام مفتوحہ علاقہ واپس لے لیا اور قلعے اور مورچے واپس لے کر سید ضامن شاہ کو دے دیئے۔[۵۲]

مولوی ولایت علی بھی ۱۸۴۰ء میں سرحد پہونچ گئے، لیکن ۱۸۴۵ء میں سکھوں اور انگریزوں میں مصالحت ہوگئی۔ حکومت نے انھیں مقررہ مدت تک سرحد سے چلے جانے کا حکم دیا۔ مدت ختم ہونے پر مولوی ولایت علی اور ان کی جماعت نے اپنی اپنی جائدادیں فروخت کرکے سرحد سے ہجرت کرگئے اور استھانہ میں مستقل سکونت اختیار کی اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ پٹنہ سے ان حضرات کا ہجرت کرنا تھا کہ عام مسلمان بھی ہجرت کرنے لگے۔ کیونکہ

"مسلمانوں پر تعلیم و ملازمت کے دروازے بالکل بند ہوچکے تھے، ان کی مالی، تعلیمی اور عام حالت روز بروز بدسے بدتر ہوتی چلی جاتی تھی۔[۵۳]
اس لئے "علماء ترک وطن کرکے مکہ معظمہ اور سرحد کو چلے جاتے تھے اور ... کتنے لوگ تحصیل علم کے لئے استھانہ اور ستونت جاتے رہتے تھے۔"[۵۴]

مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی کے بعد ان کے جانشینوں کو انصاف پسند انگریزی حکومت نے بغاوت کے الزام میں ماخوذ کرکے کالے پانی کی سزائیں دیں۔ ان سب مصائب میں یہ نیک نفس بزرگ جس طرح ثابت قدم رہے اور اپنے کام کو جاری رکھا اس کی مثال ملنا مشکل ہے، حکومت کی اس جابرانہ پالیسی نے مسلمانوں کو خوف زدہ اور بددل کردیا، ان کو باعزت طور پر رہنے اور جینے کا کوئی سہارا باقی نہ رکھا گیا۔ ہندوستان عملاً مسلم کش و مسلم دشمن بن چکا تھا۔ مسلمانوں نے اسے دارالحرب قرار دے دیا۔ ان ناخوشگوار حالات کا مقابلہ مولوی عبداللطیف خاں سکریٹری سٹریچی ایسوسی ایشن کلکتہ اور سرسید احمد خاں نیز مولوی کرامت علی جونپوری نے دانشمندی کے ساتھ کیا۔ بالآخر وائسرائے ہند نے وہابی قیدیوں کا رہا کردیا اور

"ان مجاہدین کو دیار ہند میں نظام کی رہائی کا اعلان شائع ہوا۔"[۵۵]

---

۵۱ مسلمانان ہند ... (illegible)
۵۲ الدر المنثور معروف بہ تذکرہ ... از مولوی عبدالرحیم ... صفحہ ۱۳۶۔
۵۳ و ۵۴ ماخوذ از کلکتہ ریویو ۱۸۷۱ء صفحہ ۱۹۵۔
۵۵ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۴۴۴ ... الرسول اینڈ برادرز گنج لاہور ... ۱۹۵۳ء۔

Marfat.com

علمائے کرام کے علاوہ سید صاحب کے مریدین میں متعدد اصحاب علم اور ارباب کمال تھے۔ اُردو مایۂ ناز شاعر حکیم مومن خاں مومن سید صاحب کی تحریک کے زبردست پیرو تھے، اور

"مولانا ولایت علی کے قیام دہلی کے زمانے میں مومن برابر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے وعظ میں شرکت کرتے تھے"[1]

سید صاحب سے مومن کو خاص عقیدت تھی، ان کے کلام میں جا بجا اس قسم کے اشارے ملتے ہیں، انہوں نے سید صاحب کی شان میں ایک مثنوی بھی لکھی، جس میں سید صاحب کو امام زمانہ، خضر طریق رسول نور مجسم، ظل اللہ، اور سفیر امتان رسول خدا کہا ہے، نیز مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ

امام زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لیے جاں نثاری کرو

اور اپنے لیے یہ دعا کی ہے۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل ہے افضل عبادت نصیب

تو اپنی عنایت سے توفیق دے — عروج شہید اور صدیق دے

اسی طرح ایک رباعی میں فرماتے ہیں۔

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں — ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہاں

انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز — وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

مومن نے سید صاحب کی امامت کے متعلق بھی اشعار لکھے ہیں۔ جن میں انھیں مہدی دوراں کہا ہے

کلاہ ناز سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ — کہ فکر مدحت سبط قسیم کوثر ہے

وہ کون امام جہاں و جہانیاں — کہ محض مقتدیِ سنت پیمبر ہے

وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سماں خریج — امام برحق مہدی نشاں علی فر ہے

مومن کے اس کلام سے متاثر ہو کر صاحب روح نو نے تحریر فرمایا ہے۔

"حالی کو بالعموم مسلمانان ہند کا پہلا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ مولانا سید احمد بریلوی نے پہلی دفعہ مسلمانان ہند کو دوسری قوموں کے مقابلے میں جمع کیا اور ان کے ایک طبقے کو مذہبی آزادی دلانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسلمانان ہند کی جداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے انھوں نے کیا۔ اس صورت میں مومن کو مسلمانان ہند کا پہلا قومی شاعر ماننا پڑے گا کیونکہ ان نے مولانا سید احمد کے خیالات کی ترجمانی اسی طرح کی جس طرح بعد میں سرسید کی حالی نے"[2]

غرض سید صاحب کی تحریک سے سبھی متاثر ہوئے۔ اور تحریک کی مخالفت بھی شدت کے ساتھ

---

[1] مرکز عشق نما جہین، صفحہ ۱۲۷۔ [2] روح کوثر، صفحہ ۲۰۰۔

Marfat.com

ہوئی۔ مخالفین میں ارباب کمال نظر آتے ہیں جب مولانا اسمٰعیل شہید نے بدعات و محدثات کے خلاف آواز اٹھائی تو اک آگ سی لگ گئی۔ علماء راسخین مخالف ہو گئے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی پیر کا روال تھے۔ بحث و مباحثہ اور مناظرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علامہ نے وہابیوں کے خلاف غالب سے ایک مثنوی لکھوائی، لیکن مثنوی دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔ غالب نے دلجوئی کے لیے چند اشعار کا اور اضافہ کر دیا۔ مولانا حالی اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مرزا کو شاہ صاحب کے خصوصاً تو اور نہ ان کے مخالفوں سے تعلق بلکہ صرف دوست کی رضا جوئی مقصود تھی، چنانچہ علامہ کے کہنے سے کچھ اور اشعار کا اضافہ کر کے دوست کو رضامند کر لیا۔"[1]

اختلاف اور مناظرہ کی یہ لے اس صدی تک بڑھی کہ مسلمانوں میں تبلیغ و اصلاح کے نام پر کئی جماعتیں بن گئیں حنفی، وہابی، مقلد، غیر مقلد، اہل حدیث وغیرہ۔ سید صاحب کے بعد علمائے دیوبند اور اہل حدیث نے ان کے کام کو جاری رکھا۔ ان دونوں جماعتوں سے سرسید اور ان کے رفقاء دانستہ متنفر تھے اور ان کے مذہبی خیالات و عقائد کی بنیاد انہیں جماعتوں کے اصول و عقائد پر تھی۔

ایک طرف یہ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا نعرہ لگانے والے علمائے دین کی با عمل جماعت تھی جو عامۃ المسلمین میں جذبۂ عمل پیدا کر کے ان کو اسلام کے عظیم مقصد پر چلنے کی ترغیب دے رہی تھی دوسری طرف فقراء و صوفیاء کا گروہ ترک دنیا کی تعلیم دے رہا تھا۔ صاحب نوح کوثر لکھتے ہیں :-

"جب کسی قوم پر دور انحطاط آتا ہے، اس وقت یہ دونوں ہی مصلح قوم رہ جاتے ہیں، جو اس قوم کے کھوئے ہوئے وجد کے تخیل اور شوق گزار رہتے ہیں قوم کو پھر اسلاف کی طرف سے جانے کی دعوت دیتے ہیں اور انحطاط کو انحطاط نہ سمجھنے دیتے، ہندوستان میں یہ دونوں [illegible] سید احمد بریلوی اور سرسید احمد خاں نے قوم کو انحطاط [illegible] بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی انحطاط کے [illegible] ممالک میں فروغ پایا اسی طرح ہندوستان میں بھی [illegible] حاصل کیا اور اس آخری دور میں بھی کئی اولیاء نے شہرت پائی، ان کی [illegible] اور بے ریائتھیں، لیکن کم از کم عوام پر ان کی تعلیم کا یہی اثر ہوتا تھا کہ وہ دنیا کو ایک سراب سمجھ کر اور حاکم و محکوم اور بادشاہ و گدا کا فرق بے معنی خیال کر کے اپنے دل سے احساس زیاں کو بھلا دیتے ہیں اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں[2] :-

---

[1] یادگار غالب، صفحہ ۳۰۔ [2] نوح کوثر، صفحہ ۱۱۔

اس عہد کے باکمال بزرگوں میں خواجہ محمد سلیمان تونسوی (۱۷۷۰-۱۸۴۱) حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (۱۷۹۸-۱۸۹۵) حضرت شاہ غوث علی قلندر پانی پتی (۱۸۰۴-۱۸۸۰) حضرت شاہ سید وارث علی شاہ (۱۸۱۹-۱۹۰۵) کے چشمۂ فیض سے ہندو مسلمان دونوں سیراب ہوتے تھے، اور آج بھی ان کے فیوض روحانی سے سب برابر مستفیض ہو رہے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ان کے علاوہ مسلمانوں میں بہت سے خلاف شرع فرقے بھی پیدا ہو گئے، رسول شاہی فرقہ، سدا سہاگن فرقہ، لیکن ان کا عروج صبح کاذب کی طرح تھا، اس قسم کے فرقے یا تو ختم ہو گئے، یا منتشر صورت میں عامیوں اور جاہلوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اس دور میں مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے متعلق سید احتشام حسین لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کے یہاں بھی مذہبی اصلاح کا زور شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی باگ ڈور بالکل دوسرے قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی، یہ لوگ نئی تعلیم سے متاثر نہ تھے ان میں مولانا سید احمد بریلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا کرامت علی جون پوری کے نام ذکر کے قابل ہیں[۵۱]۔"

ہندوؤں میں بھی اصلاحی چشمے اُبل پڑے۔ بدلتے ہوئے حالات نے انھیں بھی متاثر کیا، مگر ان کی حیثیت دوسری تھی ان پر دوسری نوعیت کے اثرات پڑے۔

"نئے حالات نے سب سے پہلے بنگال پر اثر کیا تھا، اس لئے وہاں ایک طرح نشاۃ ثانیہ شروع ہوا، جس کے لیڈر یہی انگریزی تعلیم پائے ہوئے لوگ تھے۔ راجہ رام موہن رائے، مہرشی ٹیگور اور کیشب چندر سین کے نام اس سلسلے میں ضرور آتے ہیں[۵۲]۔"

انگریزی حکومت اور مغربی تعلیم سے متاثر ہو کر یہ نئے حالات پیدا ہوئے تھے، مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی، مگر ہندوؤں نے خیر مقدم کیا اور انگریزی تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اندر اصلاحی جذبہ پیدا ہوا، ان میں ایک جماعت پیدا ہو گئی۔

"رام موہن رائے اس جماعت کے پہلے رہنما تھے اور جس مذہبی اصلاح کا انھوں نے آغاز کیا وہ پہلی اصلاحی تحریک تھی جو مسیحی اثرات اور انگریزی تعلیم کے ذریعہ مغربی خیالات سے جاری ہوئی[۵۳]۔"

رام موہن رائے شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے بارہ سال بعد ۲۴ مئی ۱۷۷۴ء کو برہمن کے ایک اعلیٰ ذات خاندان میں پیدا ہوئے، اپنے آبائی مذہب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور

---

۵۱ و ۵۲ روایت اور بغاوت، صفحہ ۱۴۶-۱۴۷۔

۵۳ اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصہ۔ ڈاکٹر عزیز احمد، صفحہ ۱۵۲۔

سنسکرت میں کمال حاصل کیا۔ وید، ویدانت، اور اپنشد کا مطالعہ بغور کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بت پرستی کے سخت خلاف ہو گئے۔

"ان کی سیرت کی تعمیر میں اسلامی تعلیمات کا گہرا اثر تھا، سولہ برس کی عمر یعنی ۱۷۸۸ء میں انھوں نے فارسی میں ایک رسالہ "تحفۃ الموحدین" لکھا جس کا دیباچہ عربی میں تھا۔"[1]

ان کے والد نے جب اس رسالہ کو دیکھا تو بہت خفا ہوئے، یہاں تک کہ رام موہن رائے کو گھر چھوڑنا پڑا، مگر تلاشِ حق کا جذبہ کم ہونے کے بجائے اور زیادہ ہوتا گیا، اور اس مخالفت نے ان کی طبیعت پر تازیانہ کا کام کیا۔ حقیقت کی تلاش میں وہ بنارس اور تبت گئے، برہمنوں اور بدھ مذہب کے بھکشوؤں سے مناظرے کئے، ہر مذہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے لئے انھیں مختلف زبانیں سیکھنی پڑیں۔

"انھوں نے دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی مقدس کتابوں کی زبانیں سیکھنے کی امکانی کوشش کی، انھوں نے وید کو سنسکرت زبان میں پڑھا اور بدھ کی مقدس کتاب ترپٹک کا پالی زبان میں مطالعہ کیا۔ عربی زبان پر بھی اتنا عبور حاصل کر لیا تھا کہ قرآن مجید سمجھ سکتے تھے پھر اپنی زندگی کے پچھلے دور میں عبرانی زبان بھی سیکھی تاکہ توریت کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکیں اور آخر میں انجیل سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے لئے انھوں نے یونانی زبان بھی سیکھنی شروع کر دی تھی۔"[2]

اس طرح راجہ رام موہن رائے، فارسی، عربی، سنسکرت، پالی، عبرانی، یونانی، انگریزی، ہندی، اردو اور بنگالی زبانوں کے علاوہ دوسری مقامی بولیاں جانتے تھے۔

۱۸۱۵ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے تحفۃ الموحدین کو پہلی بار مرشد آباد سے شائع کیا۔ اسی موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسالے اور بعض اپنشدوں کے ترجمے بھی شائع کئے۔ ان کی یہ کوششیں برابر جاری رہیں۔ ۱۸۱۵ء میں ایک انجمن آتمہ سبھا (روحانی سوسائٹی) قائم کی، جس کے ممبر زیادہ تر ان کے ہم عقیدہ تھے۔ ۱۸۲۸ء میں توحید پرستوں کی پہلی انجمن کی بنا کلکتے میں ڈالی گئی اور

"تقریباً دو سال بعد خدا پرست ہندوؤں کی پہلی مذہبی انجمن کا باضابطہ افتتاح ۲۳ جنوری ۱۸۳۰ء کو ہوا، رام موہن رائے نے اس مذہبی جماعت کا نام برہمو سماج رکھا۔"[3]

---

[1] ہندوستانی اخبار نویسی (اردو) صفحہ ۱۲۷۔

[2] بنگال کی مذہبی تحریکیں اور اسلام کے علاوہ صفحہ ۱۵۲

[3] ہندوستانی اخبار نویسی صفحہ ۱۲۷

Marfat.com

اسی سال سنہ ۱۸۳۰ء میں شہنشاہ دہلی کی طرف سے وہ انگلستان بھیجے گئے اور وہیں ستمبر سنہ ۱۸۳۳ء
ان کا انتقال ہوگیا، ان کے بعد برہمو سماج میں کمزوری آتی گئی۔ تقریباً سنہ ۱۸۴۱ء میں مہرشی دیوندر
ٹیگور برہمو سماج میں داخل ہوئے اور اس کو از سر نو منظم کیا۔ اس سے پہلے سنہ ۱۸۳۹ء میں انھوں
ایک انجمن تتوا بودھنی سبھا، قائم کی اور تتوا بودھنی پتر کا نکالا، جس کے ایڈیٹر اکھے کمار دت تھے
جو ہندو مذہب کی اصلاح چاہتے تھے، اسے ترک کر دینے پر راضی نہ تھے، ایک خدا کی پرستش
زور دیتے تھے، لیکن پرستش کا طریقہ خود انسان کی اپنی مرضی کے بموجب ہوتا وہ فرماتے تھے:۔

"میری خواہش ہے کہ تمام انسان ..... برہم کی پرستش کریں اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ
جو لوگ گایتری کی مدد سے پرستش کر سکتے ہیں وہ اسی طرح کرتے رہیں لیکن جو یہ نہیں کر سکتے ان کو
اس امر کی آزادی ہے کہ وہ کوئی آسان طریقہ اختیار کر لیں، جس کے مطابق وہ خدا کے گیان
میں مگن ہو سکیں۔"[1]

مہرشی دیوندر ناتھ نے سماج کی فلاح، بقا اور استواری کے لئے کافی غور و خوض کے بعد ایک عہد نامہ
ساتھ دفعات پر مشتمل سنہ ۱۸۵۰ء میں مرتب کیا، اور اس کا نام آدی برہمو سماج رکھا۔ سنہ ۱۸۵۰ء تک
متعدد انجمنیں قائم ہو گئیں۔ دیوندر ناتھ ٹیگور کی میانہ روی پالیسی کو نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ناپسند کرتا
تھا، اس گروہ کے سرخیل کیشب چندر سین تھے جو سنہ ۱۸۵۸ء میں برہمو سماج میں داخل ہوئے تھے
بعض اہم بنیادی باتوں پر اختلاف ہونے کی وجہ سے آخر کار فروری سنہ ۱۸۶۵ء میں کیشب چندر سین
مع اپنے نوجوان رفقاء کے آدی برہمو سماج سے علیحدہ ہو کر ایک نئی انجمن ہندوستان کی برہمو سماج
قائم کی، اس انجمن نے یہ دعوے کیا کہ اس نے برہمنیت سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں کیشب چندر انگلستان گئے اور واپس آ کر معاشرتی اصلاح کی طرف توجہ کی۔
خصوصاً عورتوں کی اصلاح، مردوں اور عورتوں کی تعلیمی ترقی، شراب خوری کا انسداد، اور
اہل ہند کی عام معاشرتی اصلاح پر زور دیا، جس کے لئے ۲ر نومبر سنہ ۱۸۷۰ء کو ایک سوسائٹی انڈین
ریفارم ایسوسی ایشن، قائم کی، اس انجمن کے تحت سنہ ۱۸۷۱ء میں بالغوں کا اسکول اور عورتوں کیلئے
نارمل [illegible] ہو دونوں انجمنیں ساتھ ساتھ کام کرتی رہیں لیکن جدا ہو گیا [illegible]
[illegible] اور [illegible] بنیاد پر قائم کی گئی، اس نئی برہم سماج کے صدر
[illegible] جو [illegible] لکھتے ہیں:۔

"سنہ ۱۸۷۸ء کی مذہبی پھوٹ سے سادھارن برہمو سماج پیدا ہوئی، اس وقت برہمو سماج کے
[illegible] تھے جن کا تعلق [illegible] جماعت یا آدی سماج [illegible] مجلس عام یا سادھارن جماعت

---

[1] [illegible] سنہ ۱۸۷۲ء بحوالہ اسلام کے خلاف ..... کا شمہ سنہ ۱۸۵۸

Marfat.com

۳۔ جدید عقیدہ..... سماج کا زیادہ اثر موجودہ زمانے میں [illegible]

بنگال کے باہر بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں برہمو سماج کی تحریک کو فروغ ہوا۔ پنجاب میں لاہور میں کافی زور تھا۔ یو۔ پی اور اس کے ملحق صوبوں میں بھی برہمو سماج کے ماننے والے ملتے ہیں۔ برہمو سماج کے عقائد اور اصول پر اسلام کے عقائد کی چھاپ پائی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے دلوں پر یہ تحریک اثر انداز ہوتی رہی اور وحدانیت پرستی کا عقیدہ ہندوؤں میں [illegible] مختلف اصلاحی اور مذہبی تحریکوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ برہمو سماج کے بعد [illegible] فرقہ آریہ سماج ہے جس کے بانی سوامی دیانند سرسوتی ہیں۔ [illegible] یعنی ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور آریہ سماج کی بنیاد [illegible] وقت حالی لاہور میں تھے لیکن وہ اس تحریک کے عقائد اور خیالات سے [illegible] سوامی جی اپنی تبلیغی سیاحت کے زمانے میں ہندوستان کے [illegible]

"برہمو سماج کے نمائندے دیوندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر سین، تھیوسوفیکل سوسائٹی کی مسز بلاوٹسکی اور کرنل اسکاٹ، پرارتھنا سماج کے بانی رہنما آتھرام پانڈورنگ اور مسلمانوں کے مصلح سید احمد خاں اور عیسائیوں کے سب سے بڑے مبلغ ڈاکٹر جان ولسن، ڈبلیو ہیسٹی وغیرہ سے ملاقاتیں کیں[۵۱]"

عیسائی مبلغین اور پادریوں کے جذبۂ عمل و اخلاص میں انگریز کی حکومت کی حمایت اور سرپرستی شامل تھی اس لئے ان کے اثرات عام ہندوستانیوں پر برابر بڑھتے جا رہے تھے۔ مسلمان بھی ان کے پنجۂ جبر کی گرفت میں آتے گئے۔ انگریز مشنریوں کی باقاعدہ [illegible] پنجاب، بمبئی، مدراس، یو۔ پی، بہار، غرض [illegible] ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں [illegible] مسائل میں بھی انھوں نے پُرفریب سیاست [illegible] ہونے لگے۔ پادریوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لئے کتابیں پرارد و زبان میں ہوتے تھے۔

"مسیحی پادریوں کا کارنامہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں [illegible] اشاعت کے لئے اردو زبان کو آلۂ کار بنایا۔ انجیل [illegible] اردو ترجمہ کرنے کی کوشش کی[۵۲]"

---

۵۱ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ عبداللہ و سلف ص ۱۶۲

۵۲ اسلام کے علاوہ مذاہب کی تبلیغ میں اردو کا حصہ۔ ص ۱۸۔

۵۳ مذہب و تمدن [illegible]

Marfat.com

پادریوں کے اعتراضات کے جواب سے مسلمان علماء ترکی بہ ترکی دیتے تھے، مناظرہ کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور دیگر علماء کا نام اس سلسلہ میں کافی مشہور ہے، خود مولانا حالی نے پادری عماد الدین کی کتاب کا جواب دیا ہے۔ غرض انگریزوں کے آنے کی وجہ سے اور ان کی سلسلہ حکومت کی وجہ سے ہندوستان میں مذہبی انقلاب ہوا، اور ہندوستان کے تمام مذاہب کے ماننے والے اس سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور ہوئے۔ شری بی این لونیا، اپنی کتاب ایولوشن آف انڈین کلچر میں ہندوستانی مذہب فلسفہ اور مغربی تہذیب کے تحت لکھتے ہیں:۔

"مغربی تعلیم نے ہمارے مذہبی عقائد میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں، توہمات کا خاتمہ کیا۔ مذہبی تنگ نظری، آزاد خیالی سے بدلی، شاستروں کی دیوتا کو ماننے کی روایت کو پرکھا جانے لگا۔ مغربی مادیت کی روشنی میں مذہب کو پرکھا جانے لگا، قدیم دقیانوسی عقائد، عادات و خصائل، اور روایات کو فطری اور تنقیدی نظریہ جانچا گیا..... ہندو مذہب توہمات کا مجموعہ ثابت ہوا، اس لئے بہت سے ہندو دائرہ عیسائی ہونا شروع کیا..... مذہب کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک طبقہ پیدا ہوگیا، مذہبی مصلح اور بزرگ (سینٹ) جیسے راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، شری نارائن گورو، نارائن گورو وغیرہ اور دوسرے اکابرین نے ہندوستان میں عیسائی مذہب کی توسیع کو روکا۔

ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ سے متاثر ہوا، اس نے مغرب سے اپنے فلسفہ میں آئیڈیالزم، اور میٹریالزم، کو داخل کیا اس کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقے میں اعلیٰ درجہ کا ذہن اور شعور پیدا ہوگیا[1]"

آگے چل کر لونیا صاحب لکھتے ہیں:۔

"ان تحریکوں کی وجہ سے سیکڑوں مذہبی روایات کا قلعہ منہدم ہوگیا اور سماج سدھار کے لیے اجتماعی حیثیت سے جدوجہد جاری ہوگئی، ہندوؤں کے اندر سے ذات پات، ستی کی رسم، پردہ، بچپن کی شادی، چھوت چھات وغیرہ تمام خرابیاں رفتہ رفتہ دور ہونے لگیں ان کے بجائے بیوہ کی شادی، عورتوں کی تعلیم اور ترقی نسواں میں انتھک کوششوں کو سراہا گیا[1]"

---

[1] اقتباس از ایولوشن آف انڈین کلچر، صفحہ ۵۹۵-۵۹۶، ۶۵۰

Evolution of the Indian Culture Page 595-596-650

Marfat.com

برہمو سماج اور آریہ سماج کے علاوہ اور بھی متعدد اصلاحی تحریکیں ہندوؤں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں پیدا ہوئیں، ان میں [illegible] کے بانی سوامی رام کرشنا پرم ہنسا (۱۸۸۶-۱۸۳۴) تھے، کافی مشہور ہے۔ شری سوامی دیانند جی (۱۸۷۸-۱۸۲۴) نے رادھا سوامی ست سنگ، جاری کیا جس نے ہندوؤں میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کی جس کی زندہ یادگار دیال باغ، آگرہ ہے۔

ان تمام مذہبی اور اصلاحی تحریکوں سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے نصف اول تک ہندوستان کے دلوں میں [illegible] اور فلاح کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور ہر دور میں ملک نے قوم کی دینی و دنیوی بھلائی اپنے اپنے نہج پر پیش کیا۔ [illegible] زیادہ تر مذہبی تحریکیں زیادہ تر شمالی ہندوستان ہی میں اٹھیں، دہلی اور بنگال کو مرکزی حیثیت حاصل رہی لیکن بہار، یوپی، پنجاب، بمبئی، مدراس بھی ان کے اثرات سے خالی نہیں رہے۔ یوپی میں ہر مذہبی تحریک نے قدم جمائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان ہی مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کا مرکز کیوں رہا؟ دہلی اور بنگال کو اولیت کا شرف کیوں حاصل ہوا؟ کیا اس کا سبب مسلمان حکمرانوں کا زوال اور انگریزوں کا عروج تھا؟ یا مغربی تعلیم و تہذیب سے رفتہ رفتہ جو ذہنی انقلاب رونما ہو رہا تھا، وہ ان تحریکوں کا سبب بنا؟ مورخین میں کسی قدر اختلاف ہے، لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ یہ تمام اصلاحی، مذہبی، یا مذہبی و سماجی تحریکیں، حساس، باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ کے جذبۂ عمل کی مرہون منت ہیں۔ [illegible] سے آنے والے انقلاب کی آواز سن لی تھی۔ [illegible] وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مغربی قوموں، انگریزوں کے اقتدار کا [illegible] ہندوستان کو [illegible] رہا سہا اختیار بھی ختم ہو جائے گا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں تھیں جن کو [illegible] ردِ عمل کیا، ملک کے اندر [illegible] بیداری پیدا کرنے کا عزم بالجزم کیا اور [illegible] کو اپنا مذہب دل و جان سے عزیز تھا، اس کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار تھا۔ مذہب کی اصلاح سے ہر قسم کی اصلاح ممکن تھی کیونکہ مذہب کے دائرے کے اندر تمام وسعتیں سما سکتی ہیں اور اسی سے [illegible] کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، تقدیر کا عقیدہ، توہم پرستی اور [illegible] تھا۔

ان تحریکوں نے تبلیغ و اشاعت کے لئے کتابیں، [illegible] اور اخبارات نکالے، جو

سلہ: مذہبی لٹریچر کی تفصیلات، اصلاح کے عقائد و مذاہب کی [illegible] اور [illegible] پر وفیسر [illegible] کی خطبات و مقالات، مذہب و شاعری، ہندوستانی اخبار نویسی، [illegible] وغیرہ میں موجود ہیں، جن سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام تحریکیں [illegible] کی وجہ سے مقبول عام ہوئیں

زیادہ تر اُردو میں شائع ہوئے۔ مسلمانوں کے علاوہ برہمو سماج، آریہ سماج، عیسائیوں اور پادریوں سب نے اپنے مذہب کی اشاعت کا ذریعہ اُردو ہی قرار دیا۔ اس لئے قدرتی طور پر اُردو داں طبقہ، دوسرے تمام لوگوں کے مقابلہ میں جملہ مذاہب کے عقائد اور اصولوں سے زیادہ باخبر ہوا اور اس میں ہر مذہب کے ماننے والے ہو گئے

علمی و ادبی پس منظر

مولانا حالی یادگار غالب کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"تیرھویں صدی ہجری (مطابق اٹھارھویں انیسویں صدی عیسوی) جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجہ غایت کو پہونچ چکا تھا اور ان کی دولت و حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دارالخلافت دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے جہانگیری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے۔ اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں ؎

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — یاد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ — حسرتی دا شرفی زآذر و ہوا عظم شاں[1]

غالب مرحوم کے اُردو اور فارسی خطوط، نیز ان کے کلام میں اس زمانے کے مشاہیر اور اکابر کا ذکر موجود ہے، اس کے علاوہ دوسری علمی و ادبی، سوانحی و تاریخی کتابوں میں بھی ارباب کمال کا تذکرہ ملتا ہے جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر سے انیسویں صدی کے نصف اوسط تک دہلی میں بلند پایہ دیگانہ روزگار مصلح و معلم، مفکر و فلسفی، مدبر و مقنن، مورخ و محقق، شاعر و ادیب، حکیم و طبیب موجود تھے۔ تنزل پذیر سلطنت دہلی کی یہ خزاں بھی، اس عہد کی ترقی یافتہ سلطنتوں کی بہاروں سے بدرجہا بہتر تھی، اسی لیے تو میر نے کہا ہے ؎

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اور حالی نے اس کی تصدیق کی ؎

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

جب یہ زمانہ کا انقلاب شہر اُجڑ گیا، اور میر لکھنؤ آنے پر مجبور ہوئے تو ان کے دل پر جو بیتی اُس کا

---

[1] تیرھویں صدی ہجری ۱۲ اکتوبر ۱۷۹۷ء سے شروع ہوئی اور ۱۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو ختم ہوئی (تقویم تاریخی عیسوی ص ۲۰۰)
[2] یادگار غالب، صفحہ ۱۔

Marfat.com

اندازہ کون کر سکتا ہے؟ مزید ستم یہ ہوا کہ پورب کے ساکنوں نے ان کی وضع قطع اور پریشاں حالی پر ہنسنا شروع کیا۔ میر برداشت نہ کر سکے اور کہا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

لیکن یہ دیار اُجڑ جانے پر بھی مخزن سخنوران کامل تھا، اس کا ذرہ ذرہ گوہر یکتا تھا۔ رجحان طبع تو سیع سلطنت کے بجائے، توسیع ادب کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ وہ صلاحیتیں اور قوتیں جو ملکی حکومت کی ترقی اور استحکام میں صرف ہوتی تھیں، اب اقلیم شعر و ادب کی بقا میں مصروف ہو گئیں، علم و ادب کا شیریں چشمہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ جاری تھا اور گلستان سخن کو سرسبز و شاداب کر رہا تھا۔ شعر و شاعری کا چرچا گلی گلی تھا، بچہ بچہ علم کا شیدائی تھا، چنانچہ :-

"شعرا اس کثرت سے پیدا ہو گئے اور شعر و شاعری کا چرچا اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ استادان فن نے تذکرے لکھنے شروع کر دیے۔ ابتدا میر تقی میر نے کی اور اس کے بعد متعدد تذکرے لکھے گئے جس میں گردیزی، قائم، میر حسن، مصحفی، قدرت اللہ قاسم کے تذکرے بہت اہم ہیں جن سے اس عہد کی تاریخ بآسانی مرتب کی جا سکتی ہے"[1]

اس عہد اور اس کے بعد شعر و شاعری کے متعلق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی تحریر فرماتے ہیں :-

"تیسرا دور میر و مرزا کا ہے جس میں ایہام گوئی متروک قرار دی گئی۔ فارسی کی طرح اس میں بھی مشاعروں کا تانتا بندھ گیا۔ فارسی زبان کا اثر زائل ہوا ..... نئے نئے محاورے اور مضامین فارسی سے لیے اور وضع کیے گئے۔ شعرا کی تعداد بڑھ گئی، تذکرے لکھے گئے۔ ضخیم دیوان تیار ہوئے۔ اردو میں اب تک زیادہ تر غزل مقبول تھی۔ قصیدہ، ہجو، مثنوی، مرثیہ، مسدس سخن پر طبع آزمائی کی گئی۔ اس دور کو ہم تقریباً ۱۷۳۰ء / ۱۱۵ھ سے میر کی وفات تک ۱۸۰۰ء / ۱۲۱۵ھ تک قرار دے سکتے ہیں"[2]

اس کے بعد چوتھے دور میں جو ۱۷۹۰ء / ۱۱۹۵ھ سے ۱۸۲۴-۲۵ء / ۱۲۴۰ھ تک ہے

"شعرا نے قدیم انداز، مضامین، زبان و کلام کے نئے انداز پیدا کیے۔ فارسی کی جگہ اردو زبان انشا اور تخلیق کا ذریعہ بنی"[3]

پانچویں دور میں جو ۱۸۲۴-۲۵ء / ۱۲۴۰ھ سے ۱۸۶۹-۶۹ء / ۱۲۸۵ھ غالب کی وفات تک ہے۔

---

[1] دلی کا دبستان شاعری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، صفحہ ۹۰۔
[2] و [3] ایضاً صفحہ ۵۰-۵۹۔

Marfat.com

"زبان نے ایک معین شکل اختیار کر لی۔ شعراء کے دو گروہ ہو گئے ہیں، ایک تو شاہ نصیر، ذوق اور ظفر کا جو زبان دانی اور زبان سازی پر زیادہ زور دیتا ہے اور ایک حد تک لکھنؤ سے متاثر ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ مومن، غالب اور آزاد کے مقلدین کا ہے جو معنی کو صورت پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنی اپنی انفرادیت الگ قائم کرنا چاہتے ہیں[۱]"

چھٹا دور (۱۸۶۲ء/۱۲۷۸ھ سے ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ تک) ہے۔ یہ دہلویت کا آخری دور ہے، اس دور

"ذوق یا غالب یا مومن کے شاگرد ہیں، ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں البتہ کلام میں صفائی بہت زیادہ ہے۔ داغ نے ضرورت بانکپن پیدا کر کے اپنی ایک الگ راہ نکالی اور حالی نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی[۲]"

دہلی کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے مقامات پر بھی علم و ادب اور شعر و شاعری کا چرچا تھا، تمام مقامات ارباب فضل و کمال کا مخزن تھے۔ ان میں حسب ذیل کافی مشہور ہیں:-

لکھنؤ۔ دلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد ہوا۔ دلی میں اندرونی و بیرونی حملوں کی وجہ سے امن غارت ہو چکا تھا، کسی کی بھی جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہیں تھی، اہل کمال پریشان حال تھے، رفتہ رفتہ سب ایک ایک کر کے مادر وطن کی آغوش سے جدا ہونے پر مجبور ہوئے۔ سودا، مصحفی، انشاء، جرأت وغیرہ سب لکھنؤ چلے آئے۔ اودھ کے نواب علم و فضل کے قدردان تھے، اور دہلی کے شہزادے سلیمان شکوہ وغیرہ بھی یہاں آ کے بس گئے تھے، اس لئے یہاں جہاں آ جیسی دلی رونق اور چہل پہل دن رات رہنے لگی۔ لکھنؤ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے نہ صرف پریشان حال باکمالوں کو پناہ دی، بلکہ ان کو قدر و عزت کی مسند پر بٹھایا۔ ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور آہستہ آہستہ ان کا دل ایسا موہ لیا کہ وہ اپنی وطنی خصوصیات اور فطری آن بان کو بھول گئے، اور ہمیشہ کے لئے لکھنؤ کے ہو رہے اور رنگ دہلی پر لکھنؤ کا رنگ غالب ہو گیا، چنانچہ

"جرأت، انشاء، مصحفی اور رنگین کی شاعری کی ابتدا دہلی سے ہوئی، مگر ان سب کا عروج لکھنؤ ہی میں ہوا۔ ان کے اثر سے لکھنؤ میں شاعری کا ایک نیا دبستان ناسخ اور آتش سے شروع ہوا۔ ان لوگوں نے زبان کی اصلاح کی، محاورے کو درست کیا، نئی بندشیں اور ترکیبیں ایجاد کیں اور زبان و بیان میں لطافت و نزاکت پیدا کی۔ مضامین میں ایجاد سے کام لیا اور شاعری کو نیا آب و رنگ بخشا[۳]"

---

[۱] و [۲] دلی کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ صفحہ ۸۸۔

[۳] لکھنؤ کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، صفحہ ۲۵۔

Marfat.com

غرض دہلی کا حسن سادہ، لکھنؤ کے حسن رنگیں سے مل کر حسن و جمال، رعنائی و زیبائی اور رنگینی و دلکشی کا ایک نیا پیکر بن گیا۔

اک سادہ ورق تھی مرے جذبات کی دنیا رنگیں ہوئی رنگین نگاہوں کے اثر سے

جذبات کی رنگینی کا اظہار، الفاظ کی شکل میں ہوا، اور یہیں سے لکھنؤ اسکول اپنی تمام عشوہ طرازیوں اور رعنائیوں کے ساتھ، دنیائے شعر و ادب پر چھا گیا۔ اس کی شیریں سخنی اور شیریں زبانی بلا شرکت غیرے اقلیم دل کی مالک بنتی گئی۔ دلجوئی اور دلداری کی ہوس اتنی زیادہ بڑھتی گئی کہ ریختہ سے ریختی ایجاد ہوئی تاکہ صنف نازک کی زبان میں گفتگو کی جائے اور امتیاز من و تو ختم ہو۔ نطق مردانگی نے نسوانی زبان اختیار کر لی، ۱۸۵۶ء میں یہ رہی سہی محفل ادب بھی سونی ہو گئی۔ واجد علی شاہ اختر مٹیا برج بھیج دیے گئے۔ لکھنؤ اجڑ گیا، اس کے بجائے مٹیا برج آباد ہوا، اور وہ رونق بزم سخنوراں بن گیا۔ تاہم لکھنؤ کی خزاں بھی گلشن بداماں تھی اور یہاں کسی نہ کسی حیثیت سے ارباب کمال، اپنی شمع ادب جلاتے رہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نیز ان کے تلامذہ کے دم سے لکھنؤ شعر و ادب کا مرکز بنا رہا۔

لکھنؤ کے بعد علم و ادب کا تیسرا مرکز رام پور تھا، دلی سے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں بھی باکمالوں کا مجمع لگا رہتا تھا، چونکہ

"فرمانروایان ریاست خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعراء کے قدردان تھے اور شعراء کی تحسین و جگر کاوی کے بدلے ہمیشہ ان کو بیش بہا انعامات دیتے تھے۔ [illegible] کرتے رہتے تھے۔" اور

"وہ علماء و ادباء اور شعراء کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ دوست کی طرح برتاؤ کرتے تھے اور آخر ان کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے۔"[1]

اس لئے دربار رام پور میں ہر قسم کے اہل علم و فضل کا مجمع رہتا تھا جو غالب کے شاگرد تھے۔ برسر علم و ادب نواز تھے۔ ان کی [illegible] لکھنؤ کے شعراء [illegible] جمع ہو گئے تھے جن کی بدولت اردو شاعری میں ایک نئے طرز [illegible]

"نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع [illegible] کیا۔"[2]

[illegible] نواب صاحب کے زمانہ میں ہر طرز کو خاص مقبولیت حاصل تھی۔ نواب وسواس کا تخلص

---

[1] تاریخ ادب اردو ڈاکٹر [illegible] صفحہ ۱۰۰۔

[2] [illegible] صفحہ ۳۵۳ - ۳۵۴

"ادبی حیثیت سے رام پور کا زرّیں عہد کہا جا سکتا ہے" کیونکہ

"اس وقت کے بہتر سے بہتر حکمار کاش نشار، شعرار، خوش نویس یہاں تک کہ ہر ایک حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال موجود تھے"[۱]

دہلی، لکھنؤ اور رام پور کی طرح عظیم آباد (پٹنہ) بھی گہوارۂ شعر و سخن رہا ہے، اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں بہار نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بڑھ چڑھ کر اس لیے کہ اس صوبہ میں اردو کو دلی اور لکھنؤ جیسی سرپرستی نصیب نہیں ہوئی اور نہ اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اردو اس کی آغوش میں پروان چڑھی، وہ تمام خصوصیات اور مراعات جو دلی اور لکھنؤ میں اردو کو حاصل تھیں بہار میں نہیں ملیں۔ باوجود ان تمام دشواریوں کے بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقار خاطر خواہ ہوا، اس کی ایک وجہ تو اردو زبان کی خود اپنی صلاحیت اور رنگا رنگی ہے، اور دوسری راجہ شتاب رائے شتاب کی اردو ادب نوازی اور سرپرستی ہے، راجہ خود شاعر تھا اور شعرار و ادبار کا قدر دان۔ بنگال کی نوابی ختم ہونے کے بعد راجہ کا دربار بھی باکمالوں کی پناہ گاہ بن گیا تھا، پھر

"انگریزوں کی عملداری کے بعد جو دور آیا اس میں زبان اردو کو بہار میں بڑی عمومیت حاصل ہوئی"[۲]

قاضی عبدالودود صاحب بہار کی اردو شاعری پر لکھتے ہیں :-

"۱۱۷۰ھ سے ۱۲۷۰ھ تک کا زمانہ، اس صوبہ کی اردو شاعری کا عہد زرّیں ہے، اس زمانہ میں یہاں کے تمام اساتذہ دہلی کے مقلد رہے"[۳]

سید سلیمان ندوی نقوش سلیمانی میں صفیر بلگرامی کے اس قول کی تصدیق کی ہے کہ

"عظیم آباد دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو کا تیسرا مرکز ہے"[۴]

خود سید صاحب کے الفاظ یہ ہیں :-

"صفیر بلگرامی نے جو یہ تذکرہ (طلوع خضر) لکھا ہے غلط نہیں لکھا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد یہ تیسرا اردو کا مرکز ہے"[۵]

عظیم آباد اسکول نے اردو ادب میں دلی اور لکھنؤ کے مذاق و رنگ کا امتزاج پیش کیا۔

---

[۱] تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، صفحہ ۳۵۳-۳۵۴۔

[۲] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقار، ص ۱۰۰، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۷ء۔

[۳] بہار کی اردو شاعری، ڈاکٹر سید حسن عسکری کے نام عبدالودود کا خط مورخہ ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۹۶-۱۹۷۔

[۴] نقوش سلیمانی (مجلوۂ خضر) صفحہ ۱۸۷۔

Marfat.com

"عام طور پر دلی اور پٹنہ کے میلان شعر و ادب میں مماثلت پائی جاتی ہے، اواخر انیسویں صدی میں دبستان لکھنؤ کا اثر یہاں پر پڑا ہے اور ہر ایک طبقۂ شعراء کا میلان اسی جانب ہو گیا۔"[1]

ان اقتباسات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بہار میں اُردو کا عہد زرّیں ۱۷۵۷ء سے شروع ہو گیا تھا اور ۱۸۵۷ء تک عظیم آباد کے شاعر دہلی کے مقلد رہے، انیسویں صدی کے اختتام تک کچھ عرصہ تک دہلی اسکول کا اثر رہا، اس کے بعد لکھنؤ کے اثرات پڑنے لگے، دونوں کے اثرات سے ایک نیا رنگ شاعری نمودار ہوا، جس نے اُردو کی اہم خدمت انجام دی۔

عظیم آباد یا بہار میں اُردو کو مقبولیت، اور کسی حد تک مرکزیت بنگال کی نوابی کے خاتمے کے بعد حاصل ہوئی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ بہار، بنگال سے بڑھ گیا اور دہلی و لکھنؤ کے بعد اس کا شمار کیا جانے لگا، لیکن اس میں کبھی کوئی شک نہیں ہے کہ بنگال میں بھی اُردو کی ترویج و اشاعت ان تمام مقامات سے کم نہیں ہوئی صاحب پنجاب اُردو نے اسے لکھنؤ کے بعد تحریر فرمایا ہے۔

"اُردو کا آخری لیکن سب سے زبردست اور شاندار مرکز دہلی ہے جو دلی اور لکھنؤ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے؛ اور کچھ عرصہ کے بعد دہلی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے [illegible]"

بنگال میں کلکتہ، مرشد آباد، ڈھاکہ کسی نہ کسی حیثیت سے اُردو کے مرکز بن گئے [illegible] پے در پے سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں۔ نواب مرشد آباد کی ادب نواز [illegible] اُردو زبان و ادب کا مرکز بن چکا تھا۔

"نواب سید محمد آزاد، عبدالغفور خاں نساخ اور آقا احمد علی اصفہانی جیسے ارباب ذوق، اور خواجگان ڈھاکہ جیسے مرزا ان شعر و ادب تو یہاں پہلے سے موجود ہی تھے [illegible] دہلوی اور میانظار اکرام احمد فیضم جیسے اساتذہ نے یہاں پہنچ کر ڈھاکہ کی ادبی محفلوں کی رونق اور بڑھا دی۔ گھر گھر شعر و ادب کا ذوق عام ہو گیا۔ ڈھاکہ کو اُردو کا ایک مرکز سمجھا جانے لگا۔"[2]

جب بنگال کی رہی سہی نوابی بھی ختم ہو گئی اور انگریزی دور حکومت آیا تو اردو کو بھی [illegible] حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۷ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ ڈاکٹر ہارنلی [illegible] سوجھ بوجھ اور ادبی وسیع النظری نے اُردو کی سرپرستی کی اور اس [illegible] زبان کی ترقی کے لیے اُردو اور ہندی کے اساتذہ سے کتابوں کی ترتیب کرائی۔ اس طرح زبان کو یہ شرف

---

[1] بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء۔ اختر اورینوی صفحہ ۱۰۔

[2] پنجاب میں اُردو۔ حافظ محمود خاں شیرانی۔ صفحہ ۱۲۔

[3] مشرقی بنگال میں اُردو۔ سید اقبال عظیم ایم اے، صفحہ ۲۲-۲۳۔

حاصل یہ ہے کہ اُردو نثر کی آسان کتابیں وہیں لکھی گئیں، جن کی مقبولیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہے اس سلسلہ میں میر امّن دہلوی کی باغ و بہار، کا نام کافی ہے۔ فورٹ ولیم کالج اُردو نثر کا سنگ میل ہے، بقول ڈاکٹر عبدالحق

"اس کالج نے اُردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کیے۔ ایک تو روزمرہ کی زبان کو صفائی اور فصاحت کے ساتھ لکھنا سکھایا۔ دوسرے اس زمانے کے لحاظ سے علمی اور مذہبی کتابیں جدید طرز پر کتابیں لکھنے کی کوشش کی گئی۔"[51]

فورٹ ولیم کالج کی بدولت اُردو ہندی کے مشہور اساتذہ، شعرا اور ادیب کلکتہ میں جمع ہو گئے، شعر و سخن کا چرچا عام ہو گیا۔ ادبی انجمنیں قائم ہونے لگیں، اور جب واجد علی شاہ اختر مرحوم نے ۱۸۵۸ء میں مٹیا برج آباد کیا تو شاہ اودھ کی ساری رونق اور جملہ خصوصیات بھی رفتہ رفتہ بنگال میں سمٹ کر آ گئیں۔ واجد علی شاہ مرحوم کے سبعہ سیارہ (برق، درخشاں، صولت، بہار، عیش وغیرہ) کے دم سے یہاں بھی شعر و ادب کے چشمے اُبل پڑے، اور

"مٹیا برج، معاذ اللہ کلکتہ نہیں، بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا تھا۔"[52]

بنگال میں مرزا قتیل کے تلامذہ کی کثرت تھی، اور جب مرزا غالب نے، مرزا قتیل کی فارسی پر اعتراضات کیے تو ان کی مخالفت سب سے زیادہ انھیں تلامذہ نے کی تھی۔

دہلی سے جنوب مشرق کے اس وسیع زرخیز اور مہذب علاقے میں اُردو کی حکومت تھی، دہلی، لکھنؤ، رام پور، عظیم آباد، کلکتہ، مرشد آباد، اس کے اہم مراکز تھے، ان کے علاوہ دوسرے متعدد مقامات پر اُردو کا بول بالا تھا۔ لیہ، پیلی بھیت، اکبر آباد، فرخ آباد، گوالیار اور ٹانڈہ، بنیع بریلی کے روسا کی اُردو نوازیاں تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گی اور ان مقامات پر شعرا و ادبا نے جو کارنامے انجام دیے وہ زندہ جاوید رہیں گے۔

اسی طرح وسط ہند میں ریاست بھوپال اپنی علمی سرپرستیوں کی وجہ سے مخزن اہل کمال تھی، نواب شاہجہاں بیگم والیہ ریاست، ان کے شوہر نواب صدیق حسن خاں، خود سخنور و سخن سنج تھے اور قدردان علم و ہنر تھے، نواب صدیق حسن خاں مرحوم، زبردست عالم، محدث اور مفسر تھے اور مفتی آزردہ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابیں لکھی ہیں۔ حالی کی پہلی تصنیف نواب صاحب کے ایک مذہبی رسالہ کی تائید میں تھی جس کو مولانا حالی کے استاد نے چاک کر دیا تھا کیونکہ وہ وہابیت کی تائید میں لکھی گئی تھی۔

---

[51] خطبات عبدالحق صفحہ ۳۱، خطبہ صدارت شعبہ اُردو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۷ء جنوری ۱۹۳۷ء

[52] تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، صفحہ ۳۴۵۔

Marfat.com

"نواب شاہجہاں بیگم کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولت تخلص کرتے تھے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوشگو شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔"[1]

بھوپال کے علاوہ ٹونک، منگرول، شاہپور (گوٹلہ)، بہاول پور، الور، جے پور، بھرت پور، پٹیالہ، کپورتھلہ، ریاستیں بھی اردو شعر و ادب کی سرپرست تھیں۔ ان کی وجہ سے ان تمام ریاستوں اور ان کے حلقہ زیر اثر علاقوں میں اردو کا عام رواج ہو گیا تھا انہیں گجرات خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں بکثرت شاعر موجود تھے۔ مجموعہ شعرا یعنی تذکرہ شعرائے گجرات مولفہ قاضی نور الدین حسن خاں رضوی فائق مرحوم (جو [illegible] کے دیباچہ میں مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:—

"تذکرے کے مطالعہ کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ گجرات میں اتنے شاعر تھے اور شعر و سخن کا اس قدر چرچا تھا..... گجرات کے مسلمان اردو کو اپنی قومی زبان سمجھتے تھے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے، اور جہاں تک معلوم ہوا ہے [illegible] کے مسلمانوں میں اس کا عام رواج تھا اور اب بھی یہی حال ہے۔"[2]

دکن دکنی ہونے سے پہلے گجراتی ہی تھے۔

"گجرات کے ساتھ ساتھ دکن بھی اردو کا قدیم مسکن اور مرکز تھا، یہیں سے اردو زبان نے انگریزی اور فرانسیسی کی سائنس کی کتابوں کے ترجمے شروع کئے گئے۔ اردو کا پہلا سیاسی رسالہ نکالنے والے بھی دکن کے تھے۔"[3]

"تذکرہ نویسی میں بھی دکن پیچھے نہیں رہا۔ [illegible] سے [illegible] تک [illegible] تذکرے لکھے گئے۔ خواجہ حمید خاں نے گلشن آزاد [illegible] میں خواجہ حیات اللہ فتحپوری نے اپنا تذکرہ ہیرا انفضل، بیک نے اپنا تذکرہ [illegible] میں خواجہ عنایت اللہ فتحپوری نے اپنا تذکرہ ریاض حسنی لکھا۔ [illegible] میں نواب صمصام الدولہ شجیعی نے اپنا تذکرہ شعرائے دکھنی [illegible] میں اسد علی خاں تمنا نے اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ اس کے بعد [illegible] تک تذکرہ نویسی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دور میں جس کو [illegible] سے [illegible] تک تسلیم کیا گیا ہے۔

"نہ صرف اورنگ آباد علم و فضل [illegible] تھا بلکہ [illegible] حیدرآباد بھی شعر و سخن کے [illegible]

---

[1] تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۰۵

[2] مقدمہ مخزن شعرا یعنی تذکرہ شعرائے [illegible] مولوی عبدالحق صفحہ ۶۔

[3] دکن میں اردو، تیسرا ایڈیشن، نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۱۰

بن گئے تھے، خصوصاً آصف جاہ ثانی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء تا ۱۲۱۲ھ/۱۸۰۳ء کے زمانے میں جب حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دارالسلطنت قرار پایا تو دکن کے اہل کمال حیدرآباد ہی میں جمع ہو گئے۔"[۱]

اس دور میں ہر صنف سخن غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مرثیہ پر طبع آزمائی کی گئی۔ تمام شعرا ولی سے زیادہ متاثر تھے اور جو الفاظ دکن میں استعمال ہوتے تھے وہ شمالی ہند میں بھی مستعمل ہو گئے۔ نثر کی مقفیٰ عبارت موقوف ہوئی۔ اخلاق و تصوف کی طرف لوگ مائل تھے ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء سے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء تک دکن میں اردو کو خوب خوب عروج حاصل ہوا۔ دہلی کے باکمال

"ایک طرف لکھنؤ کا رُخ کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کو سرزمین دکن اپنی قدردانی کی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔"[۲]

اس دور میں مہاراجہ چندولال شاداں کا نام (۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء تا ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء) شعرا اور اہل کمال کی سرپرستی میں زندۂ جاوید رہے گا۔ ان کی ادب نوازی کی وجہ سے دور دراز کے ارباب کمال حیدرآباد آئے۔ شاہ نصیر دہلوی (شیخ ذوق کے استاد) چار مرتبہ آئے اور مہاراجہ کے مجلسی جلسوں میں ہر رات ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی۔ اسی زمانہ میں اردو شاعری کے حسب ذیل شعرا (شیوخ ثلاثہ) تسلیم کئے جاتے تھے۔

"شیخ ناسخ لکھنؤ میں، شیخ حفیظ دکن میں، اور شیخ ذوق دہلی میں۔"[۳]

مہاراجہ کے علاوہ دوسرے امرا و شرفا بھی سخن پرور و سخن سنج تھے۔ شمس الامرا، امیر کبیر ثانی

"انگلستان اور فرانس سے ہر نئی کتاب منگانی شروع کی، اور ان کے مطالب فارسی اور اردو میں منتقل کرائے گئے۔"[۴] اور

"اس دور میں نہ صرف سائنس کی کتابیں ترجمہ ہوئیں، بلکہ ہر فن کی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں، تفسیر، فقہ، تاریخ، فلسفہ، ریاضی، ہیئت وغیرہ ہر قسم کی کتابیں مرتب ہوئی تھیں۔"[۵]

اس طرح نثر کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ آصف جاہ سادس نصیر محبوب علی خاں کے زمانہ میں اردو نوازی ضرب المثل بن گئی تھی، یہی وہ زمانہ ہے جب کہ

"اردو سرکار آصفیہ کے دفاتر کی زبان بنی۔ اطراف ہند کے اساتذہ اردو حیدرآباد آئے مختلف علوم و فنون کی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں، علوم و فنون کے دفتر قائم ہوئے،

---

[۱] و [۳] دکن میں اردو، ڈاکٹر سید محی الدین، نصیر الدین ہاشمی، صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵۔

[۴] " " صفحہ ۲۱۵، ۳۱۷۔

[۵] داستان ادب حیدرآباد، سید محی الدین قادری زور، صفحہ ۱۱۶ مطبوعہ ۱۹۵۱ء

[۶] دکن میں اردو، صفحہ ۴۶۴۔

Marfat.com

اخبارات و رسائل جاری ہوئے، ادبی و علمی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا، ان سب اسباب کی وجہ سے اُردو کو حیدرآباد میں وہ عروج نصیب ہوا جو نہ لکھنؤ میں ہوا تھا نہ دہلی میں۔[۱]"

لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں کے اساتذہ یہاں موجود تھے، داغ اور امیر اور ان کے شاگردوں نے حیدرآباد کو رشک جہان آباد و شام اودھ بنا دیا۔ یہ استحاد تلامذہ، اقلیم سخن کی ترقی، وسعت، اور رنگینی کا باعث ہوا۔ اور چمنستان اُردو میں ایک نئے گل کا اضافہ ہوا، جس کی رنگت اور مہک سے دوا دب معطر ہو گیا۔

حیدرآباد کی اُردو خواندگی نے جنوبی ہند کی دوسری ریاستوں کو بھی متاثر کیا: بنگلور، میسور اور راس کے علاقے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، میسور میں اُردو کا آغاز سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد اُردو کا کارواں بھی منزل منزل آگے بڑھتا رہا۔ صہیب الدین ہاشمی کے الفاظ ہیں۔

"ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد..... اہل بنگلور نے اُردو کی ترویج میں بڑا کام کیا۔ انیسویں اصحاب علم و فضل گزرے ہیں جنھوں نے اُردو کے فروغ میں حصہ لیا اور جد و جہد کی ہے۔[۲]"

انھیں بزرگوں کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جنوبی ہند میں اُردو کا چرچا گھر گھر ہو گیا اور راس کماری تک اُردو کا جھنڈا لہرایا جانے لگا۔ مدراس کا علاقہ اُردو کی نشوونما کے لیے نہایت زرخیز ثابت ہوا۔ جس زمانہ میں حیدرآباد اور میسور میں اُردو کا بول بالا تھا، مدراس میں بھی اُردو کو کافی عروج حاصل ہوا۔

"۱۸۵۵ء تا ۱۹۱۸ء کے دور کی ابتدا میں اُردو کو صوبہ مدراس میں بڑا عروج حاصل ہوا۔[۳]"

جنوبی ہند میں بہ اعتبار مدراس ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلا اُردو اخبار اسی سرزمین سے شائع ہوا۔

"۱۸۵۱ء میں اردو اخبارات اخلاص الاخبار، مظہر الاخبار، مظہر الاخبار، مظہر

رہی ہے، پنجاب سلطنت اسلامی کا ایک صوبہ تھا اور سلطنت کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اردو کو یہاں اسی قدر دخل حاصل تھا جیسا سلطنت کے اور صوبوں میں۔ قدیم زمانہ سے یہ زبان اس صوبہ میں کم و بیش رائج رہی ہے[۵۱]"

اس لئے یہ خیال بالکل غلط ہے کہ :—

"پنجاب پر اردو کا کوئی حق نہیں ہے۔ سکھ گردوں کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور آیا۔ کمپنی کے انگریزی اور ہندوستانی عہدہ داروں نے اس اجنبی زبان کو عدالتوں اور دفاتر میں داخل کر کے رواج دے دیا[۵۲]"

پنجاب کے سرحد کے علاقے براہ راست وہابی تحریک یا سید احمد بریلوی کی تحریک سے متاثر تھے، ان کی زبان اردو تھی۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار اسی زبان میں کیا، اور اپنا لٹریچر، اردو زبان ہی میں پیش کیا۔ اس لئے یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ پنجاب کے عوام اردو زبان سے واقف تھے۔

"پنجاب نے اپنے ادبی تعلقات دہلی اور دکن سے سیاسی مصائب کے باوجود برابر قائم رکھے[۵۳]"

البتہ یہ ضرور ہے کہ پنجاب میں کوئی باقاعدہ ادبی اسکول یا ادارہ قائم نہیں ہو سکا، اس لئے وہاں اردو کو پھلنے پھولنے کے وہ مواقع حاصل نہیں ہو سکے جو راجپوتانہ یا دوسری ریاستوں میں حاصل تھے، چنانچہ

"بارھویں صدی ہجری کی متفرق نظموں میں زیادہ تر صوفیانہ نظمیں داخل ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری میں مذہبی رنگ غالب ہے نثر کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی، صرف وہ کتابیں جنمیں ایک ہزار مسائل ہیں جو ۱۲۸۸ھ کا نوشتہ ہے[۵۴]"

لیکن ۱۸۴۷ء سے قبل لاہور علم و ادب کا مرکز بن چکا تھا، دلی کے خاندان برباد، صاحب کمال حضرات ماسٹر پیارے لال آشوب، پنڈت شو نرائن بھوپل، مولوی کریم الدین وغیرہ یہاں آ چکے تھے، ان کے بعد مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۶۴ء میں پہونچے، ان کے آتے ہی لاہور دہلی کا ایک حصہ بن گیا، میجر فلرٹ یا ہے اردو فارسی کی درسی کتابیں لکھیں، کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن، انجمن پنجاب کے نام سے قائم کی جس کی

"سعی سے اورینٹل کالج کی بنا پڑی، یہ تعلیمی ادارہ بھی تھا اور ساتھ ہی ترجمہ کی اکیڈمی بھی، مترجم زیادہ تر کالج کے معلمین اور اس کے رفقاء تھے، ان صاحبوں نے علوم و فنون پر سنسکرت، عربی، فارسی کتابوں کے ترجمے کئے، چند کتابیں تالیف بھی کیں، اور بعض سنسکرت، عربی، فارسی کتابوں کے ترجمے بھی کئے[۵۵]"

سب سے پہلا کام اس انجمن نے یہ کیا کہ مشاعرہ کے بجائے بزم مناظرہ کی بنیاد ڈالی جس سے نیچرل شاعری کے سوتے پھوٹے اور مغربی طرز پر نظمیں لکھی جانے لگیں، آزاد اور حالی اس کے روح رواں تھے۔

پنجاب میں اردو سے یہ بے اعتنائی کیوں برتی گئی؟ دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے اردو کے اثرات وہاں زیادہ تھے، اس لئے اردو کا چرچا ہی علمی و ادبی اعتبار سے زیادہ ہونا چاہئے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا، دراصل اہل پنجاب صاحب قلم سے زیادہ صاحب سیف تھے اس لئے ان کی توجہ ادبی مجلسوں اور انجمنوں کی طرف

---

[۵۱] پنجاب میں اردو، صفحہ ۲۹۲۔
[۵۲] پنجاب میں اردو، صفحہ ۲۹۶۔
[۵۳] پنجاب میں اردو، صفحہ ۲۹۸۔
[۵۴] خطبات عبدالحق، صفحہ ۳۳-۳۴۔

Marfat.com

بہت کم ہوئی ۔ دہلی کا علاقہ پنجاب ہی کا ایک حصہ تھا۔ اس لیے پنجاب کی کمی دہلی میں پوری ہوئی ۔ لاہور کو ادبی اہمیت ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی جب وہاں دہلی کے باکمال پہونچے۔ آزاد اور حالی کے ورود سے لاہور کی قسمت جاگ گئی اور پنجاب ادبی و صحافی حیثیت سے تمام مقامات سے بڑھ گیا۔ شمالی سرحدی صوبہ بھی اس سے متاثر ہوا اور وہاں بھی علم و ادب کی انجمنیں قائم ہونے لگیں، شعر و سخن کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔

اخبارات و رسائل :

قوموں کی ترقی میں اخبارات و رسائل کا حصہ بہت زیادہ ہوتا ہے، عوام تک اپنے خیالات پہونچانے کا سب سے بہتر اور موثر ذریعہ اخبارات ہی ہیں اسلئے اخبارات کی زبان عوام کی زبان ہوتی ہے جب ہم اس زاویۂ نگاہ سے ہندوستانی اخبار نویسی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اردو کا مقام بہت بلند نظر آتا ہے۔ اس کا ماضی بھی شاندار تھا۔ حال بھی، باوجود اردو کشی کی باقاعدہ اور مسلسل مہم کے برابر ہیں اور اگر جمہوریت اپنے اصلی اور صحیح رنگ اور روپ میں قائم ہو جائے تو مستقبل ماضی و حال سے بھی زیادہ شاندار ہوگا۔

اردو صحافت و طباعت کا آغاز کلکتہ سے ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے دیسی زبان کی تعلیم و تصنیف کا کام شروع کیا۔ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج پریس قائم ہوا ۱۸۲۳ء میں فارسی اخبار جام جہاں نما میں اردو کا ضمیمہ اس طرح شامل کیا گیا کہ اس کی انفرادیت اور خصوصیت قائم رہے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے اور یہ اخبار مشن پریس میں چھپتا تھا اس طرح سب سے پہلا مطبع قائم کرنے اور سب سے پہلا اخبار نکالنے کا شرف غیر مسلموں کو ہی نصیب ہوا۔

شمالی ہندوستان میں اخبار نویسی کی ابتدا ۱۸۲۶ء میں مولوی محمد باقر کی سعی بلیغ سے ہوئی۔ دہلی کالج کی ادارت میں "دہلی اردو اخبار" جاری ہوا۔ یہ ہندوستان کا دوسرا اور شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار تھا۔ اس کے بعد سید الاخبار، سید محمد اور سر سید احمد کے بڑے بھائی کی ادارت میں اور مرزا پور سے نیر خاور، پادری ماتھر کی ادارت میں نکلا۔ پھر تو اخبارات نکلنے کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا اور ہر سال اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، ہر موضوع اور ہر فن پر اخبارات و رسائل نکلنے لگے۔ اخبارات اور مطابع زیادہ تر غیر مسلموں کے قبضہ اور ان کی ملکیت میں تھے۔ پریس پر مشنریوں کا مالکانہ [illegible] مدراس، پنجاب، یو۔پی، بہار، غرض ہر صوبہ میں مشن کے پریس موجود تھے [illegible] اور مدراس سے کافی اخبارات نکلے۔ [illegible] اردو اخبار اور رسالے نکالنے کا شرف دہلی [illegible] اردو اخبار اور رسالے نکالنے کا شرف غیر مسلموں کو ہی نصیب ہوا۔

سب سے زیادہ اخبارات [illegible] بنارس اور لکھنؤ سے ۵، ۵ اخبارات نکلے دہلی سے [illegible] جن سے پابندی سے اخبارات نکلتے تھے پنجاب میں سیالکوٹ کا نمبر پہلا، لاہور کا نمبر دوسرا رہا۔ [illegible] بہار [illegible]

Marfat.com

کراچی، بھوپال، بھرت پور، ہر جگہ سے اخبارات اُردو زبان میں نکلنے لگے[1]۔

ان تمام اخبارات سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ اُردو زبان ملک گیر زبان تھی۔ ان اخبارات کے علاوہ فارسی اخبار اور مشترکہ اخبار یعنی کئی کئی زبانوں میں ایک ساتھ اخبارات نکلتے تھے کلکتہ سے مارتنڈ، انگریزی، بنگلہ، فارسی، ہندی اور اردو پانچ زبانوں میں ۱۸۴۶ء میں نکلا۔ اسکے ایڈیٹر نصیر الدین تھے۔ اندور، بھرت پور اور گوالیار سے دو زبانی اخبار (اُردو، ہندی) نکلے لیکن ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اُردو کے اخبارات سب سے زیادہ تعداد میں نکلتے تھے، اُردو کے بعد بنگالی اخبارات کا نمبر تھا۔ ہندی اخبارات کی تعداد تو فارسی اخبارات سے بھی کم تھی[2]۔

اخبارات کے علاوہ ڈرامہ، ناٹک تھیٹر وغیرہ بھی زیادہ تر اُردو زبان میں لکھے جاتے تھے، تفریحات و رقص و موسیقی اور ثقافت سب پر اُردو زبان کا احسان عظیم ہے کہ اسی کی بدولت ہندوستان میں اس فن کو ترقی اور بقا نصیب ہوئی۔

مکاتیب ادب اور اخبارات وغیرہ کے اس اجمالی ذکر سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ

(۱) اردو کے اثرات پورے ملک میں قائم ہو چکے تھے۔ یہ اثرات دہلی، یو۔پی، پنجاب وغیرہ میں زیادہ تھے لیکن کم و بیش ہر جگہ تھے۔

(۲) سیاسی انقلاب کا اثر اردو پر سب سے زیادہ ہوا، اس کے فن کا شعوری یا لاشعوری طور پر انقلاب نو کا مقابلہ اور استقبال کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

(۳) انگریزوں کی تہذیب، معاشرت اور زبان و تعلیم ہندوستانیوں پر اپنی بالادستی قائم کرتی جا رہی تھی تعلیم بدل جانے سے خیال تو خیال، زبان تک بدل گئے اور یہ تبدیلی اُردو والے طبقہ پر اس وجہ سے زیادہ ہوئی کہ یہی زبان ترجمان انقلاب تھی۔

(۴) مشرق و مغرب کی تہذیبیں باہم نبرد آزما تھیں۔ یہ کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ادیب و شاعر جو سب سے زیادہ حساس ہوتے ہیں، اس کشمکش و کشاکش سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اُردو شعر و ادب میں قدیم و جدید مشرق و مغرب کو ہم آہنگ کرنے کی آزاد اور حالی نے کوشش کی۔ دونوں کی مصالحت سے ایک ایسا تمر شیریں پیدا ہوا جس کی حلاوت سے کام و دہن کو لذت حاصل ہوئی۔

تعلیمی پس منظر:

انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ ان کا اقتدار ہندوستان میں روز بروز مستحکم و مضبوط

---

[1] تاریخ ہندوستانی اخبارات، صفحہ ۴۴۹ - ۴۰۸ (ہندوستانی اخبار نویسی)

[2] اخبارات کی تعداد اس طرح تھی۔ اُردو ۱۰۴ - بنگالی ۱۰۳ - فارسی ۱۶ - ہندی ۱۲ (ماخوذ از تاریخ ہندوستانی اخبارات صفحہ ۴۴۲ - ۴۰۸) ہندوستانی اخبار نویسی۔

Marfat.com

ہوتا جائے اور ہندوستانیوں میں خوئے غلامی اس قدر پختہ ہو جائے کہ وہ انگریز کے جاں نثار غلام اور وفادار رعایا بن جائیں، لیکن بہت سے اقتدار پسند انگریز برائے نام بھی تعلیم دینے کے اسلئے خلاف تھے کہ انگریزی تعلیم دینے سے ہندوستانیوں میں بیداری کی لہر پیدا ہو جائے گی جس سے انگریز کو حکومت کرنے میں سخت دشواری ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے تعلیم کا انتظام عیسائی مشنریوں اور پادریوں نے کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مشنری اسکولوں میں پڑھتے ہوئے ہندوستانی صورت شکل میں ہندوستانی رہ جائیں گے لیکن سیرت عقائد اور اخلاق و عبادات میں عیسائی ہوں گے۔ مگر پادریوں نے حکومت کے زعم میں تعلیم کے ذریعہ جبریہ عیسائی بنانے کی تحریک اس شدومد کے ساتھ جاری کی کہ ہندوستانی تو ہندوستانی خود انگریزوں کا بھی ایک طبقہ پادریوں کے خلاف ہو گیا چنانچہ

"۱۸۱۳ء میں تعلیمی کمیٹی کے سامنے بڑے بڑے انگریزوں نے پادریوں کی تعلیم سے مخالفت کی"

کمیٹی کی سفارش پر پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہو گیا جس میں ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کیلئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ منظور ہوا۔

اس قانون کے بعد پادریوں کی سرگرمی کم ہونے کے بجائے اور زیادہ ہو گئی۔ انھوں نے جگہ جگہ انگریزی مدارس قائم کرنا شروع کر دیئے [illegible] کی یہ تجویز منظور ہو گئی کہ ہندوستان میں مذہبی اور زمانی ترقی دی جائے۔ اس جدید قانون نے پادریوں پر رہی سہی پابندی بھی ختم کر دی۔ اب وہ بالکل آزاد ہو گئے اور

"پادریوں نے کثیر تعداد میں ہندوستان آکر اور ہندوستان کے مذاہب پر حملہ کر کے اہل ہند کی دل آزاری کا سلسلہ جاری کیا"[1]

۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی صدارت میں ایک کمیٹی پاس ہو گئی کہ انگریزی تعلیم جاری کی جائے اس تجویز کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء کے قانون کی رو سے علوم مشرقی نیز اس کے ہندوؤں کے علوم کی ہمت افزائی ہوئی۔ قدامت پسند طبقہ خوش ہوا لیکن بیدار مغز طبقہ جس کی رہنمائی راجہ رام موہن رائے کر رہے تھے اس پالیسی کا مخالف ہو گیا، اس نے علم کا جھنڈا بلند کیا اور کلکتے میں کئی انگریزی اسکول قائم کئے۔ انھوں نے لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل کو ایک [illegible]

"اس ملک کو اگر تاریکی میں [illegible] سے بہتر اور کوئی [illegible] نہیں ہو سکتا"[2]

راجہ رام موہن رائے نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم و سائنس [illegible] انگریزی اور ادبی وغیرہ کی تعلیم دی جائے۔ اس مراسلہ میں انھوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا تھا جس میں یورپ کے تعلیم یافتہ ہندوستانی اساتذہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم کی تعلیم دیں۔

غرض انگریزی تعلیم کے حامی راجہ رام موہن رائے اور ان کے ہم خیال لوگوں کا مقابلہ [illegible] پادریوں

---

[1] و [2] مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹ مصنفہ ہندوستانی اخبار نویس

اور عیسائیوں کا اس کے برعکس۔ رام موہن رائے کے خیال میں

"ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم نہ دینا ایک گہری چال ہے اور حاکموں کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو پرانی وضع کی غیر مفید اور گمراہ کرنے والی تعلیم دے کر اندھیرے میں رکھا جائے"[1]

اسی لئے انھوں نے سنسکرت کالج کی سخت مخالفت کی لیکن اس کے باوجود

"حکومت نے سنسکرت کالج اور درجے قائم کئے اور مختلف سنسکرت اور عربی یا فارسی کتابوں کو چھاپنا اور شائع کرنا شروع کیا"[2]

مسلمانوں کے لئے ۱۷۸۱ء میں ایک کالج کلکتہ میں اور ہندوؤں کے لئے ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج بنارس میں قائم ہوا تھا مگر ان دونوں کالجوں کے قیام کی غرض یہ تھی کہ قانونی اور عدالتی کاموں کے لئے ہندو اور مسلمان افسر تیار کئے جائیں، اسی طرح کلکتہ اور مدراس میں انگریزی عہدہ داروں کے لئے کالج قائم تھے

راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ میں پہلا انگریزی کالج اینگلو انڈین کالج ۱۸۱۶-۱۷ء میں قائم کیا۔ ۱۸۱۷ء میں پادری کیری نے بنارس میں عیسائیوں کا جے نرائن کالج قائم کیا۔ ۱۸۲۱ء میں ہندو کالج پونا میں اور ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج، آگرہ میں قائم ہوا، اور اسی زمانہ میں کلکتہ مدرسہ، کلکتہ سنسکرت کالج اور آگرہ کالج میں انگریزی درجات کا اضافہ کر دیا گیا۔ ان تمام کالجوں میں تعلیم کے ذریعہ تبلیغ کا نظریہ کارفرما رہا۔ میکالے کے یہ الفاظ صحیح ثابت ہو کے رہے

"میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عملدرآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہیں رہے گا"[3]

لیکن بت پرستی چھوڑ کر وہ کون سا مذہب اختیار کرے گا، اس کی طرف بھی میکالے نے صاف صاف اشارہ کر دیا کہ

"بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں"[4]

غرض یہ تعلیم مذہب عیسوی کی اشاعت کا ایک موثر ذریعہ تھی۔ اس کے خلاف مسلمانان کلکتہ نے سب سے پہلے ۱۸۲۵ء میں سخت احتجاج کیا اس کے بعد ہندوؤں نے ۱۸۴۶ء میں کیا۔ ۱۸۵۲ء میں صوبہ مدراس نے پارلیمنٹ میں یہ احتجاج کیا کہ سرکاری خزانہ تمام تر عیسائی بنانے پر صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد حکومت نے تعلیم میں غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔

شمالی ہند میں دہلی کالج ۱۸۲۹ء میں قائم کیا گیا جس میں علوم جدیدہ کی کتابوں کے ترجمے اردو میں کئے جانے اور پڑھائے جانے کا انتظام کیا گیا، یہ کالج تمام ہندوستان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا اسکی تین بڑی خصوصیتیں تھیں۔

"ایک یہ کہ یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا۔ اس نے اپنے خیالات کے پھیلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام دیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کر دی جس میں سے ایسے پختہ کار اور روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے

---

[1] ہندوستانی اخبار نویسی صفحہ ۱۲۵۔ [2] ہندوستانی سماجیات صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲۔ [3] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۴۲
[4] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۴۳

Marfat.com

جن کا احسان ہماری زبان پر اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعہ تعلیم اُردو زبان تھا، تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی (مجلس ترجمہ) تھی جو کالج کے طلبار کے لئے انگریزی سے اُردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی، اس کالج نے صحیح طریقہ تعلیم کو رواج دینے اور اُردو کو علمی زبان بنانے میں عظیم الشان خدمت انجام دی اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کا یہ کام نہایت قابل قدر ہے[1]"

اس کالج میں انگریزی طلبار کے مقابلہ میں اُردو زبان میں مختلف علوم پڑھنے والے طلبار زیادہ قابل ہوتے تھے ۱۸۵۲ء میں مسٹر کارکل پرنسپل کالج نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:-

"مشرقی شعبہ کا طالب علم اپنے مغربی شعبہ والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے[2]"

مادری زبان میں ذریعہ تعلیم کا یہ تجربہ نہایت مفید اور کامیاب ثابت ہوا، اس کالج نے بڑے بڑے قابل لوگ پیدا کئے۔ ماسٹر پیارے لال، مسٹر رام چندر، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی ذکار اللہ سب اسی کالج کے پڑھے ہوئے تھے، یہ کالج ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں برباد کر دیا گیا۔ اس کے بعد زندہ ہو کر ۱۸۷۷ء تک کمزور حالت میں چلتا رہا۔ آخر میں پنجاب یونیورسٹی سے اس کا الحاق ہو گیا۔

انگریزوں کے نظام تعلیم سے پہلے خود ہندوستانیوں کا خصوصاً مسلمانوں کا نظام تعلیم کیا تھا؟ یہاں اس کا مختصر طور پر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دہلی تو خیر مرکز العلوم اور بیت الحکمت تھا ہی اس کے علاوہ ہر ریاست اور ہر صوبے میں سیکڑوں مدرسے اور مکاتب قائم تھے۔ نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم آج کل کی طرح مہنگا نہیں تھا عموماً ہر مسجد میں مکتب ہوا کرتا تھا۔ مسجدوں میں صحن کے چاروں طرف بنے ہوئے حجرے مدرسہ کا کام دیتے تھے۔ بڑی مسجدوں میں یہ نظام اور زیادہ مکمل اور بہتر ہوتا تھا مسجدوں کے علاوہ قدیم خانقاہیں، بزرگان کرام کے مقبرے اور روضے بھی مدرسہ کا کام دیتے تھے اس طرح قریب قریب ہر جگہ چھوٹا موٹا مدرسہ یا مکتب قائم تھا جہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

مرکزی مقامات پر بڑی بڑی درسگاہیں ہوتی تھیں۔ لکھنؤ، دہلی، آگرہ، لاہور، جونپور، احمد آباد گجرات، پٹنہ، مرشد آباد، حیدر آباد وغیرہ کون ایسا مقام تھا جہاں دار العلوم نہ ہو، بعض مقامات پر کئی کئی دار العلوم ہوتے تھے۔ ان میں لکھنؤ اور دہلی کو مرکزیت حاصل تھی جہاں تشنگان علم دور دراز مقامات سے آ کر سیراب ہوتے تھے۔ ان درسگاہوں میں عام طور پر صرف و نحو، ادب، فقہ، اصول فقہ، منطق، حکمت، کلام، ہیئت، فرائض، مناظرہ، تفسیر، حدیث، اصول حدیث اور بلاغت وغیرہ کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ طریقہ تعلیم سیدھا سادا اور فطری تھا، یہ طریقہ اتنا کامیاب تھا کہ ان درسگاہوں کے پڑھے ہوئے طلبا علم و ادب تہذیب و اخلاق کے پیکر بن کر نکلتے تھے جب کہ جدید نظام تعلیم علم و فن کی زیادتی کے ساتھ اخلاقی گمراہی کا سبب بن رہا تھا اور اس میں

---

[1] خطبات عبدالحق، صفحہ ۳۱، ۳۲، ۳۳، (ماخوذ) [2] رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۵

Marfat.com

روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ سرکاری تعلیم پاکر لڑکے باپ کو خبطی سمجھنے لگے۔ اکبر مرحوم نے اسی لئے کہا تھا ؎

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں جنھیں پڑھ کر کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مکتبی تعلیم کی برکت یہ تھی کہ اسی کی آغوش میں بڑے بڑے اصحاب علم پروان چڑھے سرسید احمد، نذیر احمد، حالی، آزاد، محسن الملک، شبلی، رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر، یہ سب مکتبی تعلیم کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد جدید نصاب تعلیم کی سب سے بڑی یہ خامی بتائی کہ وہ ایک بھی ماہر فن پیدا نہیں کر پایا۔ قدیم نظام تعلیم ختم ہو چکا تھا نئی تعلیم کے اثرات اچھے نہیں تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی تعلیم کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں :۔

جب "مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال و انحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب اور ان قومی زندگی کی بھی خیر نہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و علم نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی لیکن ارباب فکر کے دو طبقے ہو گئے۔

ایک طبقہ علماء کرام کا تھا جو قدیم نصاب اور مذہبی تعلیم پر متوجہ ہوا۔ دوسرا طبقہ متجددین کا جو مسلمانوں کی فلاح اسی میں سمجھتا تھا کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور علوم و فنون سیکھیں[1]"

دونوں طبقے سرگرم عمل ہو گئے مکتب اور مدرسے دوبارہ قائم کئے جانے لگے، عربی کی اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ کی گئی۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، جو اپنی دینی و ملی خصوصیات میں منفرد ہے، دوسرے طبقہ نے مغربی علوم و فنون تہذیب و تمدن کی اشاعت کیلئے جد و جہد کی خان بہادر عبداللطیف نے ۱۸۶۳ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ میں قائم کر کے انگریزی تعلیم کی اشاعت کی شمالی ہند میں سرسید احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔

"دہلی کالج کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے اردو زبان میں علوم جدیدہ کو منتقل کرنے اور اسے علمی زبان بنانے کی سعی کی۔ سرسید اسے انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے تھے[2]"

یہ حقیقت روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی فوز و فلاح تعلیمی و تہذیبی، سماجی و سیاسی بیداری سرسید احمد خاں کی۔

"اس تعلیمی و اصلاحی تحریک سے وابستہ ہے جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں شروع اور جاری کی[3]"

غرض سرسید احمد خاں کی تحریک آفتاب بن کر یکبان ہندوستان پر نمودار ہوئی جس کی منور شعاعوں نے ملک کے گوشے گوشے کو علم و ادب سے روشن کر دیا ؎

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

---

[1] کوائف و صحائف، صفحہ ۸۔ [2] خطبات عبدالحق، صفحہ ۳۲۔

[3] نیا ادب، ۱۹۴۶ء (اردو، ہندی، ہندوستانی سجاد ظہیر) صفحہ ۲۲۔

Marfat.com

اس انقلاب انگیز عہد میں حالی پیدا ہوئے۔ مشرق و مغرب کی کشمکش شباب پر تھی اور پو
ں تو پورا ہندوستان اس آتش انقلاب کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا لیکن شمالی ہند خاص طور پر
لی، اودھ، اور ان دونوں کے گرد و نواح کے علاقوں میں انقلاب کا زور کافی تھا۔ حالی جس
م سے تعلق رکھتے تھے اُس کی بہار خزاں سے بدل چکی تھی، اس پر ادبار و افلاس کی گھٹا چھا چکی
ی، اس کی حالتِ زار پر کتنی دلسوزی کے ساتھ وہ لکھ رہے ہیں :۔

"قوم کے اصلی سرمایہ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ
ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف
دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ چکے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا
تمام قوم پر چھائی ہے، رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے، جہالت
اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے، اُمرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہونچا سکتے ہیں،
اپنی اور سب پر دنیا میں مشغول ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں
اور مصلحتوں سے بالکل ناواقف ہیں۔"

لڑ عابد حسین کے الفاظ میں :۔

"حالی کے بچپن کا زمانہ ہندوستان میں تمدن اور معاشرت کے انتہائی تنزل کا دور تھا۔
سلطنت مغلیہ جو تین سو سال سے اہل ہند خصوصاً مسلمانوں کی تمدنی زندگی کی مرکز بنی
ہوئی تھی دم توڑ رہی تھی۔ سیاسی اقتدار کی وسیع عمارت کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اور ہر
انفرادیت کی ہوا چل رہی تھی۔ ہر فرد اور ہر طبقہ کا مقصد صرف اپنی ذات تھا۔ ایک کو دوسرے
کی پروا نہیں تھی۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی، فرق اتنا تھا کہ کسی کو جسمانی عیش و عشرت
کی فکر تھی کسی کو روحانی فلاح و نجاح کی۔ امیر اپنے حال میں مست تھے فقیر اپنے حال میں
دین و دنیا سے بیزار تھا، علم عمل سے بیگانہ، اخلاق اور دین کے یہ دونوں رنگ عزلت پسندی
اور ترک دنیا اور ادب و شعر میں جلوہ گر ہو گئے تھے۔"

"اسی زمانہ میں مظلوموں کی آہ و بکا اور بے کسی کا وہ ہنگامہ برپا ہوا جسے انگریز مؤرخ
کہتے ہیں۔ انہوں نے ساتھ ہندوستان کو تباہ و برباد کر دیا۔ [illegible] بیٹھ جائے گی
بستیاں اجڑ گئیں، کھلیان جل گئے، گھر [illegible] کے رہنے والے، ہاں ملنے کتنے

۱؎ دیباچہ مسدس حالی، صفحہ [illegible] طبع پریس، ۱۹۰۶ء

۲؎ مسدس حالی، [illegible] صفحہ ۲۵

Marfat.com

بدامنی میں مارے گئے، اور کتنے امن میں پھانسی پر لٹکائے گئے، دلوں پر ہیبت کا سکہ جم گیا خوف کے پہرے بیٹھ گئے۔"[1]

شعر و ادب و انشاء پر بھی اس کے اثرات پڑے، ڈاکٹر عابد حسین کہتے ہیں :—

"زمانے کی کد و رتوں نے ادب و انشاء کے چشمے کو گدلا کر دیا تھا، مگر اس میں کچھ سوتیں پاک و صاف پانی کی بھی موجود تھیں۔ میر، سودا، درد، آتش، غالب، انیس جیسے شاعر بھی اسی اجڑے ملک میں پیدا ہوئے، جنھوں نے زبان کو سنوارا، معانی کی لطافت کو قائم رکھا، اور لوحِ شعر پر حقیقت کے آب و رنگ سے لافانی نقوش تحریر کر دیے۔ داخلیت کی قید سے تو ان لوگوں میں انیس کے سوا کوئی آزاد نہیں ہو سکا مگر اسی تنگ دائرے میں انھوں نے قلب انسانی کے جذبات و واردات کی مصوری میں وہ کمال دکھایا کہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا، وہ معاشرتی زندگی کی حقیقت سے ناآشنا رہے مگر مشاہدۂ نفس اور تہذیب نفس کا حق ادا کر گئے۔"[2]

"حالی کا نخلِ طبع دورِ تنزل کی (اسی) بنجر زمین میں اُگا"، اور اسی خزاں آلود و انقلاب بدامان آب و ہوا میں پروان چڑھا تھا۔

---

[1] حالی صدی ایڈیشن، صفحہ ۷۔

[2] حالی صدی ایڈیشن، صفحہ ۱۰۔

باب سوم

حالی کا نظریۂ شعر و شاعری

نظریہ کیا ہے؟ نظریے کی اہمیت و افادیت، قدیم اساتذہ کے نظریات کا حالی پر اثر، حالی کا نظریۂ شعر و شاعری مختلف اصناف سخن پر بحث، حالی کے نظریہ کا جائزہ

Marfat.com

ترتیب

نظریئے کی تعریف	۱۳۹
اساتذہ کے نظریئے	۱۴۳
حالی کا نظریۂ شاعری	۱۴۹
چند مباحث	۱۶۸
ا۔ مقدمہ شعر و شاعری	
ب۔ شعر	
ج۔ شاعری	
د۔ شاعر	

Marfat.com

حالی کا نظریۂ شعر و شاعری

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

ہر ادیب یا شاعر کا اپنا علیحدہ ایک نظریۂ ادب ہوتا ہے وہ اسی نظریے کے مطابق اپنی تخلیقا کرتا ہے۔ جو نظریہ حقیقت سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ زندہ اور پائدار ہوتا ہے عام طور پر نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے مسائل سے بحث کرے، ان کو سمجھے اور سمجھ کر اپنا کوئی خیال قائم کرے اور اسی خیال کے تحت فن کار اپنے فنی کارنامے پیش کرے فن کے متعلق بھی اسکا نظریہ وہی بن جاتا ہے جو اس کے عام نظریہ زندگی کے تابع ہوتا ہے۔ نظریہ کی دو حیثیتیں یا قسمیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی قسم میں کلی نظریہ آتا ہے جس میں عام انسانی مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔

دوسری قسم میں انفرادی نظریہ آتا ہے جو ذاتی تجربات و مشاہدات سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ ماحول کے عروج و زوال اور اس کی اصلاح و ترقی سے متاثر ہوتا ہے۔ فن کار کا تعلق کلی اور انفرادی دونوں نظریوں سے ہوتا ہے لیکن ادب میں اس کی امتیازی حیثیت کو متعین کرتے وقت انفرادی نظریہ کو اہمیت خصوصیت حاصل ہے۔ ادب میں نظریے کی کیا اہمیت ہے آل احمد سرور لکھتے ہیں

"ادب میں نظریے کو وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر کی ہے ... نظریے کا لفظ یہاں انگریزی کی اصطلاح (IDEOLOGY) کے مترادف ہے جس میں عقیدہ اور اس کا فلسفہ دونوں آجاتے ہیں عقیدے کے لئے عقلی بنیاد ضروری نہیں، فلسفے کا تانا بانا عقل سے تیار ہوتا ہے ... فلسفہ جذبات کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے خائف ہے ادب میں جذبات بھی بہت کچھ ہیں ... ادب نظر یاتی ہو سکتا ہے، فلسفہ نہیں ہو سکتا۔ اچھے ادیب کے یہاں ایک نظریۂ زندگی کا احساس ضروری ہے مگر اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے ادب کو مسلسل اور مربوط فلسفہ بھی بنائے۔

ادیب، ادب اور نظریہ یہ تینوں باہم اس طرح منسلک و مربوط ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا نظریہ ادیب اور ادب کا نقطۂ اتصال ہے جس طرح ہر ادیب کے لئے نظریہ ضروری ہے اسی طرح ہر ادب میں نظریہ ہونا لازمی ہے۔ ادیب یا نظریہ ہی اس کے فن کا محرک ہوتا ہے، اس کی صورت گری کرتا ہے اور اس کے ظاہر و باطن کو سنوارتا ہے نظریہ ہی کی کرشمہ سازی ہوتی ہے کہ کس سے ادیب

لہ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۹

Marfat.com

تر دید نگاہی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی تخلیقی قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے وہ ہر شے کی حقیقت پانے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن ۔ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا (اقبال)

بہترین فن کار، راز آشنا دل، حقیقت پسند طبیعت، اور نکتہ شناس نظر، رکھتا ہے۔

"جس طرح سائنسداں خارجی حقیقت کی نئی دنیاؤں کا سیاح ہے اسی طرح فن کار دل کی نئی سلطنتوں کو دریافت کرتا ہے۔ خارجی اور داخلی حقائق دونوں کے علم کے لیے ہمیں سائنس اور ادب سنجوگ کی ضرورت ہے۔ ادب میں نظریے کی تلاش اسی سنجوگ کا دوسرا نام ہے[1]"

لیکن "وہی نظریہ زیادہ قابل قبول ہوگا جو زیادہ سے زیادہ ادبی کارناموں کے حسن اور ان کی تہذیبی اہمیت کا جائزہ لے سکے گا جس میں ادب کے جمالیاتی، اخلاقی اور فنی پہلوؤں کے ساتھ انصاف ہوگا جو ادب العالیہ کی عظمت اور جدید ادب کی افادیت کا علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ ایک منظم و مربوط شعور پیدا کر سکے گا[2]"

ظاہر ہے کسی اچھے فن کار میں یہ تمام صلاحیتیں اور خوبیاں بغیر کسی وسیع تجربے اور گہرے مشاہدے کے پیدا نہیں ہو سکتیں لیکن لافانی ادب کے لئے بہتر نظریہ، وسیع تجربہ، گہرا مشاہدہ اور اظہار خیال پر قدرت کاملہ ہی کافی نہیں بلکہ ان سب سے زیادہ "دل گداختہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ ۔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

حالی کو دل گداختہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے سینے میں قدرت نے ایک حساس اور دردمند دل عطا کیا تھا زمانے کے انقلابات اور پُر آشوب حالات نے اس میں اضافہ کر کے سارے جہاں کا درد بھر دیا متعدد و مختلف علمی و ادبی، مذہبی و اصلاحی، سماجی و ملکی تحریکوں سے ان کو براہ راست یا بالواسطہ سابقہ پڑا۔ انھوں نے ہندوستان کے انقلاب اور حکمراں طبقے (مسلمانوں) کے زوال کو گہری نظر سے دیکھا۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کی، شعر و ادب کو اصلاح کا ذریعہ بنایا کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ شعر و شاعری سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں اور شعرائے کرام قوموں کی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور شعر و ادب میں اتنی توانائی اور سکت نہیں تھی کہ وہ صور اسرافیل، کا کام کرتا اس میں یا تو قنوطیت و مایوسی تھی یا ہوسناکی و لذت پرستی ایک تھکے ہارے پریشان حال مزدور کی طرح جو ایک جرعۂ آتشیں پر اپنا غم غلط کرنے کے لیے مجبور سا ہو جاتا ہے۔ شاعر و ادیب بھی نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے اور نغمۂ آتشیں و آہنگ عمل کے بجائے بے حسی و بے عملی، غفلت اور جمود، کا شکار

---

[1] ادب اور نظریہ۔ صفحہ ۲۸۲

[2] ادب اور نظریہ صفحہ ۲۸۴

Marfat.com

ہو گئے تھے وہ خواب آور نغموں اور رندی و بوالہوسی کے بیان میں غم عشق و غم روزگار سے بے نیاز ہو کر مدہوش ہو چکے تھے۔

اس سسکتے ہوئے ماحول، بدلتے ہوئے زمانے، زوال پذیر معاشرہ، قنوطیت پسند سماج تعیش پسند ادب، اور لذت پرست شاعری کا حالی نے جائزہ لیا۔ قدرت نے انھیں باشعور طبیعت اور حساس دل عطا کیا تھا۔ حادثات و انقلابات نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں اور انھیں اعتدال پسند اور محتاط بنا دیا تھا۔ علم کا فطری شوق ان کا رہنما بنا، اس نے ان کے دل و دماغ کو روشن کر کے واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی کی طرف متوجہ کر دیا۔

"وہ ایک بحرانی دور میں پیدا ہوئے تھے جس میں جمود کا شکار ہونے یا آگے بڑھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کی نگاہ تیز بیں نے زود حقیقت محسوس کر لی جس کا زندگی سے براہ راست تعلق تھا۔"[1]

اسی حقیقت کے اظہار کو انھوں نے اپنا نصب العین بنایا۔ خذ ما صفا و دع ما کدر، اور در مع الدھر کیف دار، پر عمل کیا۔ ان کی شاعری کی اساس انھیں دونوں مقولوں پر ہے۔

حالی کی شاعری اور ان کے ماحول کا پس منظر گذشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے۔ ان کے نظریۂ شاعری کو قائم کرنے میں اس پس منظر نے بڑا کام کیا۔ وہ سنجیدہ اور خاموش مزاج انسان ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھے مذہبی ماحول اور تعلیم و تربیت کے باوجود ان کا جذبۂ شعری کم نہیں ہوا۔ دلی میں مشاعروں کی شرکت اور شعرا سے ملاقات کی وجہ سے یہ جذبہ اور بیدار ہو گیا۔ مرزا غالب کے مشورہ نے اس میں تازگی اور حرکت پیدا کی۔ شیفتہ کی صحبت نے توانائی اور پختگی بخشی۔ اور چونکہ

"بچپن ہی سے ان کا بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔"[2]

اور حالی کی طبیعت بھی اسی کو پسند کرتی تھی اسلئے انھوں نے شیفتہ اور غالب کی

"رسمی باتوں سے گریز، مبالغے سے اجتناب، بازاری الفاظ و محاورات سے نفرت"[3]

یہی حالی کی کائنات ہے اور اسی کا اثر دور دور تک ان کی نظم و نثر میں ملتا ہے۔

---

[1] ماہ نو کراچی۔ مارچ ۱۹۵۳ء۔ اپنی باتیں رفیق خاور، صفحہ ۳

[2] مقالات حالی حصہ اول صفحہ ۲۶۷

[3] مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی صفحہ ۳۱

Marfat.com

"حالی باغی تھے انھوں نے ہمارے ادب کو ایک نئی سمت سے آشنا کیا۔ زمانے کا رخ بدلنے والے نے دوسروں کی آنکھوں سے دیکھا۔ آنکھیں کبھی غالب کی تھیں کبھی شیفتہ کی کبھی الطاف کی اور کبھی سرسید کی۔ مجتہد تو غالب تھے شیفتہ اور سرسید تھے۔ حالی تو ان کے نقش قدم پر چلنے والے، ان کے بندۂ بے دام۔ ان کے مخلص رفیق کار تھے۔ سوچتے تھے تو ان کے دماغ سے اور دیکھتے تھے تو انہیں کی عینک سے۔ اب اسے چاہے تقلید کہو چاہے اجتہاد۔ انھوں نے ایک خدا کے بندے کی پیروی میں نماز حیات ادا کی۔ اس میں اگر ادب کا رخ بدلتا ہے تو بدلے زمانہ سے ٹکرانا پڑتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے[1]

حالی کی سنجیدہ اور پختہ کار طبیعت پر یہ الزام ہے کہ وہ دوسروں کی عینک سے دیکھتے تھے دوسروں کے دماغ سے سوچتے تھے ان کے پاس نہ اپنا دل تھا نہ اپنی آنکھیں، نہ اپنا دماغ نہ اپنی فکر، اور نہ اپنا جذبہ، یہ مغالطہ ان کی مصالحت پسندی و مصلحت بینی کی وجہ سے ہوا۔ ان کی فطرت صلح کل تھی۔ نام و نمود سے وہ دور بھاگتے تھے۔ زمانے کے نرم گرم اور نشیب و فراز نے انھیں سمندر کا سکوت، اور پہاڑوں کا عزم عطا کر دیا تھا۔ وہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتے تھے ان کے فیصلے عاجلانہ نہیں ہوتے تھے، اسی لئے جو طے کر لیتے تھے۔ اسی پر قائم رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونا سیکھا تھا۔ اپنی کوششوں سے اپنی دنیا آپ بنائی تھی۔ ایسا شخص کبھی بھی دوسروں کی عینک سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ دوسروں سے استفادہ کرتا ہے لیکن کون ایسا بشر ہے جو اس سے خالی ہے۔ تقلید ہی میں اجتہاد کا راز مضمر ہے۔ اگر حالی نرے مقلد رہے ہوتے۔ اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے کام نہ لیتے۔ دوسروں کی انگلی پکڑ کر ہی چلتے ہوتے، تو اردو شعر و ادب میں وہ نئی راہ نہ نکال سکتے۔ انھوں نے غالب، و شیفتہ سے استفادہ کیا اور اس کا اعتراف بھی کیا لیکن اردو شاعری کے دھارے کو نہ غالب موڑ سکے۔ نہ شیفتہ۔ اس کو حالی ہی جیسے 'مقلد' نے موڑا آخر کوئی بات تو تھی جو یہ سعادت حالی ہی کو نصیب ہوئی؟ بہر حال حالی کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں غالب اور شیفتہ جیسے باکمالوں سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اور انھیں کے فیض صحبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھوں نے اپنے نایاب مال کی دوکان سب سے الگ لگائی۔ یہ کام بھی بڑی جراءت کا تھا۔ گاہکوں کی ناقدری اور بے خبری کو سمجھتے ہوئے بھی، سب سے الگ تھلگ اپنے مال کی دوکان لگانا اور اسے 'نایاب'، و 'بے بہا' کہنا حالی جیسے جری، غیر مقلد، اور حوصلہ مند انسان کا کام تھا، کسی پابند رسوم، عمر بھر دوسروں کے سہارے چلنے کے عادی، انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر عابد حسین کے نزدیک۔

حالی کا نخل طبع دور آتشزل کی بنجر زمین میں اگا مگر اس کی آبیاری میر و درد کے رشحات فیض نے کی اور اس کی پرداخت غالب و شیفتہ کے دست شفقت نے کی[2]

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی ص ۳۳ [2] مسدس حالی۔ صدی ایڈیشن ص ۸

Marfat.com

پس اگر اس نخل میں قوت نمو کی فراوانی اور تیز و تند ہواؤں کے مقابلہ کی طاقت نہ ہوتی تو وہ تخم زمین میں اگ ہی نہیں سکتا تھا اور اگر اگ بھی آتا تو اگتے ہی مرجھا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اُگا اور بڑھا اس میں کونپلیں پھوٹیں، شاخیں نکلیں، پھول اور پھل آئے جس زمین پر ہرا درخت خشک اور بے برگ و بار تھا۔ اسی زمین پر ایک سایہ دار اور پھل دار درخت کا ہونا اور قائم رہنا کیا اس کی فطری توانائی اور نمو کی شاہد نہیں ہے؟ حالی نے بھی شعر و ادب میں اپنے نظریے کے موجب نئے ادب کی تخلیق کی اور

"ہر تخلیقی ادب میں نظریہ ہمیشہ نقاب پوش ہوتا ہے خود ایلیٹ نے بھی اس سلسلہ میں اس خیال کی تائید کی ہے وہ کہتا ہے "مصنف کے سیاسی و سماجی خیالات جتنے چھپے ہوئے ہوں گے فن اتنا ہی لطیف ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اچھے اچھے ادیبوں نے صاف اور واضح طور پر اپنے نظریے کی ترجمانی ادب میں کی ہے خود ہمارے ادب میں حالی اور ترقی پسند تحریک اس کی اچھی مثالیں ہیں[1]۔

لیکن حالی کے نظریۂ شاعری کی وضاحت غالب اور شیفتہ کے نظریۂ شاعری کو سمجھے بغیر نہیں ہو سکتی مرزا غالب حالی کے استاد تھے انھیں کے مشورہ سے حالی [illegible] میں شاگرد ہونا جبکہ ان کا کلام مہمل اور بے معنی کہا جاتا تھا [illegible] غالب سے زیادہ [illegible] شیفتہ نے مستفیض ہونے کا اقرار کرتے [illegible] کے انتقال کے بعد، غالب نے شعر و سخن کرنے کے لئے شیفتہ کی سخن فہمی اور سخن [illegible] معترف تھے۔ غالب کے نظریۂ فن کے متعلق ممتاز حسین لکھتے ہیں۔

"غالب کا نظریۂ فن کیا ہے اس سوال کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شعر و ادب کے وجود اور اس کے مقاصد کے بارے میں ان کا کیا نظریہ تھا؟ اور دوسرا یہ کہ شعری تخلیق کے طریق کار کو انھوں نے کس طرح سمجھایا ہے؟ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ انھیں ہم الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ غالب نے سامنے علم کا درجہ بہت اونچا تھا وہ اپنے فن کے ذریعہ وہی کام لینا چاہتے تھے جو عالم علم سے لیتا ہے وہ اصل حقیقت کی [illegible] کی کوشش کرتا ہے۔ غالب چونکہ تمام تر غم [illegible] شاعر تھا۔

[illegible] کا جوش اور حسرت بھی لئے ہوئے تھا اس لئے [illegible]
[illegible] ایک تخلیقی شاعر میں ملتی ہے [illegible] ادب کا کوئی ایسا نظریہ نہیں دیتے جس پر عمل کر کے شاعر کو متعین راستے پر گامزن کرنے کا ہو لیکن اپنے تخلیقی تجربے سے [illegible] کا وہ راستہ دکھایا جس پر چلے بغیر نہ تو شاعری وجود میں آتی ہے اور نہ مقصد ہی پورا ہوتا ہے۔ تخلیقی

---

[1] ادب اور نظریہ آل احمد سرور ص ۲۷۸

Marfat.com

طریق کار کے متعلق اس کا یہ نظریہ تھا۔

اے ذوق نوا نجی بازم بہ خروش آور　　غوغائے شبے خونے بہ سنگ ہوش آور
گر خود نہ جہد از سر از دیدہ نمے بارم　　دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بہ جوش آور [1]

لیکن اس کے باوجود ان کا نظریہ زیادہ واضح اور روشن نہیں ہے آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ

"ان شعراء کے یہاں جو غزل کو اپنا ذریعہ اظہار بناتے ہیں کوئی فلسفہ ڈھونڈھنا عبث ہے۔ غزل کا آرٹ مسلسل اور مربوط تعمیری اور منظم فکر کے لئے موزوں نہیں ہے۔ یہ اشاعت کی دنیا۔ یہ کنائے اور لطیف نازک رمز کی بستی کسی واضح اور روشن نظریئے کی متحمل نہیں ہو سکتی ..... انھوں نے (غالب نے) اردو شاعری کو ایک ذہن دیا۔ یہ ذہن اپنے زمانہ کے تہذیبی اثرات سے باخبر ہے۔" [2]

اسی لئے اپنے "فن کی برتری کا احساس جتنا زیادہ غالب میں پایا جاتا ہے بجز میر اور درد کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں ملتا۔" [3]

لیکن غالب کے فن اور میر و درد کے فن میں کافی فرق ہے جہاں تک میر اور درد کے نظریہ اور فن کا تعلق ہے: دونوں میں وہ تنوع، وہ وسعت، وہ گہرائی اور بلندی نہیں ہے جو غالب کے نظریہ اور فن میں ہے کلیم الدین احمد نے میر کے یہاں غالب سے زیادہ گہرائی غایت کی ہے مگر غالب کی وسعت اور اس کے تنوع کے وہ بھی قائل ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"میر کے آرٹ میں گہرائی ہے اور شاید جہاں تک صرف گہرائی کا تعلق ہے کوئی دوسرا شاعر میر سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ غالب کے آرٹ میں یہ گہرائی نہیں ہے اس میں وسعت ہے تنوع ہے۔ ایسی وسعت جس کا گمان بھی شاید میر کو نہ تھا یہی وسعت غالب کے آرٹ کی نمایاں خوبی ہے۔ غالب کا حلقۂ دام خیال، نہایت وسیع ہے ..... غالب کا آرٹ اپنی گنجائشوں سے واقف ہے اور ان گنجائشوں کو ظاہر بھی کر سکتا ہے۔" [4]

حالی۔ غالب کے آرٹ سے متاثر ہوئے انھوں نے اپنی شاعری کا نظریہ اپنے استاد کے نظریئے سے مستعار لیا۔ میر کی تقلید کی یعنی سوز و گداز، درد و خلوص میں میر کی پیروی کی۔ مگر ان دونوں سے زیادہ وہ شیفتہ سے متاثر و مستفیض ہوئے۔

"نواب مرحوم مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے از حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنے اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانے کو منتہائے کمال سمجھتے تھے۔" [5]

---

[1] نقد غالب۔ مختار الدین آرزو صفحہ ۱۳۸۔ [2] نقد غالب مختار الدین آرزو صفحہ ۱۲۳۔۱۲۴ (غالب کا نظریہ شعر) [3] نقد غالب مختار الدین آرزو صفحہ ۱۲۴ (غالب کی عظمت) [4] نقد حیات ممتاز حسین صفحہ ۱۴۴ [5] اردو شاعری پر ایک نظر..... صفحہ ۱۳۴
[5] مقالات حالی (اول) ..... صفحہ ۲۶۷

Marfat.com

[illegible] کا انداز بیان حسن و خوبی حقیقت و صداقت پر مبنی تھا وہ صرف ایک بلند پایہ شاعر اور اعلیٰ [illegible] کے نقاد کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی نکتہ سنجی و نکتہ شناسی [illegible] کا شاہد ہے۔ مالک رام لکھتے ہیں۔

"شیفتہ جہاں جید عالم تھے وہیں اردو اور فارسی نظم و نثر کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اور جہاں تک نقد سخن کا تعلق ہے، اپنے زمانے سے یقیناً بہت آگے تھے"[1]

غالب نے شیفتہ کی سخن آفرینی و باریک بینی کا اعتراف کیا ہے۔

غالب ز حسرتی بہ سرائیم گہ در غزل — چوں او تلاش معنی دشمن نہ کردہ کس

شیفتہ خود کہتے ہیں

زہے ز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ — معنی شگفتہ، لفظ خوش، انداز صاف تر

ان کو شیفتہ کے ذوق سخن سے فطری مناسبت تھی۔ آٹھ دس برس کی صحبت اور ہر وقت کی مشق سخن سے وہ مجدد فن بن گئے۔ ان کے ذوق سخن کو نئی منزل مقصود مل گئی۔ انھیں خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے والی نظر مل گئی۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

خوب تر کی یہ متلاشی نظر ہی ان کے نظریۂ سخن کی بنیاد ہے

حالی نے ایک جگہ تبصرے کے ساتھ ساتھ مصحفی کی اقتدا کرنے کا اعتراف کیا ہے۔

حالی اب آؤ پیروی مصحفی کریں — بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

ممکن ہے حالی نے مصحفی مرحوم کا ذکر یوں ہی کیا ہو لیکن مصحفی کے شعری و فنی کمالات کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقت بھی ہو سکتا ہے۔ مصحفی آسمان ادب کا وہ درخشندہ آفتاب ہے جس کی ادبی شعاعوں نے دنیائے اردو کو روشنی و گرمی عطا کی۔ آپ کے دم سے گلستان اردو، فصاحت و بلاغت کے پھولوں سے لالہ زار بن گیا۔ آپ کے خوان شاعری سے ریزہ چیں کرنے لاکھوں ترانہ سنج ہو سکتے

لاکھوں ترا نہ سنج ہوئے ہیں سے ریزہ چیں — اے مصحفی میرا ہی ہے وہ خوان شاعری

اور — گر مصحفی بدید و انصاف بیشکاری — نوشتہ زن کیاست نہ ہاں

اس لئے حالی نے اقتدائے مصحفی کا ذکر سرسری طور پر یا یوں ہی نہیں کیا ہے۔ حالی نے مصحفی سے استفادہ کیا۔ اور ان کی پیروی کرتے ہوئے اپنے کلام کو اثر آفرینی سے مستفید ہونے۔ ان کے علاوہ حالی کے نظریۂ شاعری اور تنقید شعر میں بھی اثر سے میرا مطلب شیخ سعدی سے ہے۔ حالی اور مولانا حالی میں بھی مناسبت تھی۔ اس مناسبت نے حالی سے حیات سعدی جیسی بے مثل کتاب لکھوا دی۔

---

[1] تذکرہ غالب۔ مالک رام۔ صفحہ ۱۴۰ [2] تذکرہ نگار ایران شاہان صفحہ ۲۲۵

جوان کی بہترین تصنیف تسلیم کی گئی ہے ۔ اسی نے انھیں 'سعدی ہند' بنایا ۔ شیخ سعدی کا ادب میں جو مرتبہ و مقام ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے ۔ ان کا نظریۂ فن ہمہ گیر ہے جس میں اصلاحی و اخلاقی پہلو زیادہ نمایاں ہے ۔ یہ ان کے نظریے کا خلوص اور فن کا اعجاز ہے کہ وہ پیغمبران سخن میں تسلیم کیے جاتے ہیں ۔

در شعر سہ کس پیغمبرانند ہر چند کہ لا نبی و بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

حالی اس پیغمبر ادب کے سچے پیرو تھے ۔ ان کے یہاں بھی اصلاحی و اخلاقی پہلو کافی روشن ہے ادب کے متعلق سعدی کا جو نظریہ تھا اور جس کی وجہ سے وہ آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے ۔ وہی نظریہ کسی قدر ضروریات زمانہ کے اضافے کے ساتھ حالی کا بھی ہے سعدی اور حالی دونوں اس راز سے بخوبی واقف تھے ۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

عبدالقادر سروری لکھتے ہیں ۔

"سعدی کے کلام سے حالی بیحد متاثر تھے اور شاعری میں موعظت کو نمایاں جگہ دینے میں وہ سعدی شیرازی کی تقلید کرتے ہیں ۔"[1]

اس سلسلہ میں سرسید مرحوم کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا ۔ اگرچہ سرسید جدید نثر کے بانی آدم تھے لیکن انھوں نے مختلف مضامین میں شعر و شاعری کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ۔ حالی ان سے متاثر ہوئے اور نثر و نظم دونوں میں جدید خیالات پیش کرنا شروع کر دیئے ۔

ان تمام حضرات کے نظریات سے حالی براہ راست متاثر ہوئے لیکن وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دیگر اساتذۂ سخن کے نظریۂ شاعری سے بھی مستفید ہوئے ۔ اسلئے قبل اس کے کہ حالی کا نظریۂ شاعری پیش کیا جائے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے قدیم اساتذہ کے نظریات کا بیان مختصر طور پر کر دیا جائے ۔

"اردو میں شعر و شاعری کے متعلق سب سے پہلے ملا وجہی نے اپنی مشہور مثنوی قطب مشتری ، (۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء) میں چند اشارات کئے جن کو اس زمانے کے سخنوروں کا شعری نظریہ کہا جا سکتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے ۔

(۱) الفاظ اور معانی کا ربط جانے نہ پائے (۲) شعر میں سادگی اور سلاست ضرور ہو (۳) معنی بلند اور الفاظ منتخب ہوں (۴) زبان و بیان میں اساتذۂ سلف کی پیروی کی جائے (۵) صنائع و بدائع شعر کا زیور ہے ۔ (۶) شعر گوئی اور قافیہ پیمائی کے فرق کو پیش نظر رکھا جائے (۷) مضامین ایجاد کئے جائیں تاکہ استادی کا درجہ حاصل ہو ۔"[2]

---

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۵۹ [2] غزل اور مغربین ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ ۴۷

یہ نظریہ ساڑھے تین سو برس پہلے کا ہے جب اردو کی تخم ریزی کی جارہی تھی اور اردو میں لکھنے والے فارسی یا عربی کا اتباع کررہے تھے۔ ملا وجہی کے بعد ادب میں دوسری تاریخی شخصیت ولی کی ہے۔ ولی سے اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا اور شمالی ہند میں اسی کے دم سے شعر و شاعری کا شہرہ ہوا۔ ولی نے اپنے نظریے کا اظہار مختلف اشعار میں کیا ہے :-

ولی شعر میرا سراسر ہے درد — خط و خال کی بات ہے خال خال
ہے ولی کی زباں میں شیرینی — اثر شعر ہے، سم کی نسم
اے ولی فکر صاف صاحب دل — گوہر بحر نکتہ دانی ہے

اس قسم کے اشعار ولی کے دیوان میں بکثرت ہیں جن سے اس کے کمال فن اور نظریۂ فن پر روشنی پڑتی ہے مختصر یہ ہے کہ ولی کے نزدیک۔

(۱) شعر میں درد و اثر ہو۔ (۲) اثر آفرینی اور رنگینی ہو (۳) فکر کی بلندی اور بیان کی شیرینی ہو۔ (۴) انداز بیان شگفتہ اور سادہ ہو۔ (۵) رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ لطافت زبان بھی ہو۔

ولی کے اس نظریے سے تمام اساتذہ متاثر ہوئے۔ شاہ حاتم، میر، سودا، درد، ناسخ، نساخ وغیرہ سب نے فیض حاصل کیا۔ ولی میں شاہ حاتم اور لکھنؤ میں شیخ ناسخ نے اردو شاعری کیلئے جو قواعد و ضوابط بنائے ان سے ان کا نظریۂ شاعری ظاہر ہو جاتا ہے۔ شاہ حاتم اپنی استادی کے باوجود ولی کی ولایت کے قائل تھے۔

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی نہیں کم — لیکن ولی، ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

اسی لئے حاتم کا نظریۂ شاعری قریب قریب وہی تھا جو ولی کا تھا۔ البتہ صنعت گری اور ایہام گوئی کو پہلے پہل وہ حسن شاعری سمجھتے رہے اور اسی پر عمل کرتے رہے مگر آخر میں ان کا یہ نظریہ بدل گیا تھا اور وہ صاف و سادہ کلامی ہی بہتر سمجھنے لگے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں۔ اور سراج الدین آرزو بیان کی سادگی کو ضروری سمجھتے تھے۔

خدائے سخن میر تقی میر نے نکات الشعراء میں شعر و شاعری اور شاعروں کے متعلق اپنے خیالات اور نظریات ظاہر کئے ہیں۔ وہ شاعری میں درد مندی، اور سوز و گداز کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا دیوان بھی درد و غم سے لبریز ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میر کے مجموعہ درد و غم کے اجزاء یہ ہیں۔

(۱) درد مندی (۲) صفائی گفتگو (۳) سنجیدگی (۴) اصلیت یا حقیقت نگاری (۵) لفظ تازہ کی تلاش (۶) ربط کلام (۷) خوش فکری (۸) تاثر خاص (۹) کلاسیکیت[1]

[1] تذکرہ نکات الشعراء طبع ہوا ہے۔ اردو کے قدیم تذکروں میں ذکر کا یہ ایک نیا انداز ہے

ادب اپنے ماحول کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور اس سے متاثر بھی وہ حالاتِ زمانہ کے پیش نظ
اپنا زاویۂ نگاہ بدلتا رہتا ہے میر کے بعد شیخ ناسخ نے جو اصلاحات کیں اور شعر و شاعری کے لئے جو نظ
قائم کیا وہ لکھنؤ کی ماحول کی غمازی کرتا ہے۔ اس پر تکلف ماحول میں آتش نے بڑی عمدگی کے انفرا
قائم رکھی اور مرصع سازی کے ساتھ ساتھ خلوص و درد مندی کو بھی فراموش نہیں کیا۔ آتش نے ایک
مثال اٹھائے ہیں جس کی شاخیں قلم کی ہیں جس کے ورق، ابرگ، حروف کے پتے ہیں جس کے پھول معنی ہیں۔
اور جس کے پھول صنعتیں ہیں۔ وہ اسی کو معراج شاعری سمجھتے ہیں۔

معنی ثمر، حروف و ورق صنعتیں ہیں گل ۔۔۔ ناسخ ہے کلک فکر مرا سخن کی شاخ

اور خواجہ آتش کا نظریہ اس شعر کے اردگرد چکر لگاتا ہے۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں ۔۔۔ شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

گویا شاعری باغبانی اور مرصع سازی ہو گئی۔ ڈاکٹر ابواللیث کے الفاظ میں۔

"ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعر و شاعری کے متعلق شاعروں (لکھنؤ) کا نظریہ بدل گیا۔ دراصل یہ ایک نئی حکومت اور ایک نئی تہذیب و معاشرت اور لوگوں کے بدلتے ہوئے مذاق کا نتیجہ تھا..... اودھ میں عام مالی فارغ البالی نے رفتہ رفتہ عیش پسندی اور آخر کار عیش کوشی کا ماحول پیدا کر دیا جو شعر و شاعری میں رکاکت و ابتذال اور فحاشی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دوسرا اور اہم عامل مغربی پرستوانیت کا اثر سوسائٹی پر اس قدر چڑھ گیا کہ تخیل کو فروغ نہیں ہوا۔ دوسری طرف مذہبی تشدد سے مرثیہ گوئی کا فن اردو میں اس کمال کو پہونچ گیا جس کی مثال ایشیائی شاعری میں اور کہیں نہیں ملتی..... ایک اور بات یہ پیدا ہو گئی کہ صنعت کو فوقیت و ترجیح دینے کا رواج عام ہو گیا۔ شعر کی ظاہری زیبائش و آرائش کے لوازم اب شعر کے اہم عناصر قرار پائے اور حقیقی خود خیال تکلف اور تصنع کے ان پردوں میں بالکل چھپ گئے۔ شاعری مرصع کاری رہ گئی۔ شیر کا جوہر باقی نہ رہا۔"

حالی کے پیش نظر یہ تمام نظریات تھے۔ ان کی اصلاح سے طبیعت نے چند ایسے شعراء کی غزلیں انتخاب کیے جن کی رنگت اور خوشبو اصلی تھی۔ جو تکلف و تصنع سے بری تھے اسی لئے وہ میر و سودا کے بعد سب سے مستفید اور مناسب کے شاگرد ہوئے اور جب وہ مغربی ادب سے روشناس ہوئے ان کی نکتہ شناس طبیعت اور دور رس نگاہ نے مغربی پیروی میں اردو شعر و ادب کی زندگی اور بقا کا نتیجہ سمجھا اور میر کی اقتدا سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر دیا۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں ۔۔۔ بس اقتدا سے میر و مضمون گر چکے

لہ مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۷۹ - ۸۰

Marfat.com

اس طرح حالی کے شعری نظریہ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا نظریہ ۔ وہ ہے جو حالی نے قدیم شاعروں کے نظریے سے اپنے طور پر اخذ کیا اور اسی پر عمل کیا۔

دوسرا نظریہ جس کو جدید نظریہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مغربی علوم و ادب سے آشنا ہو کر مشرقی ادب کے مزاج کے [illegible]

قدیم اور جدید نظریات شاعری میں جو فرق ہے۔ اس کے متعلق سید احتشام حسین تحریر فرماتے ہیں۔

قدیم نظریہ شاعری کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں۔

"وہ زبان کی صحت، عروضی سقم، صنائع اور انداز بیان پر نگاہ رکھتے اور بیان کو مگر کبھی کرے تو محض اس کی نزاکت اور لطافت کو پیش نظر رکھے۔"

لیکن جدید نظریہ شاعری کے حامی۔

"فن کی حقیقت، شعر و ادب کی [illegible]"

قدیم اور جدید نظریۂ شاعری میں [illegible]

حالی کے قدیم اور جدید نظریات شاعری کا [illegible]

قدیم نظریہ شیفتہ کی ملاقات سے پہلے [illegible]

ان کی ملاقات [illegible]

پہنچے ان کے خیالات [illegible]

جدید نظریہ ۔ اس کے دو دور ہیں۔

پہلا دور ۔ قیام لاہور سے سرسید کی تحریک [illegible]

"مغربی ادب سے الوالعزمی [illegible]

دوسرا دور [illegible]

میں انھوں نے شاعری [illegible]

حالی کے قدیم نظریہ شاعری کی ابتدا اس [illegible]

تھے اور برسوں شیخ بدر تک تیار کیا تھا۔ ولی میں مرزا [illegible]

غالب نے یہ کہہ کر کہ "اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر [illegible]

زمانہ میں ہو تو [illegible]

[illegible]

Marfat.com

مطمئن نہ ہو سکے اس زمانہ کا کلام ضائع ہو گیا صرف ایک نعتیہ خمسہ یادگار ہے اس سے ان کے مذہبی اصلاحی نظریہ کا اندازہ ہوتا ہے شیفتہ کی ملاقات اور مصاحبت سے ان کا "طبعی میلان بھی جواب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ کہنے کا اتفاق ہوا[1]۔

شیفتہ مرحوم کے خیالات کا اثر حالی پر پڑنے لگا چنانچہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

"ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا[2]"

یہی خاص قسم کا مذاق حالی کا قدیم نظریہ شاعری ہے۔ یہ مذاق حسب ذیل صفات کا حامل ہے۔

۱۔ مبالغہ سے اجتناب کرنا۔ (۲) حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا۔

۳۔ سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا۔

حالی کی قدیم غزلوں میں یہی نظریہ کارفرما ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے الفاظ میں سچی باتیں بیان کی ہیں اور مبالغہ سے پرہیز کیا ہے۔ اپنے انداز بیان سے لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانہ کا کلام غزلوں پر مبنی ہے۔ سر شیخ عبدالقادر کے الفاظ میں۔

"ان غزلوں میں تغزل کی طرز قدیم کے اچھے نمونے موجود ہیں" مگر وہ "اس میں بھی مضامین کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے[3]"

حالی نے اپنی ان غزلوں میں "میر کے درد، غالب کے انداز بیان اور شیفتہ کی سادگی اور سچائی کو یکجا کر دیا[4]"

جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح — کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا
جو جان سے در گذرے وہ چاہے سو کر گذرے — گر آج نہ تم آتے کیا جانے کیا ہوتا
رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پڑ جائے مسیحا مری دارو کا
منتظر ہیں نظر بہت ہیں لیکن — اذن ہم کو نہیں گویائی کا
ہے ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں — ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا
تم تو نہ ادھر سہی مجھ کو لاکھ ضبط — الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
آؤ مسیحا بھی و خلش آزمائے قتل — کیا اعتبار زندگی مستعار کا
اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دل حزیں — ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
آتے گئے جب اس کی تمنا میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

---

[1] حیات حالی۔ اول صفحہ ۲۶۶ - ۲۶۷ [2] زمانہ حالی نمبر۔ حالی اور غزل صفحہ ۱۰۴
[3] حیات و ادبی رجحانات صفحہ ۲۱

سمجھ کر کر دقتل حالی کو دیکھو — مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت
لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ — پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم
بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی — سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں — دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

ان اشعار میں بھی حالی کا نظریہ قدامت سے بغاوت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کو اشارات میں اب کوئی لطف نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی زبان میں کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن محرم نہ ہونے کی وجہ سے کہہ نہیں سکتے تھے وہ اس کشمکش میں اس وقت تک مبتلا رہے جب تک لاہور نہیں گئے۔ ۱۸۶۹ء میں مرزا غالب کا اور اس کے کچھ عرصہ بعد اسی سال نواب شیفتہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ حالی کا تعلق جہانگیر آباد سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تلاش معاش میں وہ دلی آتے ہیں۔ یہاں کچھ عرصہ تک قیام رہتا ہے پھر بسلسلۂ معاش ۱۸۷۲ء میں لاہور آجاتے ہیں۔ اس وقت لاہور میں دلی کے ارباب کمال ایک ایک کر کے آچکے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا ساتھ ہو جاتا ہے۔ مغربی ادب سے بذریعہ ترجمہ آگاہی ہوتی ہے۔ ان کی جدت پسند طبیعت کے لئے ایک [illegible] میدان نیا ضرور تھا لیکن حالی عرصہ سے اسی کی تلاش میں تھے۔ ان کی فکر و نظر کی بیمائی کیفیت کو قرار سا ہو جاتا ہے۔ اب انھیں اپنے دل کی واردات بیان کرنے کے لئے ایک 'دل سوز' مل گیا جس سے وہ اپنی زبان میں راز و نیاز کر سکتے ہیں۔ ادھر مولانا محمد حسین آزاد بھی ایشیائی شاعری کا ہیولیٰ بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی ژرف نگاہی نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اگر اردو شاعری کی قلب ماہیت نہیں ہوئی تو وہ فنا ہو جائے گی۔ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن پنجاب کے جلسے میں "نظم اور کلام موزوں کے باب میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے اگر ایک طرف شعر و شاعری کی اہمیت و افادیت پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف جدید نظریۂ شاعری پر اشارات ملتے ہیں۔ مولانا آزاد نے نظم کو "[illegible] اور شعر کو گلزار فصاحت کا پھول بتایا ہے لیکن یہ دونوں خزاں کا شکار ہو گئے۔ پھولا پھلا گلستان [illegible] سے جھلس گیا۔ مولانا آزاد ایک تجربہ کار اور ماہر باغباں کی طرح چمن کی سرسبزی و شادابی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے اندر سے خس و خاشاک دور کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ اہل چمن کو غیرت دلائی کہ وہ اپنے چمن کی خبر لیں اور اس کی خزاں کو بہار سے بدلنے کی کوشش کریں اپنے شعر و ادب کے چمن میں تر و تازہ پھول کھلائیں ورنہ۔

لہ مجموعہ نظم آزاد صفحہ ۱۲/۱۴

Marfat.com

"ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان کی اولاد ان کی شاعری سے ناواقف ہوگی"

اس لئے "اے خاکہ ہند والو! اگر تجھ میں آثار اولیس ہو، تو کبھی نہیں تو کوئی کالی داس ہی نکال"

مولانا آزاد کی یہ حقیقت آمیز آواز دل سے نکلی تھی اثر کیسے نہ کرتی۔ ان کو خود یقین تھا کہ اس آواز کا اثر ضرور ہوگا۔

تمھاری لے کوئی نام لیوا کوئی تو دیکھے گا ۔۔۔ نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا آزاد،

یہ وقت کی آواز تھی جس کو اپنا اثر کیا، خوش قسمتی سے بقول ڈاکٹر اعجاز حسین۔

"اردو شاعری اس وقت نئے انداز بیان نئے خیالات سے ادب کا دامن وسیع کرنے کیلئے بے چینی سے منتظر تھی۔ انگریزی سے شناسائی ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ہمارے یہاں صدیوں ایک ہی میدان میں دوڑتے دوڑتے تھک کر دوڑ محدود رہی ہے۔ مغربی ادب میں شعراء نے ہر طرف کائنات کی گل کاریوں پر نظر ڈالی ہے۔ منظر، اخلاق، رزم، عشق کے علاوہ دنیا کے دوسرے محسوسات مذہب، سیاست، سماج، حب وطن، کاروباری زندگی کے متعدد پہلوؤں پر اہل سخن نے توجہ کی ہے۔ ادب کا یہ دامن وسیع ہوا اور مختلف جماعتوں کی دلچسپی کا سامان بھی ہو گیا۔ چنانچہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ ہماری زبان ہے اس میں ہمارے خیالات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ہمارے جذبات کا بھی احترام کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ قومی زبان ہے۔ انداز بیان بھی ایک ہی نہیں ہے کافی لوگوں کو اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کا موقع مل گیا ہے اور یہاں تو صرف غزل و قصیدہ کا غلبہ ہے جس میں ہر شاعر کے جذبات اتنے ملتے جلتے ہیں کہ امتیازی شان پیدا کرنا پہاڑ توڑ کر دریا بہانے کے برابر ہے"[1]

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"سیاسی، تہذیبی، سماجی، علمی، ادبی، مذہبی، فلسفیانہ اور دوسری تحریکات وقت کی ضرورت اور تقاضا بنیں تو اردو زبان، و ادب کے رہنماؤں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے کوشش کی کہ ادب کو زندگی کے قریب تر لائیں۔ انھیں حالات اور خیالات نے حالی اور آزاد کو ہماری شاعری کی جادہ سازی پر آمادہ کر دیا۔ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن اردو قائم کرتے وقت آزاد کا تاریخی لکچر جدید اردو شاعری کی تحریک کے اسباب اور نصب العین پر اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے"[2]

مولانا آزاد کے سرگرم شریک کار مولانا حالی ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں جب بزم مناظمہ قائم ہوئی

---

[1] مجموعہ نظم آزاد صفحہ ۲۸/۳۰

[2] نئے ادبی رجحانات صفحہ ۳۰ [3] نئے ادبی رجحانات صفحہ ۳۷

اور اس میں یہ طے پایا کہ شعراء کو مصرع طرح کے بجائے نظم کا کوئی عنوان دیا جائے اور شعراء اسی عنوان پر طبع آزمائی کریں تو سب سے پہلے حالی نے قلم اٹھایا اور چار مثنویاں حب وطن، برکھا رت، نشاط امید، اور مناظرہ رحم و انصاف لکھیں جو ۱۸۷۴ء کی وہ مبارک سال ہے جب حالی نے اپنے [illegible] نظریہ شاعری کو اردو شاعری میں عملی طور پر پیش کیا۔ اور وہ اسی وقت سے برابر اس پر عمل کرتے رہے اگرچہ ان کے خیالات اور نظریات میں تبدیلی بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی چنانچہ مرثیۂ غالب میں یہ احساس تغیر نمایاں ہے۔ انھوں نے [illegible] کو ترکیب بند میں لکھا اور اس میں انھیں باتوں کو مدنظر رکھا جو مقدمہ شعر و شاعری میں کیا ہے لیکن ان کی [illegible] یہ بات کہی کہ

"کل و بلبل کے افسانوں کا اثر [illegible] کا ایک دستہ تیار کرنا آسان کام نہیں۔ یہ [illegible]

مولانا حالی نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے [illegible] کے مشاعرہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ایشیائی شاعری [illegible] ہر وسعت دی جائے اور اس کی [illegible] پندرہ برس پہلے (یعنی ۱۸۵۵ء سے) کی جاتی تو اس ہر شاعر کو [illegible] لوگ ہندوستان میں اردو [illegible] کے ساتھ ذکر کے قابل ہے۔ [illegible] مغربی طرز تحریر اور مغربی انداز بیان آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں [illegible]

جدید اردو شاعری کی تحریک کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت ہوئی جبکہ اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جا رہی تھی۔ لٹریچر میں بہت سی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتی جاتی تھیں۔ [illegible] کے ساتھ ذکر کے قابل ہے۔ [illegible] مغربی طرز تحریر اور مغربی انداز بیان آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں [illegible]

---

[1] نئے ادبی رجحانات ص۔۔۔

[2] مجموعہ نظم حالی دیباچہ صفحہ [illegible] طبع اول [illegible] ۱۹۱۰ء

Marfat.com

تک کہ ۱۸۷۲ء[عہ] میں سرسید احمد خاں نے پرچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے سبب سے مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا اردو فارسی انشا پردازی کا قدیم طریقہ ان کی نظر میں نہایت مکروہ اور مکلف معلوم ہونے لگا اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

چنانچہ مولانا حالی جو پہلے ہی سے قدیم ادب سے بیزار تھے "دیوانہ را ہوئے بس است" کے بموجب جدید ادب کے کوچے میں اس اعتراف کے باوجود کہ "ان نہ شد کہ" :

"مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں کیسے کہ اردو ہے ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت سابقہ اور اتفاق سے بالطبع نفرت تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے۔ یا اپنے قدیم طریقہ سے ترک کرنے کا الزام عاید ہو..... ان صاحبوں تک سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے اس پر عمارت جتنی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور سیانی نسلوں کا کام ہے جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ در خاک معنی تخم سی افشاندہ ایم
تا کہ بعد از ما شود ایں تخم نخل بارور[1]

اس تحریر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حالی کے دل میں قدیم شاعری سے نفرت کے جذبات موجود تھے وہ اس کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ یہ صرف ان کی مصلحت بینی اور احتیاط تھی کہ انھوں نے موقع و محل کو مدنظر رکھ کر مناسب وقت پر، اصلاح کے لئے انقلابی آواز بلند کی اور سب کو اس پر چلنے کی تلقین کی۔

مسدس حالی (مطبوعہ ۱۸۷۹ء) کے دیباچہ اول میں کتنے بلیغ انداز میں جھوٹی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دیدتھی مگر دنیا کی نگہ دو بات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔

عہ تہذیب الاخلاق کا اجرا ۱۸۷۰ء میں ہوا تھا۔ ۱۸۷۲ء صحیح نہیں ہے۔

[1] مجموعۂ نظم حالی دیباچہ ص۲ [2] مجموعۂ نظم حالی صفحہ ۳-۴۔

Marfat.com

خود آرائی کا خیال آیا نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی، نہ وصل کی لذت اٹھائی، نہ فراق کا مزہ چکھا۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکون کو ہلا ڈالا۔ کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے ہو گئے۔ شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو صاف خدائی کو رقیب سمجھا یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے۔ جب شوق کا دریا امنڈا تو کعبہ دل سے جذب مغناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ سیدان تیغ محبت میں اکثر گزر ہوا۔ بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر آئے تو کوثر لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی کبھی میخانہ فروش کے در پر گدائی کی۔ کعبہ سے وفا رہے، ایمان سے بیزار رہے۔ پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی۔ برہمنوں کے چیلے بنے۔ بت پوجنے زنار باندھنے، شقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کہیں، واعظوں کا خاکہ اڑایا۔ دیر اور بت خانہ کی تعظیم کی کعبہ و مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں۔ اعجاز مسیحی کو ایک تمثیل جادو، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غرض کبھی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں، کبھی تو بھبوت رمائے اور بادہ خواروں کے منہ چھپے دستے۔ بہشت خاکدان کیسا انتظر کے خیال میں نکلے۔ ہر چوب خشک میں عصائے موسیٰ کے کرشمے دکھائے۔ ہر مردہ وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا۔ ہر ذعون بے ساماں کو قارون طبق سے جا بھڑایا جس کے مداح بنے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامہ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔

چو پرسش عفو روز حشر خواہد بود — تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

بیس برس کی عمر سے لے کر پچاس سال تک تسلی کے بیل کی طرح آنکھ پر پٹی باندھے ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر رہے جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں۔

تمکنت رنگ شباب و شہد زر عنائی — درآں دیار کہ زاری ہنوز آنجائی[1]

---

[1] دیباچہ مسدس حالی ص ۳

حالی نے اپنی رندانہ یا عاشقانہ شاعری کا زمانہ تیس برس سے چالیس سال کی عمر تک بتایا ہے یعنی ۱۸۷۷ء تک۔ یہ زمانہ مسدس لکھنے سے پہلے کا ہے۔ گویا مسدس سے پہلے کی شاعری ان کے نزدیک ناکام سیاہ کرنے والی شاعری تھی۔ یہ ان کی کسر نفسی اور خاکساری ہے، نہ تو انھوں نے غزلوں میں پاک شہدوں بولیاں بولیں اور نہ قصائد میں بھاٹ بنے۔ البتہ اردو شاعری ان صفات کی ضرور حامل تھی لیکن حالی نظریۂ شاعری پاک وصاف رہا ہے جھوٹ اور مبالغے سے بالطبع نفرت رکھنے والا، دروغ و مبالغہ آ شاعری کر ہی نہیں سکتا یہ جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ اردو شاعری کے خلق ہے اور اس میں حالی نے اپنا نظر صاف اور واضح طور پر پیش کر دیا ہے کہ وہ کس قسم کی شاعری چاہتے ہیں۔ قدیم شاعری کی اصلاح اور جا شاعری کی اہمیت کے متعلق تجزیہ فرماتے ہیں:-

"یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعراء کے بعض خیالات سے دستبردار ہو جائیں مگر ان کے طریقہ بیان سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ ۔ ۔ نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کی طرز بیان سے بہت دور نہ جائے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے بنے بنائے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔"[1]

نئے خیالات کی تشریح ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن کی رسائی وہاں تک نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و غیر شاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت ان کے پیش نظر ہیں مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور متبذل ہیں ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی طرف سے بہت کم التفات کیا گیا۔ اور پایۂ شاعری کو ان سے دور اور اونچا گیا ہے لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید انھیں متبذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے[2]

اسی طرح حالی نے قدیم بنیادوں پر جدید عمارت کی تعمیر کی اور پہلی دفعہ
"شاعری میں حقیقت اور اصلیت کو مدنظر رکھنے کی ہدایت کی"[3] اور اس کے بعد مقصدیت

---

[1] دیباچہ دیوان حالی ص۔ [2] دیباچہ دیوان حالی ص۔
[3] حالی اور ان کا عہد۔ (نذری آواز میگزین سکشن

[illegible]

پیش نظر رکھا جائے۔ اس قطعہ میں انھوں نے اپنے نظریہ شاعری کی وضاحت کی ہے۔ درحقیقت یہ قطعہ حالی کے نظریۂ شاعری کا دستور العمل ہے۔

اے شعر دل فریب نہ ہو تو، تو غم نہیں
نعمت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
جوہر سے راستی کا اگر تیری ذات میں
حسن اپنا کر دکھا نہیں سکتا ہے اگر
تو نے کیا ہو جگر حقیقت کو [illegible]
[illegible]
اہل نظر کی آنکھ میں [illegible]
[illegible] اور پڑی ہو [illegible]
چپ چاپ اپنے سچ سے کئے جا دلوں میں گھر
جو بلد ہیں ان کو بتا چہ بن کے راہ
خدمت کا بھیس ملک کی خدمت ہے چھپا
اے شعر! راہ راست پہ تو بیکھ ٹیڑھ لیا
[illegible]

اس قطعہ میں حالی نے شعر کے لیے یہ خصوصیات بتائی ہیں:

۱۔ دلگداز ہو [illegible] دلفریب نہ ہو
۲۔ سادہ ہو اگرچہ ساری دنیا صنعت پر شیدا [illegible]
۳۔ سچا ہو اور اپنے سچ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے والا ہو
۴۔ نابلد کو چوبیس گھنٹے راہ بتانے والا ہو، ملک کی [illegible] اور [illegible]
نصیب ہو
۵۔ اگر ہمدرد دنیا اپنی شاعری کو قرار دلانے تو [illegible] آگے روا نہ ہو

لہ ادب اور نظریہ۔ ص ۲۹۱

(یعنی موجودہ سروسامان اور لوازمات شاعری کو چھوڑ کر اپنے اصول اور نظریے کے تحت آگے بڑھو) سمجھانے کے لئے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ تیری دوا سے نوک ناک بھوں چڑھائیں گے لیکن اگر تو ایک تجربہ کار چارہ ساز ہے تو اس کی پرواہ نہ کر اور اپنی تشخیص کے بموجب علاج کرتا رہ۔ اس حقیقت سے بھی خبردار کر دیا ہے کہ سچ کی قدر ہمیشہ بے قدری کے بعد ہوتی ہے اسلئے ہمت نہیں ہارنا چاہیئے اور سچائی کی طرف سب کو مسلسل بلاتے رہنا چاہیئے۔ مقطع میں حالی نے صاف صاف اپنے نظریہ کے متعلق اعلان سا کر دیا ہے کہ جہاں تک حالی کا تعلق ہے وہ تجربہ اور جوہر کو روایت بالا صفات کا حامل سمجھتا ہے کچھ بھی ہو وہ اسی پر کاربند رہے گا۔

حالی نے انھیں نظریات پر عمل کیا ان کی پوری شاعری، ان خصوصیات کی جیتی جاگتی تصویر ہے وہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے نظریہ پر عقیدہ رکھتے تھے کہ اردو شاعری کو زمانہ کا ساتھ دینا چاہیئے اسے ہوا کا رخ پہچاننا چاہیئے۔ اسے اچھی باتوں کو اپنانا اور بری باتوں کو چھوڑنا چاہیئے۔ اسکے صداقت خلوص اور سادگی سے قریب تر ہونا چاہیئے اور جھوٹ، مبالغہ اور مہمل لفظی شعبدہ بازی اور تصنع و تکلف سے دور رہنا چاہیئے۔ جو شعر اس کا تعلق انسانی زندگی سے قریب اور مستحکم ہونا چاہیئے اور اسے ظاہری یا خیالی حسن پر فریفتہ اور عشق میں مبتلا ہونے کے بجائے حقیقی اور فطری حسن و جمال کا شیدائی ہونا چاہیئے مخمور اکبر آبادی کے الفاظ میں :۔

"وہ اس زمانہ کے خوبصورت آگاہ تھا کہ زندگی کے رموز پوری زندگی کے مطالعہ سے منکشف ہوتے ہیں یہ جانتا تھا کہ صرف تخیلات اور خوشگوار معاملات پر اکتفا کرنے سے شاعر کا فرض ادا نہیں ہوتا۔ وہ اس بھرپور زندگی کا خواہاں تھا کہ انسان کو زندگی کی تلخیوں سے آگاہ کرنا سیکھے بہانے خوش وقت و خوش باش کرنے سے بہتر اور مقدس ہے ان عقائد کے تحت اس نے شعر کی دعا بہت دور رکھی کہ ایوان کھنڈر بنے اور لفظی شعبدوں کے لات و منات تو ہتھوڑے کو رکھ دیئے"[1]

اس باطل شکنی پر انھوں نے سختی کے ساتھ عمل کیا اور اس میں اتنی شدت اختیار کر لی کہ جب الشاعر [illegible] کے لئے مصرعہ طرح پر غزل لکھنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے سفر [illegible] کو سمجھ لیا ہے "غزل نہ لکھنے کا عذر" یہ بتایا کہ

اپنا دفتر ان کو سونپا جب سفر کرنے لگے	جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے، نہ چاہت ہے، نہ جوانی ہے امنگ	سر ہے سودائے سخن، دل ہے محبت سے خالی

---

[1] صحیفہ تاریخ اردو صفحہ ۳۴۵-۳۴۶

Marfat.com

[illegible]

حالی نے یہ غزل [illegible] عمر ایسی شیریں [illegible]

کا نعرہ لگایا ہے [illegible] حالی کا نظریہ [illegible] ہے اس میں حالی نے کھلے دل سے اور صاف صاف اعتراف کیا ہے [illegible] میں اپنی روداد عشق لکھتے تھے اور ان کی غزلیں انکے حسب حال ہوتی تھیں [illegible] خزاں آگئی اور جوانی کی امنگیں ختم ہو گئیں [illegible] سر میں جنون عشق [illegible] کا افسانہ ہو یا [illegible] وہ بے حقیقت ہے [illegible] اور خیال کی بلندی سے کام نہیں لیا جاتا۔ اصل [illegible] ہجر و وصل کے فرضی افسانے بیان کرکے جوانوں کے دلوں میں [illegible] نہیں دلالی ہے۔

[illegible] ان کا کلام انھیں کی روداد عشق ہے اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے [illegible] جگ بیتی نہیں ہے کوئی وجہ نہیں کہ ان کے اس اعتراف کو حقیقت پر مبنی نہ سمجھا جائے [illegible] کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرنا کہ

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی　　عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

لہ : دیوان حالی صفحہ ۱۳ - ۱۴

Marfat.com

اور جب عاشق کسی کی ذات میں ہے تو پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ حالی جیسا فقہ سنجیدہ خاموش اور شرمیلا انسان اپنے سینہ کے اندر عشق و محبت سے آشنا حسن و جمال کا شیدائی، دل زندہ رکھنا تقاضائے عشق و محبت ہے کون بشر خالی رہا ہے؟ پھر حالی کو اس سے کیوں مستثنیٰ کیا جائے۔ جیسا کہ دیگر الاخلاق نے کہا ہے۔

لیکن یہ بات نہ تھی حالی بھی انسان تھا کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

یہ سادہ دل جب بھی کہیں مبتلا رہا الفت کے ترانے اور ہجر کے راگ گاتا رہا اس کا یہ خلوص تھا یا اس کی یہ جرأت رندانہ تھی کہ جب اس نے اپنے سینے کو محبت سے خالی پایا تو اس نے صدق دل سے یہ اعتراف کر لیا کہ

"اے کاش کہ میں نے دل مضطر نہ لگایا"

اور جب دل زندہ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو اس نے بھی ہمیم کہانی کہنا ترک کر دی۔

بلبل کی زبان میں ہر نالہ ہے جو تیرا بزم شعرا میں شعلہ نوائی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

اس کے بعد اسی نے اپنی ناصحانہ اور واعظانہ شاعری کا سبب بھی بتا دیا۔

جوانی ہے معاشق تجھ کو زیبا نہیں ناصح جو دل پہ لی بنتی تو یاں منہ کی کھائی

نظم کا مطلب یہ ہے کہ حالی نے مذہب شاعری میں ریاکاری سے کام نہیں لیا بلکہ سچائی کے ساتھ جو دل پہ گزری اسی کو بیان کیا یہی صداقت یہی خلوص یہی بے ریائی اور یہی سادگی اور ان کا مخلصانہ اظہار و ابلاغ ان کے نظریۂ شاعری کی روح ہے لیکن جس زمانہ میں انھوں نے یہ سچی بات کہی، مذہب و ادب کے ملنگوں نے ان کے لئے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔

"مولوی الطاف حسین حالی نے کوئی غزل نہیں لکھی بلکہ غزل نہ لکھنے کا مذہر ایک قطعہ میں بیان کیا ہے جس کو غزل پڑھنے سے معذور کہا ہے"[1]

اگرچہ میر مشاہدہ کا یہ نتیجہ انتزاعی و تضحیکی۔ پر مبنی تھا لیکن حقیقت بھی یہی تھی کہ حالی اپنے مخلصانہ اور حقیقت آمیز نظریہ کی بدولت مروجہ غزل کہنے سے معذور ہو گئے تھے جس محفل سخن کی رونق داغ اور امیر جیسے رنگین بیان غزل گو شعرا کی وجہ سے ہو، وہاں حالی کی بے کیف اور بے رنگ اور بے مزہ غزل کی شنوائی کہاں؟ خود حالی کو اس کا احساس تھا، کہتے ہیں۔

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی الا بیا نہ بس آپ دھرپت زیادہ
ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن مدگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

---

[1] ریاض الاخبار گورکھپور۔ جلد ۲۔ نمبر ۲۵۔ ۲۲ جون ۱۸۸۴ء صفحہ ۵

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

غزل اور قصیدے سے انحراف اسی لئے تھا کہ حالی کی نظر میں یہ دونوں اصناف سخن اب بے وقت کی راگنی ہیں۔ اردو شاعری کو اگر زندہ رہنا ہے تو اسے زمانہ کا ساتھ دینا چاہیئے اور زنانی باتوں کو چھوڑ کر عملی اور مفید باتوں کو بیان کرنا چاہیئے اسے صرف دلی اور لکھنؤ ہی تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اس میں زبان و بیان کی وسعت ہونا چاہیئے۔ حالی نے "دلی کی شاعری کا تنزل" پر جو قطعہ لکھا ہے اپنے اسی نظریہ کو اس میں پیش کیا ہے کہ وہ دن گئے جب زبان پر صرف اہل زبان لکھنؤ اور دلی ہی کا حق تھا اب اگر شعر و شاعری کے لئے اہل زبان کی شرط پر سختی سے پابندی کی جائے گی تو شعر و سخن کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ سخن کے دعویدار یعنی اہل زبان کے نزدیک فن شعر کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس کا کہنے والا شاعر اہل زبان سے ہو۔

شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہل زباں سے ہو جملہ، نہ گئی غیر زبان اسکے دہن کو
اردو کے دھنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں نوکر پنجاب کو مس آسے نہ پورب دکن کو
بلبل ہی کو معلوم ہے انداز چمن کے کیا عالم گلشن کی خزاں زاغ و زغن کو
ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ پہنچے گا نہ وہ ناف آہوئے ختن کو

بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ اہل زبان ہی زبان کی باریکیوں سے کما حقہٗ واقف ہوتے ہیں غیر اہل زبان باوجود اپنے تمام فضل و کمال کے ان کی برابری نہیں کر سکتے لیکن سوال یہ ہے کہ اہل زبان ہونے کے بعد بھی اگر زبان و بیان میں وسعت و جامعیت نہ ہو اور اس میں زندگی و حرکت نہ پائی جائے تو کیا فائدہ؟ ایسی زبان اور اہل زبان کی موت یقینی ہے۔ حالی نے اپنے دوست کی زبانی اہل زبان کے چند اشعار کا ذکر کر کے دریافت کیا ہے۔

"کیوں صاحب! عزت ای اردو سے ہے فن کو؟"

پوچھے ہے کہ جب شعر ہیوں مرد کے ہے کیوں آپ لگے ماننے ہالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے اور آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

شاعروں کی لسانی تنگ نظری، باہمی مناقشت و مخالفت، جنبہ داری اور گروہ بندی انانیت و خود پرستی و غیرہ کو حالی شعر و انشا کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے۔

انہوں نے اپنے اس قسم کے خیالات کا اظہار کئی جگہ کیا ہے۔ شعرا کو مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں

[illegible]

Marfat.com

اور جو وہ شاعر ہیں، ہندوستاں کے — شعر و انشا کو ہے خوف زیاں
ایک پیماں میں سے چل سکتا نہیں — دوسرے کا جادوئے حسن بیاں
ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی — پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں؟

اسی طرح "مناظرۂ واعظ و شاعر" (۱۸۸۳ء) میں۔

بالواسطہ شاعر اور واعظ کی زبان سے وہ تمام مروجہ شاعری بیان کر دیتے ہیں جن کی بنیاد پر انھوں نے بعد میں مقدمۂ شعر و شاعری کی تعمیر کھڑی کی تھی۔

مولانا حالی کے تصور نے بستر راحت پر ارباب معنی کی ایک بزم رنگیں منعقد کی اور

تھے فراہم جس قدر اس بزم میں اہل کمال — تھا شرف کا اپنے اپنے فن کے سب کو ادعا

اس بزم میں مولوی جھوٹی فضلی، اور واعظ کے علاوہ، شاعر مروجہ کی تمام جہات اپنی اپنی تعریف کرتی اور "دعوی فضل و براعت اسکو زیبا ہے یہاں" جو کوئی سنید تن کر لیتا ہو تیرے سوا

ہے تصرف میں ہمارے عرصۂ دشت خیال — کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا
رہروی میں ہم کو چشم و گوش پر تکیہ نہیں — ہیں ہمارے بال و پر اندیشۂ فکر رسا
صاف ہوتا ہے یہاں اپنا خس و خاشاک سے — پاک ہو جیسے دل صاحب دلاں اہل صفا

اتفاقاً گر کسی کی مدح پر آ جائیں ہم — خاطر دشمن میں اس کا نقش الفت دیں مٹا
گر کریں ہم گلرخوں کی بے وفائی کا بیاں — ہو نہ بلبل پھر چمن میں اور گل پر مبتلا

گرمی بزم سخن یاراں ہے، ہماری ذات سے — یاد گلگوں کا ہے ہر بادہ پیما میں مزا
کچھ نہیں اپنا ضرر گر ہو روایت میں خلل — جھوٹ کی ہوتی ہے یاں رونق عبادت کو سوا
دی نہیں گویا شریعت نے ہمیں آکلیف کچھ — [illegible]

شاعری یا بادخوانی، اور ہذیاں سرائی، سننے کے بعد واعظ نے شعر و شاعری کے [illegible] اور شاعر کے خیالات بلند کی ایک ایک خصوصیت گنا دی۔ اور ان سب [illegible]

وہ شاعر میں جس کا یہ اطلق نام ہے — [illegible]
واعظ جب اپنے دل کا سخن نکال چکا تو
شاعر نے کہا بس اے خدنگ اندا بس — ہے زبان تیرے [illegible]

[illegible] صفحہ [illegible] [illegible] صفحہ ۹۸

Marfat.com

اور اس کے بعد شاعر نے جو واعظ کی خبر لی ہے اور اس کی قلعی کھولی ہے، گو واعظ کے ہوش وحواس جاتے رہے، وہ دل ہی دل میں بہت پچھتایا کہ ناحق اس نے اس بے ادب کو چھیڑ کر درد سر مول لے لیا بحث کو ختم کرنے کے لیے شاعر کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ کر اس نے سنجیدگی کے ساتھ ہم سے دریافت کیا تھا۔

آپ نے دیوان مرتب کیوں نہیں اب تک کیا؟
ہے غزل میں آپ کی دیوان حافظ کا مزا
ورنہ میں کیا اور میرا مجموعۂ اشعار کیا
شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا؟

اس حکایت کے بعد حالی نے اپنا نظریۂ شاعری پیش کر دیا۔

کہہ گئے ہیں اہل دل وضع مناسب اختیار
اسی 'وضع مناسب' کا نتیجہ تھا کہ حالی نے رنگین بیانی چھوڑ کر سادگی اختیار کی تھی۔

بولنا آئے نہ جب رنگین بیانوں کی طرح
لیکن اس سادگی میں جو حسن، شوخی، رعنائی و زیبائی، خلوص و صداقت، سب کچھ ہوتا ہے وہ ان کے سپاٹ الفاظ بھی دل میں چٹکیاں لیتے ہیں۔

شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ
ظاہر میں شعر سپاٹ ہوں تو پھر ان کا اثر خام ہے لیکن یہی ایک حقیقت ہے کہ

سجع و تجانس و مراعات النظیر وغیرہ کی ہمیں کچھ حاجت نہیں
یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ قدیم سے شعر و ادب کے ایوانوں کا یہی تو رونا ہے

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
بناوٹ کل میں کل بوٹا کہاں ہے

حالی نے اپنی شاعری کو تکلف و تصنع سے بری رکھنے کا اعلان کیا ہے اور یہ حسن ذاتی ہے اپنے ایک مختصر قطعہ میں جو نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی فرمائش پر لکھا تھا، حالی نے کہا ہے کہ

شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال انشا ہے واں
شعر کہنا ہم نے سیکھا ہے جہاں تا خیر و دیر
گو یہ کوشش ان لطیفوں کے لکھنے میں نہ کی
لاگ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک قصور

لہ مجموعۂ نظر حالی صفحہ ۸۰ - ۸۸

Marfat.com

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں۔ مگر
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں[1]

یہ بات نہیں ہے کہ حالی جھوٹ بولنے اور لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے اور اس زیور سے اپنی شاعری کو آراستہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو بھی حسن طبع پر ناز اور غرور تھا اور ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ

ہم نے دیکھی تمیز اہل نظر ہم نے دیکھا مذاق اہل شعور

اور اس سے انھوں نے جو نتیجہ نکالا اس کی صحت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا

ہے غرض ان کو صوت موزوں سے نالۂ دل ہو یا نوائے طیور

اس لئے انھیں یہ کہنا پڑا کہ

آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ دل اصحاب گو نہ ہو مسرور

اپنے کمال فن کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

در یکتا ہوں اور ہوں بے آب ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور
شرح نقطہ کی گر کروں تحریر تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور
نمک عشق بتاں کریں عشاق مجھ سے سن پائیں گر ستائش حور
گر کروں ذکر لذت طاعات تلخ کر دوں مذاق فسق و فجور

یہ زور کلام اور حالی کو اس کے پُر اثر ہونے پر یقین، صرف اسلئے تھا کہ وہ مبالغہ اور جھوٹ کے بجائے اصلیت اور صداقت پر فریفتہ تھے اسی لئے ان کا یہ دعویٰ بے جا نہیں تھا۔

جس سے ہوتا ہے کور پروانہ ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور[2]

ان کی شمع ادب کے اس لمعۂ نور نے بے بصر پروانوں کو روشنی اور گمراہی کی تاریکی اور ضلالت کو دور کیا ادب کی تاریک، گندی اور متعفن راہوں کو روشن، پاک اور معطر بنایا یہ کام آسان نہیں تھا، نہ ایک دن کا تھا، بلکہ اس کے لئے محنت اور وقت دونوں کی ضرورت تھی۔ یہ احساس حالی کو بھی تھا۔

حالی کیجے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستون ہل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آسان کیے بغیر

ان مشکلوں کو حل کرنے کے لئے انھوں نے متعدد موثر کام کئے۔ مقدمہ شعر و شاعری لکھا جو اردو ادب میں پہلا مضبوط، باقاعدہ، باہمت اور مستحکم قدم تھا جس نے ادبی گمراہیوں سے بچ کر نہ صرف خود چلنے کی کوشش کی بلکہ دوسروں کو بھی آگاہ اور متنبہ کیا کہ اس خطرناک اور پرخا

---

[1] دیوان حالی ص ۱۳۶ [2] دیوان حالی صفحہ ۱۲۲ - ۱۲۳

Marfat.com

راستے کو چھوڑ دو۔ راہ راست اختیار کرو منزل مقصود پر پہونچنا چاہتے ہو تو کجرائی اور کجروی کو چھوڑنا پڑے گا۔ سچائی، راستی اور سادگی کو اختیار کرنے پڑے گا کیونکہ

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

یہ صرف اندیشہ اور خوف ہی نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی کہ ارباب معنی کعبۂ ادب کی طرف جانے کے بجائے ترکستان کا راستہ اختیار کئے ہوئے تھے حالی نے جراءت مندانہ قدم اٹھایا اور شعر و شاعری کے حسن حقیقی کو نمایاں کرنے کے لئے ان تمام نقابوں کو ہٹانے کی کوشش کی جو برسہا برس سے اس کے چہرۂ زیبا پر پڑی ہوئی تھیں مصنوعی حسن کے کوتہ فہم اور کوتہ نظر شیدائی جنہیں ہوئے عشق نہ ہوس میں یہ تمیز انھیں اچھی نہیں معلوم ہوئی وہ اپنے شوخ و رنگیں معبود کی پرستش ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مدافعت اور مخالفت، دشمنی اور عداوت پر کمربستہ ہو گئے لیکن شعر و شاعری کا یہ امام اپنا کام کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسے کامیابی ہوئی اور بالآخر اس نے صحیفۂ شعر و شاعری مکمل کر کے پیروان ادب کے سامنے پیش کر دیا اس صحیفے میں حالی نے شعر و شاعری کے اصول اور نظریے بتائے۔ ایک ایک صنف سخن کے معائب و محاسن پر مفصل بحث کر کے مفید اصلاحی مشورے دیئے درحقیقت مقدمہ نہ صرف حالی کے شعری نظریات کا مکمل صحیفہ ہے بلکہ اردو شاعری میں نقد الشعر پر پہلی کتاب ہے۔ مقدمہ سے حالی کے نظریات کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں۔

"انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ سے شعر و شاعری کے متعلق ایک مکمل اور حیات آفریں نظریہ مرتب کیا پھر اس نظریہ کی روشنی میں اردو شاعری پر تبصرہ کیا"[1]

اردو ادب میں مقدمہ کی اہمیت و افادیت کو سب نے تسلیم کیا ہے یہ مقدمہ

"ان کے حسن ذوق، وسعت نظر، اور جدت خیال کا آئینہ ہے جس میں شعر و شاعری کے اصولوں سے حکیمانہ بحث کی گئی ہے[2]۔ فن شاعری اور اردو شاعری پر اعلیٰ پایہ کی تنقید[3] اور عالمانہ و ناقدانہ تبصرہ ہے۔ نیز فن شعر پر اعلیٰ درجہ کا فلسفیانہ اور محققانہ ریویو ہے[4]"

نوٹ: "حالی کا مقدمہ شعر و شاعری ترقی پسند شاعری کا باقاعدہ اعلان [illegible] کے فنی معنوی، اور عملی تصورات پر یہ پہلا مقالہ ہے۔ اپنے عہد و تاریخ [illegible] کے شعریات، Poetis [illegible] غلب سلدنی کے [illegible] اور اردو [illegible]

---

[1] تنقیدی اشارے ص۲۰ [2] مضامین عابد۔ ڈاکٹر عابد حسین ص۲۰۰

[3] باقیات جنوری۔ عبدالرحمن جنوری ص۲۱۳ [4] ہماری شاعری۔ سید سعود حسن رضوی ص۳

[5] تذکرہ حالی۔ اسماعیل۔ پانی پتی ص۱۱۳

کے Preface to Lyrical Ballad کی حیثیت ہے۔ اس مقالہ میں پہلے پہل اردو شاعری کا جمع خرچ سمجھایا گیا ہے۔ شاعری کی فکریات مرتب کی گئی ہیں۔ پہلے پہل شاعری ا زندگی کا سمبندھ سمجھایا گیا ہے[1]۔ اس طرح "اس عہد آفریں کتاب نے جدید اردو شاعری کو جنم د اور" اس نے اردو شاعری کا انداز ہی بدل دیا[2]" پہلی مرتبہ اردو ادب کو شاعری کے معیار سے آشن کیا[3]۔ کوئی شک نہیں "مقدمہ شعر و شاعری حالی کا عہد آفریں اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے[4]" جس میں شاعری اور شاعری کے فن سے بحث کی گئی ہے[5]۔

ان اقتباسات سے جو مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق سے ہیں، مقدمہ شعر و شاعری کی تاریخی اہمیت، تنقیدی اولیت، اور ادبی افادیت ثابت ہو جاتی ہے اور حالی کے شعری نظریات کی حقیقت و ماہیت واضح ہو جاتی ہے۔ ان کے "خیالات ماخوذ اور ان کی واقفیت [illegible] لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا اس سے ان کی اصابت رائے اور ان کے حسن ذوق، وسعت نظر، اور جدت خیال پر ایمان لانا پڑتا ہے اردو کیا فارسی اور عربی میں اس قسم کی کتاب نہ ہوتے ہوئے انھوں نے شعر و شاعری پر جس عالمانہ، ناقدانہ، حکیمانہ، اور فلسفیانہ انداز سے بحث کی ہے اس سے ان کی ادبی بصیرت، سخن فہمی اور نکتہ شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ مقدمہ ان کے شعری نظریات کا صحیفہ ہے اور ان کلام ان نظریات کی عملی تشریح و توضیح ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شعر و شاعری پر عام بحث کی ہے۔

"شعر کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی تاثیر و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے الفاظ رسانی کی اہمیت و اقدار کی تشریح کی گئی ہے اردو شاعری کے بنیادی اصول مرتب کر کے اس کے لئے ضروری شرائط پیش کئے گئے ہیں جس کی ترتیب و بحث میں عربی معیار نقد کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ مغربی خیالات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے" دوسرے حصے میں اردو کے اہم اصناف سخن کی تعریف و خصوصیات کے ساتھ ان کے صحیح معیار پیش کئے گئے ہیں[6]

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں حسب ذیل عنوانات کے تحت اپنا نظریہ شاعری پیش کیا ہے۔

۱۔ شعر ۲۔ شاعری ۳۔ شاعر ۴۔ چند مقبول اصناف سخن غزل جس میں قطعہ اور رباعی

---

[1] ترقی پسند حالی نیا ادب فراق گورکھپوری صفحہ ۷۔۸ [2] تنقید جدید۔ اختر اورینوی ص ۲۸۲
[3] اردو ہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صفحہ ۸، [4] اردو میں تنقید کا ارتقاء عبدالقیوم نعمانی نگار فروری ۱۹۴۶ء
[5] اردو لٹریچر انیسویں صدی میں۔ سر عبدالقادر ص ۲۹ [6] انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر عبداللطیف ص ۱۰۳
[7] اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد صفحہ ۱۰۹ [8] اردو میں تنقید کا ارتقاء۔ محمد عبدالقیوم نعمانی مجموعہ نگار فروری مارچ ۱۹۴۶ء صفحہ ۹۰

Marfat.com

بھی شامل کرلیا ہے۔ قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی پر بحث۔

شعر کے سلسلہ میں تفصیل بحث کرتے ہوئے اسکی ماہیت، افادیت، اہمیت، تاثیر اور مدح و ذم نیز اس میں وزن و قافیہ کی ضرورت کو متعدد مثالیں دے کر بخوبی واضح کیا ہے۔ مولانا حالی نے شعر و شاعری کا ملکہ فطری بتایا ہے اور تاریخی واقعات سے یہ ثابت کیا ہے کہ شعر و شاعری سے پولیٹیکل معاملات میں بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں۔ شعر کی تاثیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

"شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ سامعین کو اکثر اس سے حزن، انشراح یا جوش یا افسردگی، کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہونچا سکتا ہے۔"[1]

اس سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ حالی شعر سے مفید کام لینا چاہتے تھے، وہ شعر کی ذاتی حیثیت ترقی کی سرگرم کوشش کر رہے تھے وہ اس حقیقت کو بھی جانتے تھے کہ شعر کا تعلق اخلاقیات سے بہت گہرا ہوتا ہے اسلئے اگر شعر مخرب اخلاق ہے، تو یہ سماج کو متاثر ہونا لازمی ہے مولانا حالی کے الفاظ میں:۔

"شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو یا اخلاقی، ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہوجاتے ہیں۔ وہ اندرونی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلا شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں سچ، اور سچ زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کی تاثیر جلد اور پائیدار ہوتی ہے۔"[2]

اسی لئے "شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعال ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق ہی کا ایک شعبہ اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔"[3]

شعر کی افادیت اس کی عظمت، اہمیت اور افادیت کی دلیل ہے شعر کی مثال [illegible] ایک محقق (جان اسٹورٹ مل) کا قول نقل کیا ہے [illegible]

۱۔ شعر خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۰۲ [2] حیات سعدی صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ کریمی پریس لاہور [3] [illegible] صفحہ ۱۱۱

Marfat.com

۲۔ محسوسات کے دائرہ سے نکال کر گذشتہ اور آئندہ حالتوں کو ہماری موجودہ حالت پر غالب کر دیتا ہے۔

۳۔ اس کا اثر محض عقل کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعہ سے اخلاق پر ہوتا ہے۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔

۴۔ قومی افتخار، قومی عزت، عہد و پیماں کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے، استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا اور ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہو سکیں اور اسی قسم کی تمام خصلتیں ..... اگر کسی قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہو جاتیں تو بلا شبہ ان کی بنیاد تو اس میں شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے[1]"

مذکورۂ بالا خصوصیات ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شعر میں حسب ذیل خوبیاں ہوں۔

۱۔ سادہ ہو ۲۔ جوش سے بھرا ہوا ۳۔ اصلیت پر مبنی ہو۔

حالی نے شعر کی یہ تینوں خوبیاں ملٹن کے نظریۂ شعری سے لی ہیں۔ وہ اردو شاعری کو انھیں تینوں خصوصیات اور صفات کا حامل بنانا چاہتے ہیں۔ یہ نظریہ پیش کرتے وقت حالی نے اصل کتاب سے استفادہ نہیں کیا ورنہ "اصلیت، جوش اور سادگی والے فقرے کو اس کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھتے اور ترجمہ میں غلطی نہ کرتے در اصل[2]

"یہ الفاظ ہالرائیڈ کے ذریعہ حالی کے ہاتھ لگے اور انھوں نے ان کو شاعری کے اٹل اصول تصور کیا[3]۔ اگرچہ "سادگی اور جوش Simple Pacsionate کے نہایت مناسب ترجمہ ہیں اور ان کی تشریح کے سلسلے میں جو کچھ بھی حالی نے کہا ہے وہ نہایت صاف، صحیح اور مناسب ہے مگر SENSUOUS کا ترجمہ اصلیت سراسر غلط ہے[4]"

ترجمہ کی یہ غلطی انگریزی پر عبور نہ حاصل ہونے کی وجہ سے ہوئی ورنہ حالی نے مقدمہ کی ترتیب و تشکیل میں بڑی تحقیق و کاوش کی تھی۔ سادگی، اصلیت اور جوش کی علیحدہ علیحدہ تعریف بھی کی ہے۔

۱۔ سادگی سے مراد یہ ہے کہ خیال کیسا ہی بلند و دقیق ہو مگر پیچیدہ نہ ہو اور اس کا اظہار روزمرہ کی بول چال میں کیا جائے۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۱۱۔۱۱۲ [2] مقدمہ شعر و شاعری۔ نوٹ وحید قریشی صفحہ ۱۳۳
[3] اردو میں تنقید ڈاکٹر آسی غازیوتی صفحہ ۵۶ [4] اردو میں تنقید صفحہ ۵۸

۲۔ اصلیت کا مطلب یہ ہے کہ خیال کی بنیاد ایسی شے پر ہو جو درحقیقت وجود رکھتی ہو۔ ایسی تشبیہات نہ استعمال کی جائیں جن کا وجود نہ ہو۔ اصلیت کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ شاعر اپنے سر موتجاوز نہ کرے بلکہ اسے تخیل کے تصرف کا اختیار ہوتا ہے البتہ اصلیت سے تعلق ضرور ہونا چاہیئے۔

۳۔ جوش سے مراد یہ ہے کہ مضمون بے ساختہ الفاظ، اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے۔

ان تینوں خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا حالی نے متعدد مثالیں، سادگی، اصلیت اور جوش پر مشتمل اشعار کی دی ہیں۔ انھوں نے ان کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کوئی شعر سادہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس میں اصلیت اور جوش بھی موجود ہو۔ تجزیہ فرماتے ہیں۔

"اب صرف دو احتمال باقی رہ گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کلام میں صرف جوش پایا جائے، سادگی و اصلیت نہ پائی جائے۔ دوسرے یہ کہ سادگی اور جوش پایا جائے، اصلیت نہ پائی جائے۔ لیکن "جوش کے لئے اصلیت کا ہونا ایسا ضروری ہے کہ بغیر اس کے ہرگز کلام میں جوش متحقق نہیں ہو سکتا پس یہ دونوں صورتیں ممکن الوقوع نہیں ہیں۔"

ملٹن کے شعری نظریئے کے بعد انھوں نے مشرقی اساتذہ کے خیالات و اقوال پیش کئے ہیں مثلاً

اصمعی نے شعر کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کے معنی لفظوں سے پہلے ذہن میں آجائیں"

خلیل بن احمد کے نزدیک عمدہ شعر یہ ہے کہ "سامع کو اس کے شروع ہوتے ہی یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا قافیہ کیا ہوگا"

نہ میرے نزدیک ان کا قول ہے کہ سب سے بہتر شعر جو تر کہہ سکتے ہو وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں کہ یہ ہے"

تینوں کی یہ تینوں باتیں مولانا حالی کے نزدیک ناقص ہیں کیونکہ ان میں سادگی، جوش اور اصلیت ایک ساتھ نہیں ہیں ان کے نزدیک سب سے بہتر شعر وہ ہے کہ شعر جب پڑھا جائے تو

کو یہ خیال ہو کہ ایسا کہہ سکتا ہوں جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو

لیکن ان میں سے ملٹن

[illegible]

اس کے بعد انھوں نے [illegible]

قول [illegible]

۵ [illegible]

Marfat.com

"شعر وہ ہے جو نفس انسانی کی باریک گہری اور پوشیدہ کیفیات کو ظاہر کرے"

شعر شعر کے نزدیک "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لئے کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ نظم میں ہو

نثر میں ہو"

لیکن مولانا حالی نے یہ تعریف بھی نامکمل بتائی ہے اور ان اقوال کے مقابلہ میں لٹن کے قول کو [illegible] اپنے نظریۂ شاعری کی بنیاد اسی کے اقوال کے بموجب یعنی سادگی [illegible] اور جوش [illegible] ان کے علاوہ وہ شعر کیلئے وزن اور قافیہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ [illegible] ان کی وجہ سے [illegible] اور قافیہ کی طرف [illegible] اور اس کی تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے۔

مطلع ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے سے زبان زیادہ لذت پاتی ہے۔

تاہم ان کے نزدیک ان دونوں پر سختی کے ساتھ پابندی نہ کرنا چاہیے اس سے شاعر کے [illegible] وافیہ اور وزن کے محتاج ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے یہ فیصلہ کیا۔

"اگر وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دار و مدار ہے اور جن کے بغیر اب [illegible] کوئی نظم صورت آج نہیں پائی جاتی جس کے سبب سے شعر پر شعر کا اطلاق کیا جا سکے۔ وہ شعر کی ماہیت سے خارج ہیں"

لیکن وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وزن و قافیہ کے بغیر شعر کی دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔

[illegible] جب سے بڑا کوشش تر کو اعتراض کا نشانہ زیادہ دلفریب اور [illegible] کرتا ہے

[illegible] قافیہ سے یہ ظاہر ہے کہ شعر [illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible]

دوسری مغربی تصریحات پر نظر رکھنے کے علاوہ شعر کی مغربی تعریفوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ [illegible] حالی نے شعر کے ساتھ ساتھ شاعری اور اس کی تاثیر کا بھی ذکر کیا ہے شاعری کے [illegible] اخلاق اور مذہب اور مذہب وغیرہ سے کیا تعلق ہے؟ اور ان سب پر اس کے اور شاعر [illegible] مغربی نقادوں کے اقوال مغرب سے آتے ہیں یا انگریزی اور یورپی شاعری کی پہچان کیا ہے شاعری کے [illegible] اور شاعری کی ترقی کے امکانات کیا ہیں؟ یہ [illegible] شاعری کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

ترقی کیسے ہو سکتی ہے؟ ان سب موضوعات پر مفصل اور مبسوط بحث کی ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری
علاوہ مختلف دیگر تصانیف۔ حیات سعدی، یادگار غالب، مکاتیب اور مضامین حالی
پانچوں اور مضامین بھی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان
سے مولانا حالی نے یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری کا ملک بیکار نہیں ہے بلکہ ہدایت، تہذیب اور اخلاق کا بہت بڑا
ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ ہر زمانے میں ہر ملک میں، اور ہر قوم میں رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

"دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کو قدرت نے شاعری کا
ملکہ دیا تھا اور یہ ملکہ ان کی طبیعت میں ودیعت رکھا تھا۔ اگرچہ اکثر نے اس ملکہ کو قدرت
فطرت کے خلاف استعمال کیا پس ایک ایسے عطیہ کو جو قدرت نے عنایت کیا تھا دور صرف اس
وجہ سے کہ اکثر لوگ اس کو فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں کسی طرح بحث اور ہیکار نہیں
کہا جا سکتا۔"[1]

یادگار غالب میں فرماتے ہیں:۔

"اعلیٰ درجہ کا ملکہ شاعری کسی خاص زمانہ یا ملک کے ساتھ مخصوصیت نہیں رکھتا۔۔۔ ملکہ
شاعری کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسی مصور کی قابلیت یا سریلی آواز جس طرح ان دونوں صفات
کا ہر زمانے اور ہر ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پایا جانا ممکن ہے اسی طرح اعلیٰ درجہ کا ملکہ شاعری
ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور شانوں میں ظہور کرتا ہے اور
سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈالتا ہے وہ سوسائٹی کا مذاق
اور اس کا مذاق ہے۔"[2]

چونکہ سوسائٹی یا سماج کا دباؤ اور اس کا مذاق یا رجحان شاعری پر اثر انداز ہوتا ہے اور شاعر
کے خیالات کو متاثر کرتا ہے اسلئے جیسی سوسائٹی ہوگی، اسی قسم کی شاعری بھی ہوگی۔ سوسائٹی اگر خراب
ہے تو شاعری بھی خراب اور ناکارہ ہو سکتی ہے۔ بری شاعری سے لٹریچر اور زبان پر اثر پڑتا ہے۔

"سب سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے یا اس کے محدود ہو جانے سے ملک کو
ہے وہ اس کے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی ہے۔"[3]

اس لئے اچھی شاعری کے لئے اچھی سوسائٹی کی ضرورت ہے۔

"شاعری کی اصلی ترقی کا مدار ملک کی عام شائستگی اور تعلیم پر ہے کیونکہ شعراء کو جس قدر
شائستہ اور نکتہ فہم مخاطب میسر آتے ہیں اسی قدر ان کے خیالات شائستہ اور نازک ہوں گے۔"

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۹۹ [2] یادگار غالب صفحہ ۲۰۴-۳۰۴۔ لالہ رام دیال اگروال الہ آباد ۱۹۲۷ء
[3] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۲۲

Marfat.com

جاتے ہیں۔

اسی بناء پر زمانہ کو عربی میں "افصح المولدین" اور انگریزی میں "گریٹ ریفارمر" کہا گیا ہے۔

دوسری چیز جو شاعری کو شگفتہ اور بارآور کرتی ہے وہ قومی سلطنت ہے جس ملک میں یہ دونوں صورتیں نہیں ہوتیں، تو شاعری کی اصلی ترقی ناممکن ہوتی ہے[1]"

اس طرح حالی اس رائے کے ہرگز قائل نہیں ہیں کہ "شاعری ناشائستگی کے زمانہ میں ترقی پاتی ہے" بلکہ وہ مقدمہ کی اشاعت سے بارہ برس پہلے "شاعری کی ترقی کا مدار شائستگی اور تعلیم" قرار دے چکے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ حالی پیروی مغربی کی قسم کھا چکے تھے۔ قریشی صاحب کے ان الفاظ میں صداقت کے بجائے نشتریت زیادہ ہے۔

"مشکل یہ تھی کہ ہر دو آرا (شاعری شائستگی کے زمانہ میں ترقی پاتی ہے یا ناشائستگی کے زمانے میں) مغرب سے آئی تھیں جس کی پیروی کی انھوں نے قسم کھا رکھی تھی۔ مرحلہ نازک تھا لیکن فیصلہ قطعی۔ اس لئے دونوں کو خوش کرنے کے خیال سے اور احترام کی خاطر انھوں نے درمیان کی راہ نکالی کہ پہلی بات بھی کسی قدر صحیح ہے اور دوسری بھی[2]"

انھوں نے درمیانی راہ نہ تو دونوں کو خوش کرنے کے لئے نکالی، نہ محض احترام کی خاطر، دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں لیکن مغربی پیروی کی قسم کھانے والے حالی نے صاف صاف لکھ دیا کہ۔

"شاعری کی اصلی ترقی کا مدار ملک کی عام شائستگی اور تعلیم پر ہے"

اس مسئلہ میں سید احتشام حسین کی رائے درست اور صحیح ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"حالی نے مشرق و مغرب کے کسی اصول اور خیال کو بغیر غور و فکر کے آنکھیں بند کر کے نہیں قبول کر لیا۔ یہی ان کی سلامت نظر کی دلیل ہے[3]"

شاعری میں تقلید سے بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بگاڑ سوسائٹی کو بھی متاثر کرتا ہے، زبان اور ادب کو بھی، اسلئے شاعری کو اس اندھی تقلید سے بچانا اولین فرض ہے۔ شاعری کی اصلاح کے لئے بھی غور و فکر اور جد و جہد کرنا چاہیئے جس کے لئے یہ ضروری ہے کہ

۱۔ جہاں تک ممکن ہو عمدہ نمونے پبلک میں شائع کئے جائیں۔

۲۔ شعر کی حقیقت کو واضح و نمایاں کیا جائے۔

۳۔ شاعر بننے کے لئے جو شرطیں درکار ہیں ان کو مفصل بیان کیا جائے۔

شاعری میں کمال حاصل کرنے کیلئے حسب ذیل شرطیں ضروری ہیں۔

---

[1] تقریظ آب حیات مقالات حالی جلد دوم صفحہ ۱۴۹ [2] مقدمہ شعر و شاعری۔ حالی کی تنقید ص ۲
[3] حالی اور ان کا عہد (قومی آواز میگزین صفحہ سکشن۔

Marfat.com

۱۔ تخئیل یعنی قوت متخیلہ ۲۔ کائنات کا مطالعہ ۔ ۳۔ تفحص الفاظ

تخئیل یعنی قوت متخیلہ ۔ یہ قوت شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری بھی اعلیٰ درجہ کی ہوگی ۔ یہ ملکہ فطری ہوتا ہے اور شاعری کی بنیاد اسی ملکہ پر ہوتی ہے ۔ مولانا حالی لکھتے ہیں ۔

"اگر یہ ملکہ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے[1]"

۲۔ کائنات کا مطالعہ ۔ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ دوسری شرط ہے ۔

"قوت متخیلہ کوئی شئے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتی بلکہ جو مصالحہ اس کو خارج سے ملتا ہے اس میں وہ اپنا تصرف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے[2]"

اسلئے "شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخہ کائنات اور خاص کر نسخہ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے ۔ یعنی

۱۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا

۲۔ جو امور مشاہدہ میں آئیں ان کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی ۔

۳۔ گہری نظر سے کائنات میں وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہیں ۔

۴۔ مشق و مہارت سے فکر میں یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد، اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے[3]"

۳۔ تفحص الفاظ ۔ قوت متخیلہ اور کائنات کے مطالعہ کے بعد تیسری شرط تفحص الفاظ ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شعر کی ترتیب کے وقت اول تناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے [illegible] اس کے اس ترتیب میں ایک جادو بھی پیدا ہو جو مخاطب کو متحیر کر دے ۔

ان تمام خصوصیات کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

"شاعر زبان کے خزانہ پر حاوی ہو اور ترتیب شعر کے وقت سب و اشکال کے ساتھ الفاظ کو تولے اور تفحص کرے ۔ اسلئے فکر شعر کے وقت ان امور کا لحاظ رکھنا چاہیے

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی صفحات ۱۳۳ - ۱۳۹ - ۱۴۷ - ۱۴۸ - ۱۶۱ - ۱۶۶ علی الترتیب

Marfat.com

۱۔ خیالات کو عمدہ تخیل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا، ان کو جانچنا اور تولنا
۲۔ ادائے معنی کے لحاظ سے جو قصور رہ جائے اس کو رفع کرنا۔
۳۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورتاً اکثر نثر سے متمیز ہو مگر معنیً اسی قدر ادا کرے۔
جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکتے ہیں"

مولانا حالی نے متعدد مثالوں سے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ
"شاعری کا کمال محض الفاظ میں ہے معانی میں ہرگز نہیں"[1]

جب لفظی اور معنوی اعتبار سے شاعری فطرت کے مطابق ہوتی ہے تو اسے نیچرل شاعری کہا جاتا ہے۔ نیچرل شاعری کی لفظی و معنوی اعتبار سے تشریح کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں کہ
لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔
نیچر کے معنی موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ دنیا میں ہمیشہ ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں[2]"

مقدمہ شعر و شاعری سے پہلے مولانا حالی نے حیات سعدی مطبوعہ ۱۸۸۴ء میں شاعری کی بنیاد چار چیزوں پر بتائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔
۱۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت واقعیہ پر نہ کہ اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔
۲۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالاپن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔
۳۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کئے جائیں، کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو۔ اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرہ شاعری سے خارج ہوگا۔
۴۔ شاعر کے دل میں جبکہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہو کم و بیش اسی مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیئے ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا[3]"

یہ باتیں قریب قریب وہی ہیں جو بعد میں مقدمہ شعر و شاعری میں پیش کی گئیں کسی قدر الفاظ کا الٹ پھیر ضرور ہے۔ شاعر بننے کیلئے بھی حالی نے اسی قسم کی شرطیں لکھی ہیں۔ شعر، شاعری اور

---

[1] تا [3] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۸۴ - ۱۸۵
[4] حیات سعدی صفحہ ۲۲۲

Marfat.com

شاعر۔ یہ تینوں باہم اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ جدا نہیں کئے جا سکتے ان کی خصوصیات بھی باہم ملتی جلتی ہیں۔ یہ خصوصیات ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ شاعر کی تخلیق شعر ہے اور اس کا فن شاعری ہے۔ اچھا فن کار وہی ہو سکتا ہے جو اپنے فن پر پورا پورا عبور رکھتا ہو اور جب اس کو اپنے فن پر عبور حاصل ہوگا تو اس کی تخلیق بھی بہتر اور عمدہ ہوگی۔ حالی نے فن شاعری کے لئے دو چیزیں ضروری اور لازمی بتائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے۔

۱۔ قوت متخیلہ کی بلند پروازی۔

۲۔ دوسرے مناسب الفاظ کا انتخاب۔"

جس شاعر میں یہ دونوں لیاقتیں بدرجہ اتم موجود ہوں وہ اعلیٰ شاعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ شاعر کے لئے بھی سب سے پہلی اور ضروری [illegible]

"سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت متخیلہ یا تخیل ہے۔

قوت متخیلہ خداداد اور وہبی قوت ہے۔ اس لئے شاعری بھی وہبی ہے [illegible] یا فروعی چیز نہیں ہے۔ الشعراء تلامیذ الرحمٰن اس لئے کہا گیا ہے شاعر [illegible] پیدا ہوتا ہے، پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شاعر

[illegible] صرف اسی قدر کافی ہے اور بس۔

[illegible] دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ [illegible] کامرانی ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ زبان اور دوسری [illegible] استعمال کرنا چاہئے۔

[illegible]

[illegible] ۱۸۲

[illegible]

Marfat.com

چوتھی بات یہ ہے کہ "جہاں تک ممکن ہو کسی مضمون کے لکھنے پر اسوقت تک قلم اٹھانی نہیں چاہیئے جبتک کہ اس کی چٹکی دل کو نہ لگی ہو کسی کی رئیس سے کسی کی فرمائش سے کسی کے دباؤ سے یا کسی اور مجبوری کے سبب، بغیر اقتضائے طبیعی اور ولولہ باطنی کے جو شعر کہا جائیگا یا جو نظم سرانجام کی جائے گی اس میں اثر اور زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے"[1]۔

اسی لئے یہ ضروری ہے کہ جس وقت شاعر کا آبگینۂ دل تندی صہبا سے پگھلنے لگے اسی وقت وہ شاعری کے سانچے میں اس کو ڈھال لے۔ یہ سانچے مختلف و متضاد ہو سکتے ہیں۔ مولانا حالی کے الفاظ میں

"شاعر کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اسکے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اس کے دل کو بے چین کر دے۔ اسکو اسی طرح بیان کرے پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اسکو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے"[2]۔

اس طرح "حالی کے بیان اسلوب اور طرز ادا میں لطافت اور شعری کمالات پر اتنا زور نہیں جتنا حقیقت واقعہ اور صداقت اظہار پر ہے"[3]۔

حالی نے اسی لئے فصحا و بلغا کے انداز بیان کی پیروی نہیں کی اور اپنے طرز کی بے کیفی کو جانتے ہوئے بھی تمام عمر اس کو نباہتے رہے اور حقیقت نگاری پر زور دیتے رہے۔

اسی نظریہ اور خیال کی تائید ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"مختصر یہ کہ حالی کی خاص اصلاح اردو شاعری میں، صداقت اور خلوص کو پیش کرنا ہے جن سے قدیم شاعری (قریب قریب) بے بہرہ تھی"[4]۔

حالی نے نظم میں صداقت، سادگی و سچائی، جوش و ولولہ، شعر و شاعری کے لئے بھی ضروری سمجھا اور شاعر کے لئے بھی۔ اردو شاعری کی چند اصناف سخن۔ غزل جس میں قطعہ و رباعی بھی شامل ہے، قصیدہ مرثیہ اور مثنوی کو اسی معیار پر جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی اور کھوٹے کھرے کی پہچان بتائی۔ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ

حالی ہی کے اثر سے یہ خیال عام ہوا کہ شاعری میں اصلیت اور سادگی کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

انجمن پنجاب اردو شاعری کی ہر صنف سخن کا تجزیہ کر کے بتایا کہ عام طور سے وہی اصناف زندہ رہتے ہیں جن میں اصلیت، سادگی اور شاعرانہ کی کارفرمائی ہے[5]۔

حالی کے تنقیدی نظریات کا خلاصہ یہی ہے۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۲۰۴ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۵ [3] حالی اور سرسید کا نظریہ شعر و شاعری صفحہ ۹۵ سید احتشام حسین

[4] The Spirit and Substance of Urdu Poetry ... Dr. Syed Abdullah ... Syed Ahmad Khan ... Page 142

[5] حالی اور انجمن پنجاب ... آزاد اور سرسید ... سید احتشام حسین۔

Marfat.com

باب چہارم

حالی کی شاعری

حالی کے نظریاتِ شعری کی روشنی میں مختصر مسدس، مدوجزر اسلام

غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی پر تبصرہ

اور مسدس کا تفصیلی جائزہ

Marfat.com

ترتیب

تعارف	۱۷۹
غزلیات	۱۸۲
قصائد	۱۹۷
مثنویات	۲۰۵
مراثی	۲۲۵
رباعیات	۲۳۳
قطعات	۲۳۹
ترکیب بند	۲۴۷
مسدس	۲۶۱
جائزہ	۲۷۲

Marfat.com

حالی کی شاعری

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے　　کچھ رنگ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

حالی کو شعر و شاعری کا ملکہ استاد ازل کی بارگاہ سے عطا ہوا تھا وہ فطری اور حقیقی شاعر تھے اور ہر فطری شاعر کے لئے۔

"دل میں ایک درد، طبیعت میں ایک مزہ، ذہن میں ایک توازن، فکر میں ایک لطافت ہونا ضروری ہے۔ مولانا میں یہ سب باتیں تھیں، سب کچھ کہہ دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ سمجھنا، مزہ لینا، جانچنا، پرکھنا، شعر گوئی سے زیادہ شاعری ہے"[1]

ان کا رنگ بیان، سب شاعروں سے، اسی لئے جدا تھا کہ ازلی مناسبت ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کوچۂ شاعری میں سوچ سمجھ کر قدم رکھا تھا جس خضر ادب نے انھیں یہ راہ دکھائی تھی اور جس ادب شناس و ادب نواز کی صحبت سے وہ مستفیض ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخن کے تجربہ کار اور بے مثل جوہری بن گئے۔

سب سے پہلے انھوں نے اردو شعر و ادب کا جائزہ لیا اور اسے کذب و افترا و دقت انگیز غموں میں سنڈاس سے بدتر، بتا کر غرقاب کرنے کا مشورہ دیا اور اسلاف کی پیروی کرنے سے علی الاعلان مخالفت کی۔

سخن میں پیروی کی گر سلف کی　　انھیں باتوں کو دھرانا پڑے گا

یہ باتیں نہ تو زمانے کے موافق تھیں، نہ زندگی سے کوئی تعلق رکھتی تھیں بلکہ انھیں باتوں کی وجہ سے اردو کا بیشتر سرمایۂ ادب اور اس سے متاثر ہونے والے افراد قوم مرتیا ہی کے دل میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ پورا سرمایہ کذب و افترا اور کذب حق نما کی بضاعت سے زیادہ [illegible] اپنی فطری صلاحیتوں اور اپنے ذوق سلیم سے کام لے کر، اس کا جائزہ لیا [illegible] بنانے کے لئے جرأت مندانہ قدم اٹھایا کوئی شک نہیں یہ راہ [illegible] انھوں نے کس انسکاب پر حاصل کئے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں　　جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

[1] عالمگیر لاہور خاص نمبر جنوری ۱۹۳۷ء صفحہ ۵۲۔ حامد حسن قادری

Marfat.com

وہ ہمت ہار بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اک حرف آشنا، ان کے دل کو وجد میں لاکر ان کا ذوق سخن بیدار
اور ان کی نظر کو اس بات پر آمادہ کرتا رہتا تھا کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش
کرتی رہے۔ اس ذوق سخن اور جذبۂ تلاش نے حالی کے شعر کو متاع بے بہا اور گوہر نایاب بنا دیا
ان کے ذوق سخن کی بیداری نے اردو شاعری کو موت کی نیند سے جگا کر اس کے متعفن اور مردہ جسم میں
تازہ و صحت بخش خون دوڑا کر اسے نئی زندگی بخشی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ

جگر خون کی ہے خود جگر سے نمود

اسی لئے انھوں نے اپنے خون جگر سے، اور دوا دے کر نہیں کی آبیاری کی اسے سرسبز شاداب اور سدا بہار
[illegible] اور ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر اس نے نئی زندگی پائی۔ زمانے کے حادثات نے ان کے سوز و گداز
[illegible] اور ان کے تخیل کو بیدار کیا۔ جذبات و خیالات الفاظ کا پیکر بنے اور شعر کے قالب میں
ڈھل کر ایسا مؤثر کلام بن گئے کہ ان کا سخن سے متحد ایک نئے ڈھنگ اور نئے رنگ سے ظاہر ہوئے۔
مثنوی نویسی اختراع کیا ہے۔

شاعروں کی بھیڑ میں سیدا آنکھ کیچے ہوئے درد مندوں کا ہے دکھڑا اور یہاں سب سے الگ

ان کی درد مندوں کا دکھڑا اور یہ ان کی دوکان شاعری کا نایاب مال ہے جس کو صنف وار پیش کرنے
کی یہاں کوشش کی جائے گی اور انھیں کے نظریہ شاعری کے مطابق جائزہ لیا جائے گا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ حالی کی شاعری کا آغاز قدیم رنگ سخن سے ہوا۔ پہلے پہل انھوں نے بھی غزلیہ
نکھیں لیکن مسدس مدوجزر اسلام کے علاوہ ۱۸۷۴ء سے قبل ان کی کوئی جدید نظم نہیں ملتی۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں
نے غالب کا مرتبہ مرتب کیا۔ یہ دیوان اردو شاعری میں ایک انقلابی حیثیت رکھتا ہے ۱۸۷۴ء میں انھوں نے
لاہور کے مشاعرے کے لئے برکھا رت لکھی۔ یہ نظم شاعری کی طرف توجہ دلانے والی پہلی نظم ہے وہ غزل
کی دنیا سے نکل کر جدید شاعری کی دنیا میں داخل ہوئے۔ ویسے تو نظریاتی اعتبار سے وہ اردو شاعری
کے قدیم دور سے وابستہ رہے۔ پہلے وہ مشاعروں اور دلی ہوا خواہوں پر اشعار سنا چکے تھے۔ سرسید کی ملاقات اور ان
کی تحریک میں شرکت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ان کا رنگ سخن بدلا۔ عشقیہ شاعری کی جگہ قومی شاعری
قومی شاعری اور اصلاحی شاعری نے لے لی۔ ان کی زیادہ تر توجہ اصلاح ملت کی طرف رہی۔ انھوں
نے آخر وقت تک اپنے کلام سے یہی کام لیا اسی لئے ان کی شاعری پر مقصدیت کا غلبہ ہو گیا۔

حالی کی شاعری کا میدان وسیع ہے۔ انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مرثیہ،
[illegible] اور ہر موضوع حیات [illegible] عشق و حسن، وعظ و پند، اخلاق، [illegible]
[illegible] کی شاعری میں کورانہ تقلید کے بجائے اجتہاد سے کام
لیا ہے [illegible] خیالات اور ہر ایک جذبات کا مجموعہ تھی۔ حالی نے اس کو بلند خیالات

[illegible] راعلی جذبات کا حامل بنانے کے لیے اصلاح کی طرف قدم اٹھایا۔ اس اہم مقصد کی تکمیل میں انھیں
[illegible] سخت دشواریاں اٹھانی پڑیں۔ وہ مشرقی ادب خصوصاً عربی و فارسی شعر و ادب کا جائزہ لینے کیلئے کافی
[illegible] مدت تک گہرا مطالعہ کرتے رہے، مغربی علوم سے وہ ناواقف تھے مگر لاہور کے قیام اور مغربی زبانوں
[illegible] کتابوں کے اردو ترجمہ کی اصلاح کرتے رہنے سے انھیں مغربی ادب کے خیالات و نظریات سے
[illegible] واسطہ واقفیت ہوتی گئی۔ ان کی نکتہ شناس طبیعت نے مغربی نظریات شعری کو بڑی حد تک سمجھ لیا۔
[illegible] الی کا نظریہ شعری مشرق و مغرب کے صالح نظریات کا سنگم ہے جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا
[illegible] ان نظریات پر عمل کر کے حالی نے اردو شاعری کو حیات نو بخشی۔ یہ تعمیر بغیر کسی ترمیم یا تخریب کے ممکن
[illegible] تھی اسلئے انھوں نے اردو شاعری کا مشہور و مقبول عام اصناف پر نا قدانہ نظر ڈالی اور اصلاح کیلئے
[illegible] قدم اٹھایا۔ حالی نے اردو شاعری کے پیکر (FORM) کو بدلنے کا مشورہ نہیں دیا۔ نہ جدید خیالات کا یہ
[illegible] طلب بتایا کہ وہ

"کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں یا کسی کے ذہن کی اڑان تک رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے نئے
خیالات مراد ہیں جو شاعر و انشاء کے لیے ہمیشہ گذرتے ہیں اور جن تک انکی نظر پہنچتی ہے"

ان کا یہی عقیدہ تھا کہ متاخرین متقدمین کے خیالات سے تو دستبردار ہو سکتے ہیں لیکن ان کے
انداز بیان سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔

"یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعراء کے بعض خیالات کی پیروی سے دستبردار ہو جائیں مگر ان
کے طریقہ بیان سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔"

[illegible] حالی نے اردو شاعری کی [illegible] کی ساخت میں ہو کوئی تبدیلی
نہیں کی البتہ [illegible] شاعری [illegible] کے پابند [illegible] کے مقید اور ضروری
[illegible] آمد کیا کہ ہر شیدائے [illegible] کی طرح انھوں نے ایسا ہی شاعری کی مقبول ترین چیزوں یعنی
نظم و غزل کو [illegible] شاعری کی آرائش انھیں چیزوں سے کی گئی تھی یعنی
۱۔ غزل جس میں قطعہ و رباعی کو بھی شامل کر لیا ہے ۲۔ قصیدہ اسی کے تحت مرثیہ کا ذکر ہے۔ ۳۔ مثنوی۔

ان اصناف سخن کے علاوہ دوسری اصناف سخن۔ مسدس، مخمس، ترکیب بند وغیرہ کا ذکر بھی نہیں
کیا ہے نظموں کے سلسلے میں تبدیل شاعری یا جدید شاعری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ ہم ان کے کلام پر تنقید
جائزہ لے رہے ہیں اسلئے تبدیل شاعری کا ذکر بھی نظموں کے تحت کریں گے۔ حالی نے اپنے اصناف سخن پر
اظہار خیال کیا ہے۔

غزل قصیدہ مثنوی وغیرہ [illegible] ہیں [illegible] ان میں [illegible] ہیں [illegible] اور [illegible]

---

۱ ۲ دیباچہ دیوان حالی صفحہ [illegible]

Marfat.com

غزلیات

اردو شاعری میں غزل کو جو محبوبیت و قبولیت حاصل ہے وہ کسی دوسری صنف کو نہ
دلوں پر اسی کی حکومت تھی اسلئے حالی نے سب سے پہلے غزل کی طرف توجہ کی اور اس کے لئے حسب ذ
مشورے دیئے۔

۱۔ "غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی
اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی و روحانی تعلقات پر حاوی ہوں"[1]

۲۔ "عشقیہ مضامین کی طرح خمریات بھی غزل کے اجزائے لاینفک ہیں۔ خمریات اور اسکے
لوازمات ذکر کرکے ساتھ ساتھ فقہاء و زہاد اور تمام اہل ظاہر پر طعن و تعریض اپنی مے خواری
و توبہ شکنی و اخراجات نشاط پر فخر، اہل شرع اور اہل تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنا۔
یہ اور اسی قسم کے مضامین غزل کے خمیر میں داخل ہو گئے ہیں"[2]

لیکن "اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہیئے
جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور مجازد
استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں"[3]

ایک اور صورت میں بھی یہ مضامین ادا کئے جا سکتے ہیں۔

"نکتہ چینی ایسے طریقے سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان
کرنی مقصود ہے نہ کہ زہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا"[4]

۳۔ "مذکورۂ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا
منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت، یا ندامت، یا شکر..... یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں
سے اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں"[5]

۴۔ "ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں
بیان ہو سکتے ہیں"[6]

مولانا حالی نے رباعی اور قطعہ کو بھی غزل کی ذیل میں داخل کیا ہے۔

---

[1] تا [6] مقدمہ شعر و شاعری صفحات ۲۱۱-۲۱۳-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸۔

Marfat.com

"ایک خاص مناسبت کی وجہ سے رباعی اور قطعہ کو غزل کی ذیل میں داخل کرتے ہیں"
ل کے مضامین کے ساتھ ساتھ مولانا نے اس کی زبان اور بیان کی صفائی اور پاکیزگی
ب ذیل باتیں بتائی ہیں :-

۱۔ غزل میں ہر قسم کے لطیف اور پاکیزہ خیالات بیان کئے جائیں۔ اس کا مقصد انسانی جذبات کے اظہار کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے اس کو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو۔[۲]

۲۔ "نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اوّل اوّل اسی زبان اور روزمرہ میں ادا ہونے چاہئیں۔ جس میں پرانے اور پست خیالات ادا کئے جاتے تھے۔"[۳]

۳۔ "سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کئے جائیں اور غیر مانوس الفاظ کم برتے جائیں مگر نامعلوم طور پر رفتہ رفتہ ان کو بڑھاتے رہیں اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور معمولی الفاظ و محاورہ پر رکھیں۔"[۴]

۴۔ "الفاظ کے حقیقی معنوں پر قناعت کرنے کے بجائے کبھی حقیقی و مجازی کبھی استعارہ و کنایہ، کبھی تمثیل کے پیرایہ میں استعمال کریں تاکہ مضمون میں آب و تاب پیدا ہو۔"[۵]

۵۔ "استعارہ اور تشبیہ باہم روح اور قالب ہیں۔ کنایہ اور تمثیل بھی استعارہ ہی کے قریب قریب ہے بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان ان کو ادا کرتے وقت رد دیتی ہے اور معمولی اسلوب ان میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں ایسے مقام پر اگر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل سے مدد لی جائے تو شعر شعر رہتا بلکہ معنی با حقیقت بن جاتے ہیں۔"[۶]

۶۔ ردیف و قافیہ کی پابندی تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے ضروری چیز ہے اور مواد روح کو جسم بشکل سلیقے سے باندھا جائے تو حسن پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً پرہیز کرنا چاہئے۔

۸۔ مشکل اور زمین ترک کرنا چاہئے۔ ردیف ایسی اختیار کرنا چاہئے جو قافیہ سے مل کر جملہ بنتی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں۔ مرد قت غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور مرد سست نص تا غزل کہنی چاہئے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہئے جس کے لئے تکلف و زحمت سے دشت کئے بلکہ قافیہ کے لئے زیادہ الفاظ موجود ہوں۔[۷]

اقتباسات بالا سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا حالی غزل کو مواد ہوس سے بچا کر حسن

---

[۲] تا [۷] مقدمہ شاعری صفحات ۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۵-۲۵۰-۲۵۵-۲۶۰

Marfat.com

صادق اور تمام اعلیٰ انسانی جذبات کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔ وہ الفاظ کا استعمال اور خیالات کا اظہار فطری طور پر پسند کرتے تھے صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کی بھرمار کے خلاف تھے مختصر اور بہ آسان مدلل و قافیہ۔ روزمرہ اور محاورہ کی پابندی اور سلیس اسلوب کو آخر تک اختیار کرنے کے موافق تھے۔ وہ اپنی

"فطری صلاحیت، میر اور سعدی جیسے شاعروں کے روحانی فیض اور غالب و شیفتہ جیسے صاحب ذوق شعرا کی صحبت اور تربیت کی بدولت حالی اس میدان میں بھی بڑی حد تک کامیاب رہے۔ انھوں نے اپنے روحانی استادوں اور زندہ استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ کیا تھا۔ میر سے درد دل لیا اور درد کے تصور کی جانب سے حسن تخیل، ندرت فکر اور شوخی کو نکھار سیکھی اور سعدی سے بیان کی سادگی اور شوخی کی گہرائی اور شیفتہ سے سیدھی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانے کا فن اور ان سب کی ترکیب سے حالی کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا۔"[1]

حالی کی جملہ غزلیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلا حصہ قدیم غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ غزلیں

"ایام جوانی یا اس زمانہ کی تصنیف ہیں جب حالی پر تغیرات زمانہ کا اثر نہ پڑا تھا۔"[2]

اور "وہ عاشقانہ غزلیں لکھنے سے پرہیز نہ کرتے تھے گو اس میں بھی اپنی متانت کو ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔"[3]

قدیم غزلوں کے زمانہ کو ہم زیادہ سے زیادہ قیام لاہور کے زمانے تک مقرر کر سکتے ہیں۔ لاہور کے قیام میں انھیں مغربی ادب سے آگاہی ہوئی۔ یہیں سے ان کی جدید شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا اور غزلوں میں بھی جدید موضوعات سامنے آنے لگے۔

"مغربی ادب کے مطالعے اور انجمن پنجاب کی بدولت حالی کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان کی وجہ سے حالی نے اپنی طرز سخن کو ترک کر کے بالکل نیا راستہ اختیار کر لیا۔"[4]

غرض "زمانہ کا نیا رخ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جدید کے لکھنے سے شرم آنے لگی تھی۔"[5]

اس لئے "اس بزرگ حکیم کے دل میں جو درد اٹھا تھا بالآخر کار اس نے ناصحانہ اور حکیمانہ مظاہر کا لبادہ بنا جس سے حالی کی تمام منظوم تصانیف لبریز ہیں۔ اس زمانہ کی غزلیات سے نصیحت

---

[1] یادگار حالی صفحہ ۱۳۶ [2] کلیات نظم حالی حصہ اول صفحہ ۵۶ [3] حالی اور اول زمانہ فاتحہ سخن۔
[4] صحیفہ تاریخ ادب صفحہ ۱۴۵ [5] دیباچہ مسدس حالی صفحہ ۶

عبرت اور درد ٹپکتا ہے اور دراصل یہی وہ میدان ہے جس میں حالی نے فاتحانہ انداز سے قدم رکھا ہے اور جس میں وہ اپنے تمام معاصرین سے نہایت ممتاز نظر آتے ہیں[1]۔

دوسرے حصے یا جدید غزل کا آغاز ۱۸۷۵ء سے ہوتا ہے۔ یہ رنگ ۱۸۸۹ء تک (دلی میں قیام تک) غالب رہتا ہے اس کے بعد انھوں نے ملازمت ترک کر کے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے اپنی زیادہ تر توجہ سوانح، مقدمہ شعر و شاعری، اور جدید نظموں کے لکھنے کی طرف رکھی اور وہ ادبی کاموں کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ تعلیمی تحریک میں بھی حصہ لیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل گوئی قریب قریب ختم ہو گئی۔

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

لیکن ۱۸۹۳ء یعنی مقدمہ اور دیوان کی طباعت تک 'غزل خوانی' کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رہا اور اس کے بعد غزل گوئی قریب قریب بالکل ختم ہو گئی۔ جدید رنگ کی غزلیں، قدیم رنگ کی غزلوں سے زیادہ ہیں[2]۔

تیسرے حصے کی غزلوں کا زمانہ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۱۴ء تک ہے اس زمانہ میں حالی نے صرف چند غزلیں کہی ہیں یعنی دور آخر کی کل غزلیں صرف سات ہیں[3]۔

ان غزلوں میں۔

"بڑھاپے کی پختہ کاری، اعلیٰ درجہ کی قوت فیصلہ، ہر معاملہ میں بھی تلی رائے، کلام کی خوبی و لطافت اور حسن بیان غرض ہر خوبی نہایت نظر آتی ہے[4]۔ اور جس سے اس شعر رتبولہ کی سچائی ثابت ہو جاتی ہے کہ "شاعر جس قدر ضعیف اور بوڑھا ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی شاعری منجھتی اور جوان ہوتی جاتی ہے[5]۔

یہ غزلیں بھی جدید رنگ کی ہیں۔ البتہ رنگ پختہ اور تجربہ وسیع ہو چکا ہے۔ انداز بیان سجھا ہوا اور زبان منجھی ہوئی ہے۔

سر شیخ عبدالقادر نے غزلیات حالی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"مولانا حالی کی غزلوں کو اگر دو حصوں میں تقسیم کریں تو

پہلا حصہ۔ اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب ان پر دہلی کا اثر غالب تھا [illegible] زبان کے لکھی گئی تھیں جب مولانا حالی دہلی میں مقیم تھے اور اپنے تفیق احباد مرزا غالب اور ان کے معتقد معاصرین کے فیض صحبت سے مستفید تھے ان غزلوں میں تغزل کی جو قدر کے ایسے اچھے

---

[1] کلیات نظم حالی اول ص ۵۶ [2] دیوان مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں قدیم غزلیں ۳۷ جدید ۱۳ ہیں [3] کلیات نظم حالی جلد دوم
[4] [5] کلیات نظم حالی ص ۵۶

Marfat.com

نمونے ہیں۔

دوسرے حصے کو اس دور سے تعلق ہے جس کا آغاز مولانا حالی کے لاہور میں آنے اور ان ادبی مجالس میں شریک ہونے سے ہوتا ہے جن میں مولوی محمد حسین آزاد اپنی طبع رواں کے جوہر دکھا رہے تھے اور جہاں اردو میں انگریزی طرز تحریر کا رنگ سرایت کر رہا تھا۔ اس آغاز کی تکمیل کے لئے ایک اور زبردست اثر علیگڈھ کی تعلیمی تحریک سے پیدا ہوا۔ اور ان کی شاعری کا رنگ یکسر بدل گیا اور انھوں نے اس پایہ کی قومی نظمیں لکھیں جن کی بدولت مسلمانانِ ہند میں بیداری پیدا ہو گئی۔ وہ از سر نو ترقی اور عروج کے خواستگار بن گئے۔ قوم کے بگانے اور قوم کے نوجوانوں میں ذوقِ عمل کی ایک نئی روح پھونکنے کا خیال مولانا کی غزلوں میں بھی برابر جلوہ گر ہے۔[1]"

مولانا حسرت موہانی نے حالی کی شاعری کو دوسرے نقطۂ نظر سے تقسیم کیا ہے۔

۱۔ **رسمی اور عاشقانہ شاعری** جس کا بہترین نمونہ دیوان حالی میں قطعات، غزلیات قصیدوں، ترکیب بندوں، رباعیوں اور تاریخوں کی شکل میں موجود ہے۔

۲۔ **قومی یا اخلاقی شاعری**: مسدس حالی، بیوہ کی مناجات، شکوۂ ہند وغیرہ مولانا حالی کی شاعری کی یہ قسم بر بنائے بے مثلی و بے نظیری تعریف سے مستغنی ہے۔[2]"

سید امجد علی اشہری تحریر کرتے ہیں کہ

"حالی کی شاعری دو صورتوں پر منقسم ہے۔

۱۔ ایک وہ جو ان کے دیوان میں پائی جاتی ہے۔ جو شاعری کا بہ صنوع ہے۔

۲۔ دوسرے وہ جس کو زمانے کے مذاق اور ابنائے زمانہ کی سخن فہمی کا اندازہ کر کے انھوں نے اختیار کیا۔

اس کے بعد وہ اپنی رائے لکھتے ہیں کہ

"میں ان کے طرز قدیم کو شاعری جانتا ہوں اور دوسرے طرز کو نظم اور صرف نظم۔[3]"

گویا حالی کی شاعری کا انحصار طرز قدیم پر ہے۔ جدید طرز نظم نگاری کو شاعری نہیں کیونکہ

"شاعری اور عشق و تعشق لازم و ملزوم[4] ہیں جبکہ نظم نگاری عشقیہ جذبات سے قریب قریب عاری ہوتی ہے۔"

حالی کی قدیم شاعری زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں میں قدماء کا رنگ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ موجود ہے انھوں نے غزل کی عام روایات کی پابندی کی۔ روایتی حسن و عشق مذاہب

---

[1] زمانہ کان پور حالی نمبر ص۲۲ حالی اور غزل۔ [2] تذکرۃ الشعراء جزو سوم ص۱۱

[3] اردو شاعری صفحہ ۱۲۸-۱۲۹ دیباچہ دیوان حالی ص۱

واخلاق، واعظ وناصح پر طنز، رشک ورقابت، رندی ومستی، دیر وحرم کا ذکر قدیم اساتذہ کی طرح ان کی غزلوں میں بھی موجود ہے۔ زبان وبیان بھی سادہ ورنگین ودلکش ہے۔

"حالی لاکھ پاکباز سہی مگر شعر گوئی کے لئے رند شاہد باز بننا ضروری تھا۔ شاعری کی محفل میں آنے کی شرط یہ تھی کہ وہی پرانا داغ (عشقیہ) لگا یا جائے خود حالی بھی شاہد رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیرزال کی صورت میں کرنا نہیں چاہتے تھے اسلئے۔

"ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی تامل ہوتا تھا خود بھی جب یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر رنگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا قافلہ کے ساتھ راہ کی ہمواری اور رہ گزر کی تھکا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا"[1]

اور اسی شارع عام پر حالی بیس برس کی عمر سے چالیس بیالیس سال تک تیلی کے بیل کی طرح چکر لگاتے رہے لیکن وہ بھٹکے نہیں ان کی سلامت روی نے انھیں سنبھالے رکھا چنانچہ

"ان کے اس دور کے کلام میں بھی نہ تو وہ عامیانہ اور گھٹیا مذاق نظر آتا ہے جس کی بنیاد سطحی عشق اور ہوا وہوس کے جذبات پر رکھی جاتی ہے اور نہ موالا بندی اور کنگھی چوٹی کا وہ ذکر جسے اس وقت بیشتر شاعر دل کا غوزہ دوں تھا۔ وہ تخیل کی ان قوتی زحمتوں پر بھی نہیں اڑتے جس سے شعر ایک گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔ نہ دور از کار تشبیہوں، مبہم استعاروں کا وہ جال بنتے ہیں جس میں الجھ کر شعر کا مطلب غلط ہو جائے"[2]

حالی نے "واردات دل" بیان کرنے کے لئے آسان اور عام فہم زبان، نیز سیدھا سادا انداز اختیار کیا جس سے ان کے کلام میں درد و اثر بڑھ گیا۔

سیکھا ہے اشعار حالی سے حال کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:۔

"وہ جس کو بیان کرتے ہیں وہ عاشقانہ اور رندانہ ہوتا ہے۔ نہ ان کے یہاں دور از کار تشبیہات و استعارات ہیں نہ ادا بندی کی بلند خیالیاں۔ انھوں نے شاعری میں وہی کہی ہے جو ان کا دل محسوس کرتا تھا اور جو دیانتداری کا تقاضا ہے۔ ان کی سادہ بیانی کے دل کی بات ہوتی ہے۔ ان کے بیان میں البتہ آپ بیتی کا پن بہت ہوتا ہے یہی شاعر کی اصل خصوصیت ہے جو ذاتی جذبات وخیالات سادہ لفظوں اور سادہ پیرایوں میں ادا کرے۔ حالی نے اپنی غزلوں

---

[1] یادگار حالی ص۱۰۰ [2] دیباچہ دیوان حالی ص۱ [3] دیباچہ مسدس حالی ص۳
[4] یادگار حالی ص۱۴۶

میں یہی کیا ہے۔ انھوں نے خود ہمارے دل کی باتیں ہم کو بتائی ہیں۔ جن باتوں کو ہم عموماً بھولے رہتے ہیں۔ حالی ان کو اس طرح یاد دلاتے ہیں کہ پھر کبھی ہم ان کو نہیں بھول سکتے[1]۔"

غرض حالی کی غزلوں میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی مگر انھوں نے جگ بیتی اس انداز سے بیان کی ہے کہ خود ان کی آپ بیتی معلوم ہونے لگی۔ دردمندی اور سوز و گداز، ان کی قدیم غزلوں کا طرۂ امتیاز ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح! — کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا
رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہونچا مری رسوائی کا
حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں — تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا
قلق اور دل میں سوا ہو گیا — دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
اب محو بوئے گل ہے ہوا کب دلِ حزیں — ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا — ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

غم دل نے رسوا کیا ہم کو آخر — بنائی بہت شادمانی کی صورت
سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو — مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

آیا نہ ہوگا اس کو تغافل میں کچھ مزا — ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اس قدر — حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم — سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
خود زندگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں — آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو سمجھے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں

---

[1] نقوش و افکار صفحہ ۲۱۵-۲۱۶

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہے

نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق
ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ

تم کو کرنا پڑے گا عذرِ جفا
ہم اگر دردِ دل سنانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم کھڑے بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اس کو لکھا چاہیئے

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک
دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجے
اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

ابتدائے وفا ہے سر دینا
میری دیکھی نہ انتہا تو نے

دورِ ہوائے دل، آں اندیشں
کھو دیا عمر کا مزا تو نے

سخت افسردہ طبع تھے احباب
ہم کو جا دو نوا کیا تو نے

یہ اشعار حالی کی رنگیں بیانی اور جادو نوائی کا ثبوت ہیں اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالی کو غزل گوئی پر کتنا کمال حاصل تھا۔ ان کے دل میں بھی محبت کا دریا موجزن رہتا تھا وہ بظاہر ترکِ عشق کی دعا کرتے لیکن دل سے لذتِ عشق کے طلبگار رہتے۔

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

لیکن ان کا عشق ہوا و ہوس سے خالی تھا۔ وہ رندِ شاہد باز کے بجائے رندِ پاکباز تھے۔ ان کی غزلیں پاکیزہ جذبات کا آئینہ و گنجینہ ہیں۔ ان میں شیرۂ اہلِ انشا کی آبرو ہے۔ ان میں

"سادگی ہے مگر حسن و شیرینی بھی۔ الفاظ و ہیئت میں مکرر دکشی اور رکھ رکھاؤ ہے جو نثر میں ہوتی ہے"[1]

[1] تنقیدی اشارے ص۸۰ آل احمد سرور

Marfat.com

حالی کا قدیم رنگِ سخن۔ اشعار بالا کے انتخاب سے واضح ہو گیا لیکن ان کے دل کا معاملہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اشعار انھوں نے خود انتخاب کر کے مولوی عبدالغفور خاں نساخ کی فرمائش پر ان کے تذکرہ سخن شعرا کے لئے بھیجے تھے۔ ان سے ان کی ابتدا و طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے[1]:

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط — الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کو — پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

کچھ اپنی حقیقت کی اگر تجھ کو خبر ہوتی — میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا
ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

دوزخ اگر وسیع تو رحمت فسیح تر — لاتقنطوا جواب ہے ھل من مزید کا (ہو گر)

سب کچھ ہے لب پہ آ کے مگر دل پہ آ نہ جائے — مرا شکر ان کا گلا ہو گیا (اس پر)
شیریں ہے کتنا ان کا تبسم کہ وقت کا — وہ مل کے رو سکے نہ بلا ہو گیا[2]

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات — اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا تم سے عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں[3]

---

[1] یہ سخن شعرا ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔ حالی نے چودہ قدیم غزلوں میں سے تیس اشعار کا انتخاب کیا ہے ان اشعار میں اور دیوان حالی مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں کہیں کہیں الفاظ کا فرق ہے۔ بعض اشعار دیوان میں نہیں ہیں فرق کو قوسین میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

[2] آخری مصرع یوں ہے "وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا۔

[3] اب یہ شعر اس طرح ہے ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

Marfat.com

ہم نے کی سیر چمن غور سے اے بلبل زار
بات چھپتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

کس طرح اسکی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا جو وہ القاب جو عنواں میں نہیں

خلوت خاص میں رہ رہ کے عدو سیکھ گئے
وہ ادائے کہ تری جنبش مژگاں میں نہیں

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

خوبی رو کے لئے رشتی خو بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئی مرتع اطہار نہیں (تجھ سا)

حالی انصاف کر آخر گئے انساں کب تک
طعن اغیار نہیں آپ کے اشعار نہیں

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر
کہاں تک جی نہ گھبرائے اسی درد ہجراں میں

مجھے ڈالا ہے سود و ہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم!
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

وفا شرط الفت ہے لیکن کہاں تک؟
دل اپنا بھی تجھ سا ہرجائی چاہتا ہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں کے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد نہ رہے

ہم بھی آداب شریعت سے تھے واقف لیکن
کبھی برتے نہ ہو جو سمجھ وہ کیا یاد رہے

چارہ گر کار باندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقت دعا یاد رہے[3]

یہ ہے حالی کا قدیم رنگ تغزل جس میں شان آغزل اپنی پوری تہذیب و شائستگی اور نرمی کافرسائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اس کے بعد وہ کچھ دل سے اور کچھ آسمان سے ڈگمگا کر غزل کے میدان سے دور بھاگنے لگے اور ان کے مائل اندیش دل نے غزل خوانی کو بے وقت کی شہنائی سمجھ کر اس سے منہ پھیر لینے پر آمادہ کیا، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے داستان حسن و عشق بیان کرنا بالکل ترک کر دیا۔ نہیں بلکہ بعض اشعار تو ایسے ہیں جو قدیم رنگ سے زیادہ حسن و دلکشی رکھتے ہیں۔

تعزیر جرم عشق ہے اے صرف محتسب!
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

یہ جدید رنگ کا شعر ہے لیکن ذوق گنہ کا مو قلمہ غالب و حالی سے کہیں زیادہ ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایک دو نہیں اس قسم کے بیسیوں اشعار جدید رنگ سخن میں ملیں گے جن کو بمشکل علیحدہ کرایا سکتا ہے کیا مدعا و مستی و بیخودی کے ساتھ

---

[1] یہ شعر دیوان میں نہیں ہے۔
[2] یہ شعر دیوان میں [illegible]
[3] یہ تمام اشعار اس سنہ [illegible] سے نقل کئے ہیں۔

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت — فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا
دل میں باقی ہے وہی حرصِ گناہ — پھر کیے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی !! — پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
گرمئے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا — اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کہے بغیر
آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہل ظرف ہوں — ساقی بھرے کھڑا ہے مئے لعل سے ایاغ
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں — یوں ہی عمر ساری گزر جائے گی
یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حالی نے جدید رنگ میں اپنی شاعری کو غارت کر کے رکھ دیا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں کہ

"یہ قول کسی حد تک تو شاید صحیح ہو لیکن تمام تر صحیح تو یقیناً نہیں[1]"

درحقیقت حالی کی جدید رنگ کی غزلیں اخلاقی اور اصلاحی خیالات کی ترجمان ہیں اسلئے

"بعض جدید غزلیں وہ دلکشی اور حسن نہیں رکھتیں جو حسن و عشق کی ان داستانوں میں نظر آتی ہے[2]"

مگر قدیم روایات کا احترام ان کے دل میں موجود ہے۔ البتہ انھوں نے غزل میں بھی جھوٹ مبالغہ، پست خیالی اور ہوا و ہوس کے جذبات کے اظہار سے پرہیز کیا ہے اسی قسم کے جذبات و خیالات اور زبان و بیان کے اظہار کے خلاف انھوں نے بغاوت کی ہے لیکن کہیں سے انداز بیان یا لب و لہجہ میں تلخی نہیں آنے دی سخت سے سخت بات کہی مگر انداز مناسب رکھا۔

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا — یہ تو بتاؤ حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

یہ کچھ کر کے دکھانے کا جذبہ، جب شدت اختیار کر گیا تو پھر رنگ تغزل کہاں تک قائم رہتا؟ رفتہ رفتہ غزل خوانی نظم خوانی سے بدلتی گئی اور ۱۸۹۳ء کے بعد تو غزلخواں و طنز گفتار حالی نظم نگار اور قومی نوحہ خواں سے زیادہ نہیں رہا۔

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی — الا بیں دبس آب و ھریت زیادہ

وہ رنگت ضرور ختم ہو گئی مگر ان کی واعظانہ اور ناصحانہ غزلوں میں بھی خشکی اور بے کیفی نہیں ہے بلکہ

---

[1] ہندستانی جولائی ۱۹۳۶ء جلد ۶ حصہ ۳ صفحہ ۲۵۵

[2] یادگار حالی۔ ص ۱۵۳

"ان کی غزلوں کی چٹیلی نشریت، ان کی رکی رکی سی تلملاہٹ، ان کا حساس خلوص، ہلکی سی طنز و تلخی لئے ہوئے ان کے تیور، زندگی اور واقعات زندگی سے ان کا قرب۔ ان میں اصلیت کا عنصر ان کا اعتدال و توازن عقل کے ناخن بے شعور انسانی کو چھیڑنا کبھی کبھی ان میں ایک اکھڑپن اور کھردرا پن عموماً ان کا نرم اندرونہ باہر نرم بیتی ان میں تحت آنگی کی صفت، ان کی متین و مہذب بذلہ سنجی ان کی [illegible] عشق کا پاکیزہ معیار، جذبات کا انضباط، تہذیب سے حسن عبارت سے اظہار [illegible] سے جسے فن کارانہ شوخی و طراری سے دلکش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے ان کا پاک و صاف ہونا۔ یہ حالی کے تغزل کی وہ صفات ہیں جو اسے چوٹی کے متغزلین میں جگہ دیتا یا نہ دیتا لیکن جو حالی کو ایسا غزل گو ضرور بنا دیتے ہیں کہ چوٹی کے غزل گو اس کی عزت کرتے ہیں۔[1]

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حالی کا جدید رنگ تغزل صرف "میر اور غالب کے سوز و درد، معاملات عشق کی [illegible] اور سادگی بیان نہ تھا بلکہ آنے والے انقلاب کے شعور کو اپنی ذات میں اس طرح [illegible] کا تھا کہ حسن کی چھیڑ چھاڑ زندگی کی چھیڑ چھاڑ میں اور زخم تیغ عشق، زندگی جاوداں کی لذتوں میں تبدیل ہو جائے۔ حالی کے پختہ سن کی تمام تر شاعری ایک بہت بڑے [illegible] کے گرد گھومتی ہے۔ غرض حالی نے جنگنائے تغزل کو [illegible] اور [illegible] کیا، اسے عشق و حسن اور ہوا و ہوس کے دائرے سے نکال کر اس قابل بنایا کہ وہ [illegible] و ملکی حالات پر تبصرے، تعیش و تکبر کی مذمت، خلائی و تکنیکی [illegible] محبت، ادب و اخلاق، اور تعلیم و تہذیب کا ذکر، صبر و ضبط اور ہمت و استقلال کی ترغیب، مذہب و تصوف اور پند و موعظت کا بیان، ریاکاری [illegible] کر سکے کہ صداقت و قومیت، خلوص و محبت اور [illegible] تغزل قائم رہے۔

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
[illegible]
جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا
[illegible]
افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا
[illegible]
گو جوانی [illegible]
[illegible]

---

[1] انداز۔ نوائے کولمبیا، صفحہ ۲۸۴ - ۲۸۵ سے کچھ تلخیص۔ حالی، حیات صفحہ ۱۸۰

Marfat.com

اک کہانی پیر زن کی رہ گئی
راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

نرد سے الفت کی تج کے چلنا تھا
مفت دا کی نے چوٹ کھائی آج

شاہدنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
مسجد و سجادہ ہیچ اور جبہ و دستار ہیچ

دیں بغیر دشمنی کا ہمارا خیال چھوڑ
یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

خنجر پٹخ اور آپ تڑپنا ہے سیماں پر
فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط

دوستے ہیں چار ہم پر چشم گریاں چار ہم
یاں کہاں ہے بیڑیوں کی بے ثباتی ہیں یار

اک یہاں چلئے سے ہزاروں ہیں یار
یا اسی فرصت سے سب عمر بسر کرتے ہیں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں
درد کھوٹا سبب نہ ہو جس میں

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گرمے نہیں ہے زہر ہی کا جام بلا سے

اہل سخن کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں حالی نے بعض غزلیں بالکل ناصحانہ لکھی ہیں اس لیے وہ صورتاً تو غزل ہیں مگر معنوی حیثیت سے پند نامہ بن کر رہ گئی ہیں نصیحت کی تلخی نے غزل کی شیرینی اور دلکشی کو قریب قریب ختم کر دیا۔

بڑھائو نہ آپس میں باہم تکلف زیادہ
میانہ اگر ہو بجائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کہ در علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے یہ ہے مشرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں ہر چیز بہتر
اگر چاہیے تو فراغت زیادہ

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

یہ غزل نما نصیحت نامہ پانچ اشعار پر مشتمل ہے جس میں غزل کی رنگت نام کو بھی نہیں ہے حالی خود معترف ہیں۔

غزل میں وہ رنگت نہیں شیرۂ حالی
الا پیس نہ بس آپ دھریت زیادہ

شکستہ کے بعد حالی کی کل سات غزلیں، کلیات نظم حصہ اول میں ہیں[1] ان غزلوں میں قوم و ملک کی بدحالی اور تباہی کا رونا ہے پوری نو صد سالہ دور کی غزلوں میں بھی قومی کا مرثیہ موجود ہے۔

---

[1] مثلاً یہ غزلیں مکمل مرثیہ قوم ہیں۔ (دیوان حالی صفحہ ۶۵، ۶۶، ۸۰)

جیتے جی موت سے تو منہ نہ چھپانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا، نہ لگانا ہرگز۔ یا

خضر مرنے سے ڈرے کیا کوئی چارہ کرنا
چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ایسی الٹی۔ یا

پھر نہ ہم کہنے کو ہیں اور نہ تم سننے کو ہو
فصل گل آئی و رخصت ہوا گل دستہ میں

Marfat.com

لیکن آخری وقت تک کے کلام میں یہ رجحان بہت زیادہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی کا دردمند
دل، حادثات اور انقلابات سے بہت متاثر ہے۔ بزم شعرا میں وہ شعر خوانی مدت ہوئی چھوڑ
چکے تھے۔ ان کی فکر کی جولانیاں اور طبیعت کی رنگینیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اب وہ تھے اور ان کی
خراش صدا۔

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش — دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

ان کا خاص سبب یہ تھا کہ

دکھائی جونہی دور گردوں نے آنکھ — گئے بھول ساری وہ سبق خوانیاں

ان کی غزل "طرز شعر فصحا و بلغا" سے عاری ہو کر، پند و موعظت، نصیحت و عبرت کا مجموعہ بن گئی۔

مستی جس میں غفلت کا نشا اور رسی — شب تاریک میں گھنگھور گھٹا اور رسی
شہ کو ہے خوف عزل، خوف اجل خود کو ہے خوف خدا اور رسی
ترک دنیا کے علاوہ تو کیے سب زاہد — گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور رسی
تم تو حالی یہی طرز اپنی نباہے جاؤ — حسن زیر شعر فصحا و بلغا اور رسی

لیکن ان پندناموں میں بھی کہیں کہیں رنگ غزل نمایاں ہے۔

گرم جوشی و لطف صحبت ہو چکا — ناخوشی خفگی و لڑائی ہو چکی
قید خانہ میں لگا دل جن کا لگنے — ان اسیروں کی رہائی ہو چکی

کہنے کی بات ہو تو اسے کہہ سنائیے — جو دل پہ بن رہی ہے وہ کیونکر دکھائیے
اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا — بس آگیا یقیں ہمیں تسمیں نہ کھائیے

آخری وقت کی یہ مسلسل غزل کتنی عبرت خیز و نصیحت آمیز ہے۔

عیش کیخسروی رہے گا نہ صولت بہمنی رہے گی — رہے گی اے منعمو اتو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی
رہبری کس طرح راہ امین کر رہنما بن گئے ہیں رہبر — خدا نگہبان ہے تو افلاس و ناگہانی رہزنی رہے گی
کرے گی کچھ عقل رہنمائی نہ علم سے ہو گی کچھ صفائی — گناہ کی گندگی دلوں کی نہ دل سے ہرگز کبھی رہے گی
بگاڑ مذہب نے ہیں جو ڈالے نہیں وہ ماشہ پھینکنے والے — یہ بگڑی دنیا کی گر نہ یوں ہو مقدروں ہی میں بندگی ہے
قبولیت کی کرے نہ پروا جو چاہو مقبول ہو دعا — حالی آخری دم تک یہی ہمارا لگا رہے

گو کہ حالی میں دم نہیں باقی — دم غنیمت ہے جب تک آتا ہے
گو نہیں آتش سخن کی لیکن — خس بسم کی منائے جاتا ہے
اب نئے ہر سر کو ہے یہ سودا — وہی راگ اپنا گائے جاتا ہے

Marfat.com

غزلیاتِ حالی کا یہ اجمالی تعارف پیش کرنے کے بعد، ان کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ
کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حالی کی قدیم غزلوں میں، قدیم روایات کا احترام ہے عشق و حسن کا حسب معمول ذکر ہے۔
لیکن پست خیالات، اور عریاں جذبات کا نام و نشان تک نہیں۔ انداز بیان صاف، سلجھا ہوا
سنجیدہ اور مہذب ہے۔ آسان اور عام فہم الفاظ ہیں۔

حالی نے جدید غزلوں میں نئے خیالات کو سمونے کی کامیاب کوشش کی اور غیر مردف، مسلسل
قطعہ نما غزلیں لکھیں اور غزل کو اس قابل بنایا کہ وہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر سکے۔

غزلوں میں مقامی تشبیہات، ہندی الفاظ کا مناسب اور برمحل استعمال کیا ہے۔

کہیں کہیں ناہموار اور ناہموار کی بہتات بھی ہے لیکن زیادہ تر کلام اس صنعت گری سے
پاک ہے۔ آخری دور کی غزلوں میں بندش کی سستی اور الفاظ کا عدم تناسب موجود ہے
اور غزل پر مقصدیت غالب آجانے سے دلکشی میں کمی ہو گئی۔

Marfat.com

قصائد

غزل کی طرح قصیدہ بھی اردو شاعری کی ایک مقبول صنف رہی ہے شعراء کے لئے قصیدہ گوئی دولت و عزت کا سبب تھی لیکن قصیدہ نگاری ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی اس کے لئے چند بنیادی خصوصیات نہایت ضروری ہیں یعنی

شاعر کا مطالعہ نہایت وسیع ہو۔
اس کو اظہار جذبات و خیالات پر کمال حاصل ہو۔
اس کا ذہن رسا اور اس کی تخئیل بلند ہو۔
اس کی نگاہ فطرت شناس، و باریک بین ہو۔
اس کی طبیعت نکتہ سنج و نکتہ فہم ہو۔

مختصر یہ کہ شاعر قصیدہ میں جس کے لئے جو کچھ کہنا چاہتا ہے، وہ اس کے حسب حال اور مرتبہ کے بموجب ہو قصیدہ گوئی ایک اعلیٰ صنف ہے اس سے انسان کے اعلیٰ جذبات بیدار ہوتے ہیں وہ بلند اخلاق و کردار کا حامل ہونے کی کوشش کرتا ہے جب تک قصیدوں میں یہ بنیادی صداقت قائم رہی، اس نے حیات انسانی کو سنوارنے اور کردار کو بلند کرنے میں بڑی امداد دی لیکن جوں جوں یہ صداقت کم ہوتی گئی قصائد جھوٹ اور مبالغہ کا ہمالیہ بنتے گئے۔

بدقسمتی سے اردو قصائد پر، فارسی قصائد کی چھاپ تھی اسلئے وہ شروع سے ہی صداقت و اصلیت سے غیر متعلق رہے۔ ان میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جو فارسی میں موجود تھیں۔ مبالغہ اور جھوٹ کو مرکزیت حاصل تھی اور بہترین قصیدہ نگار وہی شاعر سمجھا جاتا تھا جو مبالغہ آرائی و بلند پروازی میں کمال رکھتا ہو۔

حالی کے زمانہ میں قصیدہ گوئی کا دم واپسیں تھا۔ دربار اور درباداری کا وجود تک باقی نہ رہا تھا۔ بہادر شاہ ظفر، واجد علی شاہ اختر اور دوسرے راجے اور نواب [illegible] تھے۔ ذوق و غالب نیز دیگر شعراء کی قصیدہ نگاری انہیں کے دربار سے وابستہ [illegible] کسی نہ کسی طرح اپنی وضع کے پابند تھے لیکن ان سب پر بتدریج افتادگی و نیستی طاری رہی آخرش یہ سیلاب بلا رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ امن و امان کی صورت پیدا ہوتی گئی۔ ہندوستانیوں میں غلامی کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔ اب انگریز کے دربار میں حاضری کو سب سے بڑا فخر سمجھا جانے لگا قصیدہ گوئی میں، غلامانہ ذہنیت اور خوشامد پسندی جھوٹ اور مبالغہ کے ساتھ ساتھ [illegible] میں شمار

Marfat.com

کی جانے لگی۔

مولانا حالی نے تصیدہ کی اہمیت و افادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

"قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح و ذم کے لئے جائیں اور اس کی بنیاد محض اتفاقی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو، تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا اور اپنے بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔"[1]

جس طرح انسان کی فطرت میں "کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقعہ کو سن کر بے اختیار، مدح و ستائش یا نفرین کا جوش اٹھتا ہے"[2]

"ایسے موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ جو ملکہ اس کی طبیعت میں خدا نے ودیعت کیا ہے اس کو معطل اور بے کار نہ چھوڑے اور اس سے جیسا کہ اس کی فطرت کا مقتضیٰ ہے کچھ کام لے"[3]

حکیم محقق طبیب، مدبر، سیاح وغیرہ کے فرائض کی طرح شاعر کا بھی یہ فرض ہونا چاہیئے کہ

"اچھوں کی خوبیوں کو چمکائے ان کے ہنر اور فضائل عالم میں روشن کرے اور ان کے اخلاق کی خوشبو سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا سامان مہیا کر جائے اور نیز برائیوں اور عیبوں پر جہاں تک ممکن ہو گرفت کرے تاکہ حال اور استقبال دونوں زمانوں کے لوگ برائی کی سزا اور اس کے نتائج سے ہوشیار اور چوکنے رہیں۔"

لیکن "مدح ایسے اسلوب سے کرنی چاہیئے کہ وہ متجر بہ خوشامد نہ ہو جائے اور مذمت ایسے عنوان سے ہونی چاہیئے کہ دلسوزی کا پہلو طعن و تشنیع کی نسبت غالب تر ہو۔"

اگر اس اصول کے تحت اردو قصیدہ کو دیکھا جائے تو نتیجہ قریب قریب صفر ہوگا۔ جاگیردارانہ نظام میں یہ ممکن نہیں کہ:۔

"مدح و ذم کے اصول راستی و عقل و انصاف پر مبنی ہوں پس اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ مدح و ذم کا طریقہ یورپ کی موجودہ شاعری سے اخذ کیا جائے اور آئندہ قصائد کی بنیاد اسی طریقہ پر رکھی جائے۔"[4]

حالی کے ان خیالات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قصیدہ کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اصلاحی تھا وہ قصیدہ کو بہتر اور اونچے مقصد کے اعتبار سے اردو شاعری اور شاعروں کے لئے ضروری سمجھتے تھے لیکن اردو قصیدہ گوئی نامۂ اعمال سیاہ کرنے کا سبب بنی ہوئی تھی۔ حالی نے مسدس کے دیباچہ میں حالی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

---

[1] تا [5] مقدمہ شعر و شاعری صفحات ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۷۵

"قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیئے۔ ہر مشت خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے ہر چوب خشک میں اعصا نے موسوی کے کرشمے دکھائے۔ ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا۔ ہر فرعون بے سامان کو قادر مطلق سے جا بھڑایا جس کے مداح بنے اُسے ایسا باتس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزہ نہ آیا۔ غرض [illegible]

ایسا کہیاں کہ یہ گمگ سفیدی باتی نہ چھڑے

[illegible]

حالی نے قصیدہ کے سلسلے میں جو خیالات ظاہر کیے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"تصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریق سابق کے مدح کی سب سے لائق قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان دشکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح اپنے اہم واقعہ اور زمانہ سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اس کو سنائی جاتی ہیں۔ لیکن انھوں نے قصیدے کے ارکان اربعہ کے متعلق کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھی، ان کو جنس رہنے دیا۔ قصیدہ میں تشبیب[1] گریز[2]، مدح اور دعا یہ چار اجزا ضروری ہیں۔

تشبیب کے لئے شرط یہ ہے کہ

(۱) اس کے اشعار کی تعداد مدحیہ اشعار سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ ابن رشیق لکھتے ہیں۔

[illegible]

یعنی تشبیب کے مجموعہ میں ایک عیب یہ ہے کہ تشبیب زیادہ ہو اور [illegible]

(ب) تشبیب میں [illegible]

(ج) [illegible] کی شان میں جو قصیدہ لکھے جائیں ان کی تشبیب میں اس سے متعلق اشعار بھی ہوں۔ اردو میں یہ شخصیت ضروری نہیں رہی بلکہ اس میں تغیر کر لیا گیا ہے کبھی کبھی [illegible]

"قصیدے کا یہی وہ حصہ ہے جس [illegible]

---

[1] دیباچہ مسدس حالی ص ۳۔ [illegible]

بحوالہ شعر العجم جلد دوم ص [illegible]

[2] اردو میں قصیدہ نگاری کی ابتدا [illegible]

Marfat.com

۲۔ گریز۔ تشبیب کے بعد گریز کی دشوار گزار منزل آتی ہے جس میں شاعر اس طرح ممدوح کا ذکر کرتا ہے جیسے بات میں بات پیدا ہو گئی ہو۔ شاعر کا کمال گریز کی خوبی پر منحصر ہے۔

۳۔ مدح۔ گریز کے بعد ممدوح کا نسب یا جس ممدوح کی حیثیت اور اس کے مرتبہ کے بموجب تعریف کی جاتی ہے اور ذاتی و صفاتی خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۴۔ دعا آخر میں شاعر دعائیہ اشعار لکھتا ہے اس سے پہلے وہ اپنا مدعا بیان کرتا ہے قصیدہ کا یہ حصہ نہایت اہم ہے۔ شاعر کی کامیابی کا انحصار اسی حصہ پر ہے۔ اردو شعرا اس نازک مقام سے بڑی خوبی کے ساتھ گزر جاتے ہیں، ان کو دعائیں دینے، بلائیں لینے اور مانگنے کا فن خوب آتا ہے سنداد اور رزدق کے قصائد دعا و مدعا کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

مولانا حالی کی فطرت کو قصیدہ نگاری سے لگاؤ نہیں تھا حقیقت پسندی اور سچائی کے ساتھ کوئی قصیدہ لکھنا اور اس کے تمام لوازمات پر نگاہ رکھنا حالی کے لیے مشکل تھا۔ اسی لئے قصیدہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ کی۔ ان کے قصائد کی کل تعداد حسب ذیل ہے۔

۱۔ دو نعتیہ قصیدے۔

۲۔ تین قصیدے۔ نواب سر آسمان جاہ، ملکہ وکٹوریہ اور نظام دکن کی شان میں۔

۳۔ ایک قصیدہ الغیاثیہ۔ یا عرض حال بدربار نبوت کے لئے۔

۴۔ ایک قصیدہ نظام دکن کی مدح اور اعیان حکومت کے شکریہ کے طور پر ہے جو حیدرآباد کے ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا۔

اس طرح کل سات مکمل قصائد انھوں نے لکھے ہیں۔ ناتمام قصیدے صرف تین ہیں دو نواب کلب علیخاں۔ اور سرسید احمد خاں کی مدح میں اور ایک میں صرف تشبیب کے چند اشعار۔ اگر حالی کی مدحیہ شاعری کو بھی قصیدے میں شامل کر لیا جائے تو پانچ قطعات ایک مسدس، اور ایک نظم کا اور اضافہ ہو سکتا ہے لیکن قطعات کو چھوڑ کر کوئی نظم صورتاً قصیدہ نہیں کہی جا سکتی۔

حالی کے نعتیہ قصائد میں زور بیان بھی ہے اور سوز و گداز بھی۔ آنحضرت صلعم کے ساتھ جو شیفتگی، محبت، اور عقیدت تھی۔ اس سے ان کی زبان میں زور اور بیان میں جوش پیدا ہو گیا۔ کی شاعری کا آغاز نعتیہ خمسہ سے ہوا تھا اس کے بعد انھوں نے پہلا نعتیہ قصیدہ ۱۲۸۱-۸۲ھ / ۱۸۶۴-۶۵ء لکھا تھا جس کی نسبت ان کا دعویٰ ہے کہ

"اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس کو اپنی قدیم شاعری کا نمونہ سمجھ کر بدستور سابق رہنے دیا ہے کہیں کچھ تصرف نہیں کیا گیا"[1]

---

[1] دیوان حالی پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۵۴

یہ قصیدہ ۳۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس وقت حالی شیفتہ کے پاس مقیم تھے۔ شیفتہ مرحوم کو رسالت مآب سے عشق تھا۔ حالی ان سے متاثر تھے۔ انھوں نے قصیدہ نگاری کے عام اصول سے ہٹ کر، غزل کے پیکر میں قصیدہ لکھا اور قصیدہ کے اجزائے ترکیبی کے التزام کو نظر انداز کر دیا لیکن حرف حرف سے عشق رسول ظاہر ہے۔

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لئے
سخن زباں کیلئے اور زباں دہاں کے لئے

ہلال مکہ کا، مادر دہفتہ شرب کا
فروغ قوم کے اور رشمع دودماں کے لئے

گھر اس کا سرور قرآں و مہبط جبریل
در اس کا کعبۂ مقصود انس و جاں کے لئے

سپہر گرم طواف اس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لئے

حریف نعت پیمبر نہیں، سخن حالی
کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لئے

نبی کا نام ہو ورد زباں رہے جب تک
سخن زباں کے لئے اور زباں دہاں کے لئے

دوسرے نعتیہ قصیدہ میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا کا التزام کیا ہے۔ یہ قصیدہ ۷۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدہ کی شانِ نزول کے متعلق حالی تحریر فرماتے ہیں۔

"اس قصیدہ کی تصنیف [illegible] زمانہ میں ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں مومن، نوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھیں دنوں میں ستیارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا جس طرح پر تین غزلیں بڑے دھوم دھام سے لکھیں جن دوستوں کی جاذبے جانحسین و آفریں سے دماغ بالکل خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی گئی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اسرار کے مشاعرہ میں نہ آئے۔

جیسا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی گھبراہٹ نہیں ہوتی جیسا کہ شاعر ان لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدر داں سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدہ کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر یہ لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ [illegible] اس زمانے کے خیالات کے موافق اس [illegible] جس طرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعری بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتہً اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ لہٰذا قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔"

اس قصیدہ کی تشبیب فخریہ ہے۔ اس میں اکتالیس اشعار ہیں۔ گریز کے لیے صرف ایک شعر ہے

لہ حاشیہ دیوان حالی پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۶۳

Marfat.com

مدح ۳۰۔ اور دعا ۳۔ اشعار پر مشتمل ہے تشبیب میں زور بیان اور فخر و مباہات ہے۔

میں نگی ہوں حسن طبع پہ صد جان سے فدا — مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز و ضرر بہ
خاک ہوں اور عرش پہ ہے دماغ — مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور
دریکتا ہوں اور ہوں بے آب — ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز — انوری ہے، نہ عنصری و شاپور

اس کے بعد اپنی علمیت و قابلیت کا فخریہ اظہار کرتے ہوئے گریز کرتے ہیں۔

لوں ملائک سے داد حسن کلام — گر کہوں نعت سرور جمہور
وہ شہنشاہ امتی جس کا — یاں گنہگار اور واں مغفور
ہو سکے اس کی نعتوں کا شمار — نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
اے ترا پایہ فہم سے برتر — اے ترا نام حرف سے مستور
دور دریا آستان والا ہے — ہے بہت تنگ حالی مہجور
اب دعا یہ ہے اے شفیع امم — بسکہ بے تاب ہے دل رنجور
جیتے جی دل میں یاد ہو تیری — مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

حالی نے ایک اور قصیدہ الغیاثیہ یا عرض حال دربار رسول میں پیش کیا۔ یہ قصیدہ اردو قصائد میں نئی نشاندہی کرتا ہے، اس میں شاعر نے انتہائی سوز و گداز، خلوص اور دردمندی کے ساتھ امت مرحوم کی فریاد دربار رسالت میں کی ہے۔

فریاد ہے اے کشتی امت کے نگہباں — بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
اے چشمہ رحمت بابی انت و امی — دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پر آخر ہیں تمہارے — نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی — ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

آخر میں حالی کا دردمندوں، سوز دروں سے بے تاب ہو جانا ہے

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں سماریں — اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

مآلاً اپنی گستاخی اور بے ادبی کا خیال آجاتا ہے۔

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حد ادب سے — باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب — یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے

اس قصیدہ میں ۶۳۔ اشعار ہیں۔ ہر شعر درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

حالی نے اپنی متعدد نظموں میں انگریزی حکومت کی بعض باتوں کا شکریہ ادا کیا ہے جس کی وجہ

Marfat.com

سے انھیں انگریز پرست مشہور کیا گیا لیکن ۱۸۵۷ء کی خونریزیوں کے بعد ملکہ وکٹوریہ وغیرہ بند نہیں تھیں اور امن و سکون قائم ہوا تھا۔ حالی قوم کے بچے خیر خواہ اور بہی خواہ تھے۔ اور سرسید کی تعلیمی تحریک میں عملاً شریک تھے۔ وہ انگریزوں کے دلوں سے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات دور کرنا چاہتے تھے اسی میں وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود سمجھتے تھے۔ حالی بھی ان کے ہمنوا تھے انگریزوں کو جب وہ رفاہ عام کے کام کرتے دیکھتے تو ان کا درد مند دل احسان مند ہوتا اور اس احسان کا شکریہ وہ قصیدہ یا مدحیہ نظم لکھ کر ادا کرتے۔ مسٹر آرنلڈ اور مسٹر بمفرد وغیرہ کی شان میں جو نظم یا قصیدہ ہے وہ اسی جذبے کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کی جشن جوبلی کے موقع پر ایک قصیدہ ۲۷ اشعار کا ۱۸۸۷ء میں لکھا جس میں تمہید یا تشبیب وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ شروع سے ہی اصل مضمون کا ذکر کر دیا ہے۔

ہے عید یہ کس جشن کی یارب کی سراسر — ہے جوبلی ہی جوبلی اک کی زباں پر
یہ عید کہ گنتے ہیں برس جس کو بیاں اب — ست جگ سے ہے یہ ہند کے توقیر میں سر

ملکہ کے عہد حکومت کا دوسرے ملکوں سے تقابل کر کے اس کی عدالت کا ذکر کیا ہے اور انصاف پسندی اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کو تسلیم کیا ہے۔

تسخیر فقط آنکھوں نے عالم کو کیا ہے — اور تو نے سخا سے دل و خاطر کو کیا ہے
بندے اپنے فرائض میں مسلماں ہیں نہ ہندو — معمور مساجد ہیں تو آباد ہیں معبد
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا — سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

حالی مسلمانوں کو سب سے زیادہ اس کا احسان مند بتاتے ہیں۔

گو منت قیصر سے ہے ہر قوم کو انبار — احساں ہے مسلماں پہ ہیں سر تا سر
اسی لئے انھوں نے ہادی

نیر تھے مگر اس کے رہے سایہ نیر داں — در پردہ کی سو سو طرح سے

حالی سر آسمان جاہ کی علم نوازی کے شکریہ اور احسان مند تھے اس لیے ہی وہ بھوپال کا قصیدہ سب سے زیادہ مدح نواب موصوف کی کی ہے ان کی شان میں قصیدے لکھے۔ ایک قصیدہ عید الفطر کی تہنیت میں کہا ہے۔ حالی کے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس قصیدے میں انھوں نے

لہ عید کے زمانہ کو بجائے برسہا برس جوبلی کے اعتبار سے ست جگ سے تشبیہ دی ہے۔ ست جگ ہندو دیومالا کا ایک زمانہ ہے جس کا عرصہ ۱۷۲۸۰۰۰ برس ہوتے ہیں۔ یہ قصیدہ انجمن اسلامیہ لاہور کے ایڈریس کے ساتھ انجمن کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹ دسمبر ۱۸۸۷ء میں پیش کیا گیا تھا۔

۲ اسلام سے مراد مسلمانوں سے ہے۔

Marfat.com

کمالِ فن یہ ہے کہ انھوں نے مدحیہ اشعار میں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ قصیدہ کا آغاز اس طرح کیا ہے۔

مہ صیام گیا اور روزِ عید آیا　　خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا
رہینِ منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام　　کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا

مدح سیدھی سادی اور حقیقت افروز ہے، مبالغہ کی ترنگ میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملائے ہیں

ہمیشہ جس کو رہے بہبود ملک مدِ نظر　　رفاہ دامن ممالک میں جس نے پھیلایا
بنائے نظم و نسق جس نے رکھی شوریٰ پر　　مشیر کارِ خرد پرور دل کو ٹھہرایا

ایک اور قابلِ ذکر قصیدہ ۱۸۹۱ء میں لکھا جو حیدر آباد کے ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا۔ یہ قصیدہ

"بمقام حیدر آباد دکن جبکہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر سے اکثر زعفار کے جن میں سے ایک راقم بھی تھا بطور ڈیپوٹیشن کے محمڈن کالج علیگڑھ کی طرف سے حضور سرکارِ نظام میں حاضر ہوئے تھے ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا جس کے صدر انجمن جناب نواب وقار الامرا بہادر تھے۔"[1]

دراصل یہ قصیدہ نظم کے طور پر لکھا گیا کیونکہ نظام دکن اور اعیانِ سلطنت نے علیگڑھ کالج کی ہر ممکن امداد اور سرپرستی کی تھی۔

کی ہے سر سید نے جو کوشش فلاحِ قوم میں　　اس کو ہے اے اہلِ مجلس اک زمانہ جانتا
پر یہ سر سید سے بیڑا پار ہونا تھا محال　　دولتِ عالی اگر بنتی نہ اس کی ناخدا
ختم کر حالی سیاسِ صدرِ اعظم پر سخن　　بال بال اپنا ہے جس کے شکر میں جکڑا ہوا

سر سید احمد خاں کی شان میں ایک ناتمام قصیدہ ہے جو بسبب مکروہاتِ دنیوی کے پورا نہ ہو سکا۔"[2]

پنہاں نہیں ہے یار و سب پر کھلا ہوا ہے　　جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے
اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم　　اک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے
ہمدرد قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا　　یہ درد اس کو جدی میراث میں ملا ہے

غرض حالی کے کل قصائد، اصلیت سادگی اور واقعہ نگاری کا مرقع ہیں۔ انھوں نے اپنی قصیدہ نگاری کی خصوصیات ایک قطعہ میں لکھی ہیں۔

شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمالِ انبائے دہر　　جو لیاقت اس میں ہے درکار وہ ہم میں نہیں
اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر　　جھوٹ جو شعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں

حالی کی وہ منفرد حیثیت ہے جنھوں نے قصائد میں بھی جھوٹ سے پرہیز کیا ہے وہ کسی وقت بھی مبالغہ

---

[1] حاشیہ دیوان حالی صفحہ ۱۳۲
[2] " " " صفحہ ۱۲۷

Marfat.com

ے کام نہیں لیتے۔ تشبیہات و استعارات کو پیچیدہ نہیں بناتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سیدھے سادے
راز، آسان اور عام فہم زبان میں کہتے ہیں۔ یہ زبان قصیدہ کے لئے ناموزوں ہے اگرچہ ان
قصائد کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن اپنے مواد، اپنی ہیئت اپنے سادہ اسلوب اور اپنی
نیقت نگاری کی وجہ سے اردو قصائد میں، انھیں منفرد و نمایاں مقام اور خاص حیثیت حاصل ہے۔

مثنویات

اردو شاعری میں مثنوی کو بھی کافی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس کو سب سے زیادہ کارآمد اور
مید صنف تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا حالی نے مثنوی کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

"مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہے[1]۔ اور غزل۔ قصیدہ
مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، غرض

"جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں مستعمل ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل
مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں[2] ہے"

اس خوبی اور جامعیت کے باوجود اردو میں عشقیہ مثنویوں کے علاوہ، مذہبی، تاریخی، اخلاقی
یا سماجی مثنویاں کم لکھی گئیں عشقیہ مثنویوں میں۔

"ناممکن اور فوق العادۃ باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے" اور "اکثر
مثنویوں میں شاعری کے فرائض بھی پورے پورے ادا نہیں ہوئے[3]۔ مثنوی میں علاوہ
ان فرائض کے جو غزل یا قصیدے میں واجب الادا ہیں کچھ اور شرائط ہیں جن کی مراعات
نہایت ضروری ہے"

مولانا حالی نے یہ شرائط آٹھ بتائی ہیں

۱۔ **ربط کلام**۔ ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہئے جیسے زنجیر کی ہر کڑی
کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے۔

۲۔ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادۃ باتوں پر نہ رکھی جائے۔

۳۔ مبالغہ اسی حد تک استعمال کیا جائے کہ "جو مطلب بیان کرنا منظور ہے مبالغہ کے سبب
اس کا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہو، نہ یہ کہ اس کا رہا سہا یقین
بھی جاتا رہے۔

---

[1] تا [3] مقدمہ شعر و شاعری صفحات ۲۷۵ - ۲۷۶ - ۲۷۷

Marfat.com

۴۔ مقتضائے حال کے موافق کلام ایراد کرنا خاص کر قصہ کے بیان میں ایسا ضروری ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بلاغت کا بیشتر حصہ اسی بات میں چھپا ہوا ہے[1]۔

۵۔ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ لفظاً اور معناً نیچرل اور عادت کے موافق ایسی ہونی چاہیئے جیسی کہ فی الواقع ہوا کرتی ہے[2]۔

لیکن جو لوگ "صنعت الفاظ پر فریفتہ ہوتے ہیں اور لفظی مناسبتوں پر جان دیتے ہیں وہ کبھی کسی نیچرل حالت کی تصویر نہیں کھینچ سکتے[3]۔"

۶۔ قصہ میں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے[4]۔

۷۔ قصہ کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو جس طرح ناممکن اور فوق العادۃ باتوں پر قصہ کی بنیاد رکھنی آج کل زیبا نہیں، اسی طرح قصہ کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی جن کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو ہرگز جائز نہیں[5]۔

۸۔ جس طرح ان اہم اور ضروری باتوں کو جن پر قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرنا ضرور ہے اسی طرح ان ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں ہیں۔ کنایہ میں بیان کرنا ضرور ہے[6]۔

مذکورہ بالا شرائط کے بعد حالی تحریر فرماتے ہیں۔

"ان آٹھ باتوں کے سوا تنقید نگاہی کے اور بھی فرائض ہیں مگر یہاں صرف انھیں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے پیش نظر صرف عشقیہ مثنویاں رہیں کیونکہ انھوں نے جتنی مثالیں دی ہیں وہ زیادہ تر مثنوی بدر منیر، گلزار نسیم، زہر عشق، بہار عشق اور طلسم الفت سے دی ہیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اردو شاعری میں انھیں مثنویوں کو شہرت و مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ جو عشق و حسن اور ان کے لوازمات ہجر و وصل، قید و بند، درد و غم، سوز و گداز، کرب و اضطراب، مصائب و مشکلات وغیرہ کو بیان کریں۔ حالانکہ اردو میں عشقیہ مثنویوں کے علاوہ دوسری قسم کی مثنویاں بھی موجود تھیں لیکن ان کا وجود برائے نام تھا اور دنیا عشقیہ مثنویوں پر فریفتہ تھی تاہم ہر عہد

---

[1] [2] مقدمہ شعر و شاعری صفحات ۲۸۱ - ۲۸۲ - ۲۸۸ - ۲۸۹

[3] " " " صفحہ ۲۹۲

[4] [5] " " " صفحہ ۲۹۴ - ۲۹۶

[6] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۲۹۸

Marfat.com

ہر کتب خیال میں کوئی نہ کوئی مثنوی دوسرے موضوع پر ضرور لکھی گئی۔ مناظر فطرت، مذہب و تصوف پند و موعظت اور اخلاق و سیر پر مثنویوں کی کمی نہیں ہے۔ عبدالقادر سروری کے الفاظ میں۔

"قدیم ترین اردو میں اس کا استعمال زیادہ تر پکھڑا رہا تھا چنانچہ پہیلیوں، نصائح ملفوظات اور تصوفانہ خیالات کے لئے مثنوی کی صنف ہی کا استعمال ہوتا رہا ہے۔"[1]

حالی نے ان مثنویوں کو نظر انداز کر دیا اور ان پر کسی قسم کی کوئی بحث نہیں کی۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ عام رجحان عشقیہ مثنویوں کی طرف تھا اور انھیں مثنویوں میں اصلاح کی ضرورت تھی اس لئے انھوں نے اپنے اصلاحی مشن کے لئے عشقیہ مثنویوں کو موضوع بحث بنایا۔

خود اپنے قصیدے کے برخلاف حالی کو تو اپنے مثنویوں پر مثل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ انھوں نے نہ تو کوئی خالصتہً مثنوی لکھی اور نہ کوئی لمبی چوڑی داستان نظم کی بلکہ وہ مثنوی کو قصہ کی خیالی دنیا سے نکال کر فطرت کی حقیقی دنیا میں لے آئے۔

"انھوں نے کوئی عجیب و غریب مثنوی نہیں لکھی، مافوق الفطرت عناصر کا استعمال نہیں کیا بلکہ عام انسانی زندگی سے اپنے موضوع کو اٹھایا۔"[2]

عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔

"ان کے موضوعات سماجی نوعیت کے ہیں۔ حب وطن، امید کی خوشی، مناظر فطرت، راست گفتاری اخلاقی اقدار کی اہمیت، مذہب، تعلیم، سماجی معاملات، عورتوں کی بے کسی و بس مپرسی غرض یہ کہ اس زمانے کی زندگی میں جتنے بھی موضوعات ہو سکتے ہیں ان سب کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت سے حالی نے اپنی مثنویوں میں کر دی ہے۔"[3]

حالی کی مثنویوں میں ان کے دور کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

"اس زمانے کی حالت، غور و فکر کا انداز، خیالات، تصورات، ذہنی و جذباتی رجحانات سب کچھ ان کے اندر موجود ہے۔"[4]

حالی نے مغرب سے متاثر ہو کر مثنویاں لکھیں۔ ان کی سب سے پہلی نظم "جوانمردی کا کام" ۱۸۷۲ء میں لکھی گئی۔ ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے انگریزی کے ادب سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہونے لگے تھے اور ترجمہ کرنے لگے تھے۔ یہ مثنوی بچوں کے لئے لکھی گئی۔ اس قسم کی مثنویاں [illegible]

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقا، صفحہ [illegible]

[2] اردو مقالات، حالی، صفحہ [illegible]

[3] [illegible]

Marfat.com

کے لئے کوئی نہ کوئی نصیحت اور سبق آموز بات ضرور ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور انھیں بچوں کے رجحانات کا کافی تجربہ تھا اس لئے وہ اپنی ناصحانہ بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ دلچسپی قائم رہے اور بچوں کے دلوں پر اس کا اثر ہو نیز انھیں زندگی کی حقیقت، کام کی اہمیت، وقت کی قدر و قیمت اور دوسری تمام مفید باتوں کا علم ہو جائے ان میں قوتِ عمل پیدا ہو۔ یہ مثنویاں مختلف موضوعات پر ہیں لیکن نتیجہ قریب قریب ایک ہی نکلتا ہے یعنی "سیکھو اور عمل کرو"۔ چند عنوانات اور موضوعات یہ ہیں۔

خدا کی شان، جوانمردی کا کام، غوثِ اعظم، میں کیا بنوں گا؟ سپاہی، شیر کا شکار، مرغی اور اس کے بچے، بلی اور چوہا۔ روٹی کیونکر میسر آتی ہے؟ ایک چھوٹی بچی کے خصائل حقوق اولاد وغیرہ۔ ان مثنویوں کے علاوہ دوسری نیچرل اور مکالمہ والی مثنویوں اور نظموں میں بچوں کے لیے بہت کچھ مواد موجود ہے۔ حب وطن، نشاط امید، برکھا رت، مناجات بیوہ، کلمۃ الحق، رحم و انصاف وغیرہ ہر ایک میں بچوں کے لئے سبق آموز اور نصیحت خیز اشعار موجود ہیں۔ حالی سے پہلے مولانا آزاد نے بچوں کے لئے نثر و نظم میں کہانیاں اور کتابیں لکھیں مگر حالی نے مستقل طور پر اخلاقی شاعری کو اپنا موضوع بنایا اس لئے ان کے کلام کا معتد بہ حصہ بچوں کے واسطے بیحد مفید ہے ان تمام مثنویوں کی زبان نہایت سادہ اور دلچسپ ہے بیان صاف اور شگفتہ ہے۔ بحریں زیادہ تر چھوٹی اختیار کی ہیں جو بچوں کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ خدا کی شان میں کہتے ہیں۔

اے زمین و آسماں کے مالک — ساری دنیا جہاں کے مالک
تو ہی ہے سب کا پالنے والا — کام سب کا نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے — پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

اس کے بعد ان تمام انعامات الٰہی کا ذکر کیا ہے جن کو ایک بچہ سمجھ سکتا ہے۔ آخر میں وہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کیں سدا تو نے مشکلیں آساں — تیری مشکل کشائی کے قرباں

بچوں میں جوش اور ولولہ، عزم اور حوصلہ، ہمت اور استقلال پیدا کرنے کے لئے انھوں نے متعدد مثنویاں لکھیں ان کے نزدیک سب سے زیادہ بہادری اور جوانمردی کا کام یہ ہے کہ سخت سے سخت اور جانی دشمن کو بھی مصیبتوں سے نجات دلانا چاہئے اور اس پر قابو پانے کے بعد بھی رحم کرنا چاہیئے۔ اس کو ایک حکایت کی شکل میں لکھتے ہیں کہ کسی دولت مند کے تین بیٹے تھے تینوں سعادت مند اور بہادر، فرماں بردار اور نیک خو باپ نے آخری وقت ان کو بلا کر کہا کہ تم میں سے جو سب سے زیادہ جواں مرد ہوگا اسی کو میں ایک جواہر انعام میں دوں گا۔ تینوں نے اپنے اپنے

Marfat.com

کارنامے بیان کئے۔
پہلے لڑکے نے امانت میں خیانت نہ کرنے کو جوانمردی کا کام سمجھا اور اس کو فخر کے ساتھ عرض کیا
لیکن باپ نے فرمایا:۔

ایک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز — فخر کی جا ہے تیری عمر دراز

دوسرے بیٹے نے عرض کیا کہ اس نے ایک چھوٹے بچے کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا اور اپنی جان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس کے نزدیک اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دوسروں کی زندگی بچانا جوانمردی ہے لیکن باپ نے مسکرا کر جواب دیا۔

باپ نے سن کے یہ سب اس سے کہا — کام مردوں کے یہی آتا ہے بیٹا
فخر کی جا، یہ مری جان کیا ہے؟ — ڈوبنا بھی تو انساں کا کیا ہے

سب سے چھوٹا بیٹا آگے بڑھا اور اس نے بصد عجز و انکسار یہ عرض کیا کہ میں نے اپنے جانی دشمن کو موت کے منہ سے بچایا۔ حالانکہ اگر میں چاہتا تو

مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار — اک اشارہ میں تھا وہ لقمۂ خار

لیکن مرتے کو مارنا مروت اور جوانمردی سے دور تھا اس لئے میں نے اس کی جان بچانا اپنا فرض سمجھا اور

منہ کو دامن سے تگرگ ڈھانک لیا — [illegible]

باپ نے یہ سن کر بیٹے کو دعا دی، سب لڑکوں [illegible] سنایا اور ان سے پوچھا کہ
بولو! اب کس سے ہوا کام بڑا؟

سعادتمند بیٹوں نے جواب دیا۔

خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف — پوچھئے ہم سے کو ہے یہ انصاف
جس جواہر کے طلبگار تھے ہم — اس کے لائق تھے نہ حقدار تھے ہم
اور کو دینا کی ہو سرا حق ہے — حق یہی ہے کہ [illegible]

باپ بیٹوں کے اس فیصلہ سے بہت خوش ہوا کہ انھوں نے عدل و انصاف [illegible]
کے بعد چھوٹے بیٹے کو جواہر انعام میں دیدیا اور کہا

[illegible] ہو ترا کوہسار کبھی [illegible]

۱؎ اسی خیال کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے۔

بخشی نے کی، عرض کہ اے [illegible] — [illegible]
ارشاد ہوا: بندہ پرور! وہ ہے — جو لے سکے اور نہ لے بدلہ کا

Marfat.com

اسی طرح مثنوی حقوق اولاد میں ماں باپ کے بیجا لاڈ و پیار کے تباہ کن نتائج کا ذکر کیا ہے بلا تربیت سے اولاد کے اخلاق و عادات بگڑ جاتے ہیں۔ وہ ماں باپ اور خاندان کے لئے بدنامی و رسوائی اور تباہی و بربادی کا سبب ہوتی ہے۔ مگر حالی نے اس انجام کی ذمہ داری والدین پر ڈالی ہے۔ حکایت خاصی لمبی یعنی ۲۰۰ شعر کی ہے۔ اور اس طرح شروع ہوتی ہے۔

لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا — جان ماں کی اور ایماں باپ کا
دیکھ اسے ہوتے تھے دونوں باغ باغ — تھا وہی لے دے کے اس گھر کا چراغ
وقف تھی سب اس پہ دولت اور مال — پر نہ تھا تعلیم کا اس کی خیال
راہ سے مکتب کی کتراتا تھا وہ — نام سے پڑھنے کے گھبراتا تھا وہ

اسی ماحول میں اکلوتا بیٹا پرورش پاتا رہا یہاں تک کہ لڑکپن کی منزل سے گزر کر شباب کی پُربہار وادی میں داخل ہوا۔ بگڑی ہوئی عادتیں رنگ دکھانے لگیں۔ باپ نے ہر چند سمجھایا لیکن صاحبزادے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، شادی ہوئی، دل کے حوصلے ناچ رنگ اور دھوم دھام میں نکالے گئے۔ شادی کے بعد خیال تھا کہ صاحبزادے سنبھل جائیں گے مگر ان کی بے راہ روی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا، باپ نے پھر نصیحت کی۔ صاحبزادے نے باپ کے احسانات اعتراف کرتے ہوئے جواب دیا کہ میری تباہی و بربادی کے ذمہ دار آپ ہی ہیں، مگر

کہہ کے جی میں اپنے شرمایا بہت — جرأت بے جا سے پچھتایا بہت
گو دیئے الزام سب اپنے مٹا — پر نہ مٹ سکتا تھا حق ماں باپ کا

یہ خیال آتے ہی بیٹے کی غیرت عود کر آتی ہے۔ گستاخی، فرمانبرداری سے بدل جاتی ہے اور

کر کے عذر شوخ چشمی باپ سے — گر پڑا قدموں پہ آ کر باپ کے
دل جو اُمڈا دیر تک روتا رہا — متصل اشکوں سے منہ دھوتا رہا

باپ کا دل بھی بھر آیا۔ سینے سے چمٹا کر دوبارہ سمجھایا جس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ باپ نے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے مگر — اب تو تم عاقل ہو تو جائے سنور

یہ نظم بچوں سے زیادہ والدین کے لئے مفید ہے[1]۔

غرض حالی نے بچوں کے متعلق جتنی مثنویاں لکھیں وہ سب نتیجہ خیز ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ ترجیع بند قطعات و رباعیات اور غزلیات میں بھی پند و موعظت کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔

---

[1] تعلیم و تربیت کی اہمیت اور فضول خرچی پر حالی نے ایک تقریر میں بھی اظہار خیال کیا۔
(مقالات حالی جلد دوم صفحہ ۳۴)

Marfat.com

لاہور کے مشاعرے کے لئے حالی نے چار مثنویاں لکھیں۔ یہ مثنویاں کافی مقبول اور مشہور ہیں پہلی مثنوی برکھارت ہے جس میں برسات کی مختلف کیفیتوں اور رسموں کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان میں موسم برسات سرسبزی و شادابی کا موسم ہے۔ اس موسم سے ہندوستانیوں کی بہت سی مذہبی و قدیم مذہبی اور سماجی روایات و اعتقادات وابستہ ہیں اس لئے ہر ہندوستانی اس موسم کو خوش آمدید کہتا ہے۔ برسات سے پہلے گرمی کی شدت سے زمین و آسمان تپنے لگتے ہیں۔ جاندار اور بے جان جمادات و نباتات سب افسردہ و پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ حالی نے گرمی کے ان اثرات کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے اور ایک ایک چیز کا بیان بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ گرمی کے بعد برسات آتی ہے۔ ساری فضا مست و سرشار ہو جاتی ہے کالی کالی گھٹاؤں کا آنا، بجلیوں کا چمکنا، پانی کا برسنا، جنگل میں مور اور پپیہوں کا شور، حیوانوں کی مستی و بے خودی، درختوں کی سرسبزی و شادابی انسانی جذبات میں شدت پردیسیوں کو وطن کی یاد، وطن والوں کی خوشیاں، کسانوں کی مسرت، لڑکیوں کا جھولا جھولنا، حالی نے ان سب باتوں کو بڑے والہانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ کہیں بھی راستی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ کے معاملات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور انھیں منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں کمال حاصل تھا۔ برکھارت کی آمد آمد سے گرمی رخصت ہو گئی ہے۔

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد — اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
ہیں شکر گزار تیرے برسات — انسان سے لے کے تا جمادات
مجھ سے ہے کھلا یہ راز قدرت — راحت ملتی ہے بعد کلفت
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ — اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ
گلشن کو دیا جمال تو نے — کھیتی کو کیا نہال تو نے
بکھرے ہیں جو زمیں پہ انبار — ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار
کوسوں سے جدھر نگاہ جاتی — سبزے سے ہے فرش کا بچھاتی

حالی لاہور میں بہت دنوں رہے تھے اس لئے لاہور کی یاد ستاتی رہی۔ لاہور کا موسم انھیں بالکل پسند نہیں تھا۔

---

۱ یہ شعر حالی کا نہیں ہے۔

برسات میں وطن کی یاد نے اور زیادہ پریشان کر دیا۔[1]

بیزار اک اپنی جان و تن سے　　بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
غمخوار ہے اور نہ کوئی دلبر　　اک باغ میں ہے پڑا لب جو
ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا　　اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
سامان کئے جو دل لگی کے　　یاد آئے مزے سبھی کے

اور اسی وقت وہ کالی داس کے میگھ دوت کی طرح ابر کو اپنا پیامبر بنا کر کہتے ہیں۔

جاتی ہے جدھر تری سواری　　بستی ہے اسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو　　دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اوّل کہیو سلام میرا　　پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا　　فرقت میں تمہاری آئی برکھا
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے　　صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
آخر نہیں پاتا جب کسی کو　　دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
پردیس میں پیچ ہے کیا ہر جی شاد　　جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد

یہ دیس کی یاد بڑے دردناک انداز میں کی ہے۔

نشتر کی طرح لگتی دل میں چبھتی　　فریاد یہ دردناک اس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز　　پگھلا دل سن کے اس کی آواز
حیرت مری دیر تک یہ آخر　　روتا ہے کہاں کا یہ مساز
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

دوسری مثنوی مسدس مدّ و جزر اسلام ہے۔ امید ہی پر دنیا قائم ہے۔ ناامیدی کفر بھی ہے اور موت بھی حالی نے امید کی اہمیت مذہب و تاریخ سے ثابت کی ہے۔ پھر امید انسانوں کی خوشیاں اور امنگیں۔ ناامید انسانوں کی پشیمانی اور ناکامیاں بتائی ہیں۔ امید ہی دین کی اصل اور دنیا کی بنیاد ہے۔ ناامیدی میں حسرت و یاس کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ حالی نے یہ نظم ایسے زمانے میں لکھی جب ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر خوف و یاس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان کو سر چھپانے اور پیر ٹیکنے کی کہیں جگہ نہیں ملتی تھی

---

[1] حالی لکھتے ہیں "ان دنوں لاہور میں رہنا فی الواقع نہایت شاق معلوم ہوتا تھا اور وطن کی طرف واپس آنے کی کوشش کی جاتی تھی" حاشیہ مجموعہ نظم حالی ص۱۳

Marfat.com

ایسے وقت میں تکلے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ ضرورت تھی کہ قوم کو زندہ درگور ہونے سے بچایا جائے۔ قنوطیت کے جذبات ختم کر کے عزم و حوصلہ پیدا کیا جائے۔ سرسید نے نثر میں امید کی خوشی لکھی اور مولانا محمد حسین آزاد نے امید کی بہکتوں پر طویل نظم لکھی حقیقت ہے کہ

"افراد کو از سر نو زندگی سے ہمکنار کرنے کے لئے اس قسم کے خیالات کا اظہار بہت ضروری تھا"[1]

حالی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے وہ قوم کی حرکت، زندگی، تعمیر، ترقی اور بقا کے لئے اس قسم کے خیالات کا اظہار و ابلاغ نہایت ضروری سمجھتے تھے ان کے

"حساس دل نے اس حقیقت کی اہمیت کو سمجھ ضرور لیا تھا اور وہ اس کی اہمیت کو دوسروں کے ذہن نشین بھی کرانا چاہتے تھے"

امید کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے مری امید مری جاں نواز — اے مری دل سوز مری کارساز
کاٹنے والی غم ایام کی — تھامنے والی دل ناکام کی
دونوں جہاں کی ہے بنا تجھ سے استوار — دین کی تو اصل ہے دنیا کی تو مدار
تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں — تو نہ ہو تو ہو ابھی برہم جہاں
ہوتا ہے تو امیدوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
جاتا ہے یاس سے دل آتشیں نکل — کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل

تجھ میں بھرا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑ یہ حالی کا نہ ساتھ اے امید

تیسری نظم حب وطن ہے حالی کے دل میں وطن کی محبت کا دریا موجزن تھا پردیس میں وطن کی اور زیادہ یاد آتی ہے۔ برسات والی نظم میں وہ جان وطن سے بیزار ہو چکے تھے اس نظم میں حب وطن کے سارے نقوش ابھر آئے ہیں۔ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہوتی ہے۔ حالی کے پاس ایمان کی گرانمایہ دولت تھی وطن کے بجائے پردیس کے پھولوں سے بہتر اور خوشنما ہوتے ہیں

جاتا رہتا ہے آسمان ذہن [illegible] اور دیس میں
اے سپہر بریں کے سیارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب ہوا — اے لب جوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے غزالوں کے نغمہ گستر — اے شب ماہتاب تاروں بھری

---

[1] روایت کی اہمیت [illegible] ص ۱۹۲

اے نسیم بہار کے جھونکو — دہر نا پائیدار کے دھوکو
تم ہر ایک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رہنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
یہ چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا — پر نہیں لطف ہم کو دنیا کا

یہ غریب الوطن، وطن کا سچا عاشق، وطن کی دوری اور جدائی سے بیتاب ہو جاتا ہے۔

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
تیری دوری ہے مورد آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جاں نثار — یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار

اور پھر اس شک کو یقین سے بدل کر کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کو اپنے وطن سے عشق ہوتا ہے

جن و انسان کی حیات ہے تو — مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کی نمو تجھ سے — رو کھ تجھ بن ہرے نہ ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

اور یہ اشعار تو حالی ہی جیسے شیدائی وطن کے دل سے نکل سکتے ہیں۔

تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن کا مرا

اس کے بعد آریوں کی آمد، راجہ دشرتھ کا بن باس، رسول پاکؐ کی ہجرت، حضرت یوسف کی کنعان سے روانگی کا ذکر کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ سب کے دل اپنے وطن کی یاد میں بے چین رہتے تھے لیکن ان کی وطن کی محبت اور ہماری وطن کی محبت میں یہ فرق ہے۔

ہم ہیں نام وطن کے دیوانے — وہ تھے اہل وطن کے پروانے
کہئے جب وطن اسی کو کہتے — ہم سے حیواں نہیں ہیں جو کہ نہ ہتے

حالی کے نزدیک وطن کی سب سے بڑی محبت یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی بدحالی کو نہ دیکھ سکے۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد — نوع انساں کا جس کو ہو درد
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے — قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے بڑھ سکے کوئی جو آگے

Marfat.com

جب پڑے ان پہ گردشِ افلاک اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

پھر اہل وطن کو مخاطب کر کے بتایا کہ غفلت چھوڑو، ہمدردی و مساوات، میل اور ملاپ پریم اور محبت کے ساتھ رہو۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر.... کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

مفلس و محکوم قوم اخلاقی اعتبار سے بھی کھوکھلی ہوگئی آپس میں بغض و حسد، نفرت و عداوت کا اضافہ ہوتا گیا جس کا نتیجہ ذلت و رسوائی، غلامی و محکومی، نکبت و افلاس کے سوا اور کیا ہوتا؟ اس لئے

گر رہا چاہتے ہو عزت سے بھائیوں کو نکالو ذلت سے
ان کی عزت تمھاری عزت ہے ان کی ذلت تمھاری ذلت ہے
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

حالی نے آگاہ کیا کہ اب حسب نسب اور خاندان کے فخر و غرور کا زمانہ ختم ہوگیا اب قوم کی عزت دوڑ کا انحصار علم و ہنر اور کمال حاصل کرنے پر ہے۔

اب نہ سید کا افتخار صحیح نہ برہمن کو شدر پہ ترجیح
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے علم سے اک یتیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا بے ہنر کوئی ٹکا نہ پائے گا
نہ رہے گی سیادتی دن رات یاد رکھنا ہماری بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کر کی کہنا تھا

اس نظم میں حالی نے وطن کی محبت کا اجتماعی احساس اور شعور پیدا کیا وہ قومیں وطن کے لئے، قوم کے بنیادی اصول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو قوم کی خوبی، اخلاق کرتے ہیں علم و ہنر کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ وطن کی ترقی بلند اخلاق، اعلیٰ کردار اور علم و ہنر کے

Marfat.com

اکتساب کے بغیر ناممکن ہے۔

اسی مشاعرہ کے لئے انھوں نے آخری نظم مناظرۂ رحم و انصاف لکھی۔ یہ مثنوی اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں نئی چیز تھی۔ حالی نے رحم اور انصاف کے فضائل علیحدہ علیحدہ بیان کئے ہیں۔ دونوں نے اپنی اپنی بڑائی ثابت کی ہے لیکن عقل نے ثالث بن کر فیصلہ کر دیا کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

رحم اور عدل میں جب مباحثہ کی نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ

رحم ادھر عدل سے کہتا ہے کہ تو ہے کیا چیز — اور ادھر رحم کو ہے عدل سمجھتا ناچیز

تو عقل نے آکر دونوں کی باتیں سنیں اور اپنا فیصلہ کیا۔

صاف کہتی ہوں میں اے رحم نہیں اس میں خلاف — تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف

اور سن اے عدل نہیں اس میں تکلف سر مو — گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تو

دونوں تم خلق کے ہو مایۂ آرام و نشیب — گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب

اور حقیقت تو یہ ہے کہ

فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو — جبکہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو

دراصل عدل اور رحم دونوں ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں۔

وہی اک شے ہے کہ ہو عدل کہیں نام اس کا — کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا

رحم کہلائے جو مظلوم کی فریاد سنے — عدل ٹھہرے جو ستم گار ظالم کو دے

اس طرح عقل نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کر دیا کہ رحم اور عدل ایک ہی چیز ہیں حالی نے گواہی بھی دے دی۔ چلئے جھگڑا ختم ہو گیا۔ دونوں اس طرح گلے مل گئے کہ من و تو کا فرق مٹ گیا۔

رحم اور عدل سے جب عقل نے تقریر کی — اور دی ساتھ ہی حالی نے شہادت اس کی

رہی باقی نہ فریقین کو جائے انکار — چار ناچار کیا ایک جہتی کا اقرار

بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ گویا تھے ایک
مل کے ہو جائیں گے ہم جیسے کہ دو دریا ایک

حالی نے اس قسم کی مثنویاں اور بھی لکھی ہیں جن سے ان کے گہرے مشاہدے اور اعلیٰ قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے مناظرہ کے طور پر انھوں نے حسب ذیل نظمیں لکھی ہیں ان میں تین مثنویاں ہیں

مناظرۂ تعصب و انصاف (۱۸۸۲ء)

مناظرہ واعظ و شاعر (۱۸۸۲ء) یہ نظم مثنوی نہیں ہے،

پھوٹ اور اسکے کا مناظرہ (۱۸۸۷ء)

Marfat.com

دولت اور وقت کا مناظرہ (۱۸۸۵ء)

مناظرہ تعصب و انصاف ایک معرکۃ الآرا مثنوی ہے جس میں حالی نے اپنی قوم کے عروج و زوال کے اسباب بیان کئے ہیں۔ وہ قوم کی جڑ تعصب بتاتے ہیں۔ جب کوئی قوم تعصب کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ اپنی ہر برائی کو بھلائی تصور کرنے لگتی ہے اور دوسروں کی خوبیاں بھی اس کو بدیاں معلوم ہوتی ہیں۔ تعصب ہی کا نتیجہ تھا کہ

ذکر غیروں کا نہ تھا بے نظریں — کوئی مردود تھا اور کوئی لعیں
نیک اعمال تھے غیروں کے تباہ — اور منظور تھے سب اپنے گناہ
تھے قضا اور قدر کے مالک — ہم تھے اللہ کے گھر کے مالک
نظر آتا تھا نہ کچھ پست نہ بلند — تھے ہر اک کلیہ تاریک میں بند

لیکن جب انصاف نے آکر دستک دی اور تعصب کی عینک آنکھوں سے اتری تو

ہوئی وہ بزم خیالی برہم — تھا طلسمات کا گویا عالم
تھا کیا جس کو یقیں چشمۂ آب — وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب
پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا — حسن بھائے گمان تھے کیا کیا
نہ جب آئینہ میں دیکھا جا کر — ہم کو اک شکل مہیب آئی نظر
دیکھا جب آپ کو بالکل معیوب — [illegible]
[illegible]

شعرا و اغنیا، شیخ و زاہد اور رہنمائے قوم سب۔

پیاز کی طرح ترے پوست ہی پوست — قوم کے دوست مگر نادان دوست

لیکن اس ابتری میں صرف

پایا اک دین کا محکم قانون — وہی یاروں کی بدولت مطعون

جب پوری قوم کا یہ حال زار ہو تو دل کیونکر [illegible] اور دردناک آہیں نہ نکلیں؟

دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالت زار — [illegible]
گو نہ تھا تلخ نوائی کا مزاج — [illegible]
[illegible]

حالی کی یہ تلخ نوائی بے کار نہیں گئی۔ یہ خواب غفلت سے جاگ [illegible] اس نے اسی منزل [illegible]

Marfat.com

قدم اٹھایا جس کی طرف حالی نے اشارہ کیا تھا۔

بھوٹ اور ایکے کے مناظرے میں حالی نے دونوں کی خصوصیات بتائی ہیں۔ اس مثنوی میں انھوں نے فرد اور قوم کو لازم و ملزوم بتایا ہے۔ وہ فرد کو قوم کا ایک لاینفک جزو کہتے ہیں۔ اس طرح حالی میں قومیت کا صحیح تصور اور شعور پیدا ہو گیا تھا۔ قوموں کی ترقی کا انحصار افراد پر ہے حالی اس حقیقت سے واقف تھے۔ فرماتے ہیں۔

قوم کی تعریف نہیں جانتے — اپنی حقیقت نہیں پہچانتے
کر نہیں سکتے وہ حقائق پہ غور — کہتے ہیں جڑ اور ہے پتی ہے اور
جانتے دریا کو ہیں اک شے جدا — قطروں سے کہتے ہیں کہ وہ ہے جدا
پر یہ عزیزوں کو نہیں سوجھتا — ہے انھیں قطروں سے وہ دریا بنا

جہالت انسان کو غلط کاریوں اور گمراہیوں میں مبتلا رکھتی ہے لیکن جب علم کی روشنی پھیلتی ہے سچ نظر آتا ہے سچ اور جھوٹ جھوٹ — تفرقہ رہتا ہے نہ رہتی ہے پھوٹ۔ اور

علم ہو جس قوم کا یاں راہبر — برکتیں اللہ کی اس قوم پر
فرق نہیں ان کے زن و مرد میں — قوم کی طاقت ہے ہر اک فرد میں
زور سے ہیں ان کے زبردست زیر — لومڑیاں سامنے ان کے ہیں شیر

اپنی قوم کے حال زار پر شاعر کا دردمند اور حساس دل بھر آتا ہے۔ وہ اتفاق و اتحاد کی دعا کرتا ہے۔

اے کہ تری ذات ہے عالم پناہ — اسود و احمر کا ہے تو بادشاہ
جوڑنا ٹوٹوں کا تیرے ہاتھ ہے — تیری صفت جامع اشتات ہے
بھیجیو برکت نہ کسی قوم پر — رکھیو ہر ایک قوم کو شیر و شکر

اور اگر اس قوم کو ملاپ راس نہ آئے اور سر جوڑنے کی آس باقی نہ رہے، تو اس بے آب کی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے۔

پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا — حق میں ہے اس قوم کے بہتر فنا

مناظرہ کی آخری نظم دولت اور وقت کا مناظرہ ہے۔ اس نظم میں وقت کو دولت پر ترجیح دی گئی ہے۔ ہندوستانیوں کی عادت ضائع کرنے کی دیرینہ عادت ہے۔ دولت کو عزت و افتخار کا سرمایہ، اور شرافت و نجابت کا وسیلہ، دانائی و رہنمائی کا معیار سمجھا جاتا ہے اور وقت جو سرمایہ دنیا ہے۔ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسیر و غریب، مردہ و مفلوک، ہندو مسلمان نوازندہ و گانے سب اس کو رائیگاں کھوتے ہیں۔ حالی نے دولت اور وقت دونوں کی خصوصیات نظر کی ہیں

Marfat.com

ں میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ

جن کے قبضہ میں ہوں میں اے دولت — تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت
جانتے ہیں حکما رو عرفا — مجھ کو سرمایۂ دین و دنیا
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں — ان کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں

آخر میں وقت نے کہا کہ مجھے زیادہ بحث کرنے کی نہ فرصت ہے نہ ضرورت کیونکہ

اس میں ہے میرا سراسر نقصان — کہ ہے ہر لمحہ مری ایک اک آن

حالی نے خود وقت کے اس مشورہ پر عمل کیا لیکن ہندوستانی سماج اپنی آن پر قائم ہے۔ ں میں اب بھی دولت کی پوجا کی جاتی ہے اور وقت کی خیرات بانٹی جاتی ہے۔

حالی نے سماج کی برائیاں مطالعہ کیں وہ اس کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ ایک تجربہ کار طبیب لی طرح انھوں نے معاشرہ کا مرض پہچان لیا تھا، سب سے بڑی بیماری 'حق و صداقت' سے دوری تھی مکر و فریب آئین سیاست بھی تھا اور اصول سیاست بھی حالی نے اس مرض کو دور کرنے کا بیڑا ٹھایا، اور اصلاح ملت کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی قوم بغیر اعلیٰ کردار کے ترقی نہیں رسکتی اور اعلیٰ کردار منحصر ہے راستی و راستبازی پر وہ اس مقولہ کے قائل تھے کہ سچائی ہی سب سے بہتر سیاست ہے۔ "راستی موجب رضائے خدا ست" پر ان کا ایمان تھا اور کبیر داس کے

ساد ہے پر عمل

سانچ برابر تپ نہیں جھوٹ برابر پاپ — جاکے ہردے سانچ ہے تاکے ہردے آپ

اور جب وہ اسلامی ملت کی پرانی قوم کے کردار کو کہتے تھے تو انھیں بڑی مایوسی ہوتی۔ اس پس منظر میں انھوں نے مثنوی کلمۃ الحق لکھی، "الحق مرّ" ہے وہ ناواقف نہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ

ہر فن مے یک قدر یہ ناقدریوں کے بعد

اس لئے انھوں نے اس مثنوی میں حق و صداقت کی خاطر مصیبتیں جھیلنے اور مشکلیں برداشت کرنے پر زور دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ کامیابی و کامرانی آخر میں سچوں ہی کو ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اہل عالم کی [illegible] کسی تو زہر کا پیالہ پینا پڑا کسی کو عام شہادت نوش کرنا پڑا کسی کو ملک بدری کی سزا دی گئی۔ کوئی جلاوطن کیا گیا لیکن سب کے سب دنیا کے [illegible] گئے اور رہتی دنیا تک اپنا نام اور اپنا کام چھوڑ گئے۔

اے کلمۂ حق تیری بدولت — مردوں پہ گزر گئی کیا کیا مصیبت
دنیا نے ان پر کو ظلم توڑا — دامن انھوں نے تیرا نہ چھوڑا

Marfat.com

ہے تلخ نشینوں ہی میں بات تیری — سننے میں کڑوی کہنے میں میٹھی
ہوتا نہ ہرگز ٹکسال میں اجالا — حق کا نہ ہوتا اگر بول بالا
اے راست گوئی ابر رحمت — ہے اس چمن میں سب تیری برکت
گو تجھ میں تلخی صدہا سے ہے — پر تیری دارو صحت فزا ہے

حالی نے راہ راست اختیار کی تھی۔ اس کے لئے انھوں نے ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کا عہد کیا، ان کی حق پسند طبیعت نے بے باکانہ اعلان حق کیا

اے کلمۂ حق اے تیز داں — جس وقت ہو تو پردہ سے عریاں
ہوں تیرے حسبۂ دم انصار تجھ سے — دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے

عالم ہو تیرا جب ناشناسا
حالی کو رکھیو اپنا شناسا

حالی کا مطمح نظر اخلاقی و اصلاحی تھا اسی لئے ان کی نظر معاشرہ کی ان خرابیوں پر زیادہ پڑتی تھی جنھوں نے انسانی زندگی کو گھنونا بنا دیا تھا۔ ہندوستان میں عورت کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں تھی سماج میں نہ اس کا کوئی مقام تھا نہ احترام، وہ مرد کی ہوسناکیوں کا شکار اور اس کے تعیش کا ایک ذریعہ تھی، اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ حالی اس کی مظلومیت اور بیکسی سے متاثر ہوئے۔ اس کے جائز حقوق کی پامالی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کی بے کسی اور بے بسی پر خون کے آنسو بہائے۔ اردو شاعری میں جس نے سب سے پہلے صنف نازک کی مظلومیت کو اپنے سوز جگر کے ساتھ پیش کیا وہ مولانا حالی ہیں۔

حالی نے ان بے زبانوں کے حق میں "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" نیز بیٹیوں کی نسبت لکھ کر سماج کے اس رستے اور بہتے ہوئے ناسور کو دکھایا جس سے پورا معاشرہ متعفن ہو چکا تھا۔ "چپ کی داد" "مکالمہ بین بیٹی اور بیٹیوں کی نسبت" قطعہ کی شکل میں ہے "مناجات بیوہ" مثنوی میں لکھی گئی۔ حالی اپنی پوری فنی صلاحیت اور تمام تر سوز و گداز کے ساتھ اس میں نمایاں ہیں۔ یہ مناجات نہیں ہے بلکہ بیوہ کے قلب و جگر کے ٹکڑے ہیں جو الفاظ میں ظاہر ہوئے ہیں۔ کمسن بیوہ کی حالت زار جس سوز و گداز کے ساتھ حالی نے پیش کی ہے اس کو سن کر سخت سے سخت دل بھی موم ہو جاتا ہے۔ کیونکر نہ ہو۔ ہندوستانی سماج میں بیوہ کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ اپنے اور پرائے سب اس کو ٹھکراتے ہیں۔ اس [illegible] بدنصیب قرار دیتے ہیں لوگ اس کے سایہ تک سے بچتے ہیں۔ ایسی عورت جائے تو کہاں جائے؟ اپنی بپتا کہے تو کس سے کہے؟ خدا کے سوا اس کے دکھ درد کا سننے والا اور کون ہے؟ وہ اسی سے اپنی بپتا، اپنی درد بھری

کہانی عرض کرتی ہے۔

اے دین و دنیا کے مالک — راجا اور پرجا کے مالک
اے اندھوں کی آنکھ کے تارے — اے نگوڑے نربلوں کے سہارے
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے
تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا — تو ہے سہارا غمگینوں کا
سوچ میں دل بہلانے والے — بپتا میں یاد آنے والے
بے آسوں کی آس تو ہی ہے — جانکنی سوتے پاس تو ہی ہے
دکھیا، دکھی، بپتا ماری، وہ — تیرے ہاتھ ہے سب کا کھیوا
میں لونڈی تیری دکھیاری — دوا اور سے کی تیرے بھکاری
اپنے پیارے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں — تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

اس کے بعد آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہو جاتا ہے۔ ایک ایک بات یاد آتی ہے کیسے کیسے دکھ جھیلے کیسی کیسی مصیبتیں پڑیں ان کا نہ کوئی شمار ہے نہ ان کی کوئی انتہا۔

دل پر میرے داغ ہیں جتنے — میرے بول نہیں ہیں سکتے
تجھ پہ ہے روشن سب دکھڑوں کا — تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا

لیکن دل ہے کہ امڈا چلا آتا ہے اور کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔

بیاہ کے وہ پچھتائی نہ لیئے — لیتے ہی پر کھوٹے دیئے
خوشی میں بھی سکھ پا نہ آیا — غم کے سوا کچھ راس نہ آیا

کس سوز و گداز اور درد و غم کے ساتھ وہ یاد کرتی ہے۔

آنکھ میچے کا سپنا ہے دنیا! — [illegible]
[illegible] — [illegible]
ہونگی کسی نے پچھلی پائی — [illegible]
پیت نرالی جب سے اپنائی — [illegible]
ہوش سے پہلے ہوئی میں جو — کیا ہوئے پیا کیسوا؟

اور پھر دردانگیز حالت [illegible] جو شادی کے بعد فوراً بیوہ ہو جاتی ہے اور جس کی [illegible] ہوتی ہے۔

میں ہوں اکیلی ساجن ہوں نہ بیلا — [illegible]

Marfat.com

جلیں کروڑوں اسی لپٹ میں　　پلکوں پھنکی اسی مرگھٹ میں
آئی نہیں دنیا میں الٰہی　　ایسی کسی بیڑے پہ تباہی

لیکن بے رحم مردوں کو رحم نہیں آیا۔ ظالم سماج اسی طرح عورت پر ظلم کرتا رہا، بیوہ کی زندگی کرب و اضطراب صبر و ضبط محرومی و بے چارگی اور حزن و ملال کی مجسم تصویر بنی رہی۔

آنکھ میں ایک ایک کے ہوں کھٹکتی　　پر اپنے بس مر نہیں سکتی
ماں اور باپ عزیز اور پیارے　　بے کل ہیں جینے سے ہمارے
رو کے پلک نم کر نہیں سکتی　　ہنس کے غلط غم کر نہیں سکتی
جب سے یہ دن قسمت نے دکھائے　　تکتے ہیں جو اپنے پرائے
جانتی ہوں نازک ہے زمانا　　بات ہے ایک یاں عیب لگانا
مل جاؤں گر خاک میں بھی میں　　بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں
یوں نہ مری اس جان پہ بنتی　　ماں مجھ کو اے کاش! نہ جنتی
عورت ذات کا تنہا جینا　　ہر دم خون جگر ہے پینا
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے　　بپتا ہے جو کہی نہ جائے

لیکن اس بپتا کا احساس مردوں کو کیوں ہو؟ بیوہ کی شادی سے ان کی ان کے خاندان کی ناک کٹتی ہے۔ اس آن کو تو قائم رکھنا ہی ہے۔

اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے　　قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی کو ہم سے ندامت　　ناک رہے کنبے کی سلامت
جان کسی کی جائے تو جائے　　آن میں اپنی فرق نہ آئے

کیسے درد بھرے الفاظ میں اپنے خدا سے منت سماجت کر رہی ہے۔

کیجیو جو کچھ تیری خوشی ہو　　دانستہ مگر کیجیو نہ کسی کو
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا　　کرائے تو نہ ایسی ماتا کا
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی　　جس سے کھلی پریت یہاں کی
کام کوئی مشکل نہیں تجھ کو　　ایک یہ کیا گر تیری خوشی ہو
سوتنا لگے پتھر ہیں لوٹے　　ناؤ لگے دیتے ہیں چھوٹے

یہ تو بشریت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنا دکھڑا اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے روتا ہے۔

ورنہ ہے اس دنیا میں دھرا کیا　　خواب کا سا اک ہے تماشا
دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا　　سکھ پہ یہاں کے اترانا کیا

Marfat.com

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں — چلتی پھرتی چھاؤں ہے ارماں
ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے
خوشی میں غم یاں ملا ہوا ہے — امرت میں بس گھلا ہوا ہے
خواہ ہوں رانڈ خواہ سہاگن — موت ہے سب کی جان کی دشمن

لیکن بیوہ کی موت اس کے لئے پیغام حیات وسکون لاتی ہے اسلئے

جان یہ آساں دیتی ہے ایسی — بوند ہے نکلتی پھول سے جیسی

مگر وہ فنا فی الموت ہونے سے پہلے فنا فی اللہ ہو جانا چاہتی ہے۔

گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے — تیرے سوا جو سب کو بھلا دے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں — کوئی رہے ارمان نہ جی میں
دل میں لگن بس اپنی لگا دے — سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
جی سے نشان پیاروں کا مٹا دوں — پیار کے منہ کو آگ لگا دوں
تو ہی دل میں تو ہی زبان پر — مار کے جاؤں لات جہان پر
جاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

حقائق اور واقعات اتنی آسان اور دلکش زبان میں اتنے موثر اور دلگداز انداز میں بیان کرنا حالی کے کمال فن کا اعجاز ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں

"حالی نے غیر بحر بجز ایک بیوہ کی مناجات کے اگر ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا تو ان کے لئے یہی ایک نظم دنیا و عقبیٰ دونوں میں بس تھی۔ بانیں اتنی سچی اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہے۔ بول اتنے میٹھے کہ خود معشوقیت بے اختیار لپٹ لپٹ کر بلائیں لینے لگے"[1]

اس نظم میں بیوہ کے احساسات اور جذبات کی صحیح اور مکمل ترجمانی کی گئی ہے۔ عابد حسین لکھتی ہیں کہ۔

"مجھے مناجات بیوہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی باوجود ہونے کے ایسا حساس۔ اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کہ ان بدنصیب بیوہ عورتوں کے صحیح جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ خود اس کیفیت سے گذرا ہو۔

---

[1] ہندوستانی جلد ۶ عدد ۳ بحوالہ حالی صفحہ ۶۶ - ۶۷

لیکن یہی تو اصلی شاعر کا کمال ہے کہ ہر ایک کی بیتی جو دل پر گزرتی ہے اور تب ہی وہ ایسی زندۂ جاوید چیز لکھ سکتا ہے جیسی مناجات بیوہ "[1]

اس نظم کی سلاست و روانی، زبان و بیان، سوز و گداز، درد و اثر نہ صرف اردو شا میں یکتا و بے مثال ہے بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی "سوز بیوگی" کو اس قدر درد اور پر اثر انداز میں بیان کرنے سے قاصر رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس نظم کا ہندوستان کی متعد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے یہاں تک کہ "سنسکرت میں بھی ترجمہ کی جا چکی ہے"[2] اور روز بروز اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

حالی کی مثنویوں نے اردو شاعری میں ایک نئی شاہراہ، قائم کی، روشنی کا ایک نیا مینا تعمیر کیا اس کو نیا آہنگ، نیا ساز دیا۔ اس سازمیں سچائی، سادگی، درد، خلوص، ایثار، قربانی، خود اور خود اعتمادی ہے۔ وطن و قوم کی داستان ہے۔ سماج کی بیماریوں کا علاج ہے۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے لیکن اس کی وجہ سے ان کی شاعری کہیں کہیں میکانکی ہو گئی۔ ان کی چند مثنویوں کو چھوڑ کر باقی مثنویاں ناہموار ہیں۔ ان کی افادیت و اہمیت مسلم ہے مگر ان میں شاعری کی وہ روح نہیں ہے جو دلوں کو وجد میں لاتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اردو شاعری میں اپنی مثنویوں کے ذریعہ سے نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اس کو مفید خیالات، و جذبات سے مالا مال کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ اس کے ساتھ شانہ بشانہ چل سکے

"جدید شاعری کے خیال، اس کے اصول اور اس کی ضرورت کو عوام اور خواص میں مقبول بنانے کی جیسی مخلصانہ کوشش حالی مرحوم کی تھی اور کسی نے نہ کی"[3]

اس کوشش کے نتائج مفید برآمد ہوئے ان کی مثنویوں کا اثر اردو شاعری اور شعراء کافی ہوا اور نیچرل شاعری کا سکہ رائج ہو گیا مثنویوں میں قومی و ملکی، اصلاحی و اخلاقی، اور نیچرل خیالات کا اظہار ہر شاعر کے لئے باعث فخر ہو گیا۔ ہر موضوع پر مثنویاں لکھنے کا رواج عام ہوا اور اس کے لئے

"اردو شاعری اور اردو کے پرستار ہمیشہ حالی کے شکر گزار رہیں گے"[4]

---

[1] یادگار حالی صفحہ ۱۲۲

[2] " " " ۱۲۳

[3] جدید اردو شاعری مولانا عبدالباری آسی صفحہ ۱۰

[4] یادگار حالی صفحہ ۱۲۳

مراثی

مولانا حالی نے مرثیہ کا ذکر قصیدہ کے سلسلہ میں کیا ہے وہ مرثیہ کو بھی قصیدہ کا ایک حصہ سمجھتے تھے فرق صرف اتنا ہے کہ

"ممدوح (کی) تعریف کو قصیدہ کہتے ہیں اور مرثیہ (میں) ممدوح کے اوصاف حمیدہ اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں"[1]

اردو میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر "شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہداؑ کے مرثیہ پر ہوتا ہے" جس کو مرزا دبیر اور میر انیس معراج کمال تک پہونچا چکے تھے۔ مولانا حالی خاص طور پر میر انیس کے مداح ہیں ان کے نزدیک میر انیس نے

"اردو شاعری میں جو کہ ماورا آکاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی، حرکت پیدا کی، اظہار [illegible] کر دیا۔ بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں [illegible] پیدا کر دیئے"

مرثیہ کی بدولت اردو شاعری کا دامن اخلاقیات [illegible] مالا مال ہو گیا بلکہ ان کے خیال میں میر انیس کی شاعری اخلاقیات کے اعتبار سے فارسی و عربی شاعری سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی شاعری میں بھی ایسے [illegible] میر انیس کی [illegible] اخلاق بیان کئے گئے ہوں"

اس اعتراف کے باوجود کہ مرثیہ بلحاظ پایہ کے اخلاقی شاعری ہے [illegible] مضامین کی افراط ہے۔ رزم و بزم، فخر و مباہات اور دیگر اخلاق فاضلہ [illegible]

"نئی دہلی کے شاعروں کو ہرگز یہ خیال نہیں [illegible] یا اور مرثیہ گویوں کا اتباع کریں"

اس ممانعت کے اسباب حسب ذیل بتائے ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ "یہ امید نہیں کہ اس خاص [illegible]

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحات ۲۶۳ [illegible]

۲- دوسرے یہ کہ "مرثیہ میں رزم و بزم خود ستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا لمبی لمبی تمہیدیں اور تو طیئے باندھنا گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے، مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں۔[1]

تیسرے یہ کہ "مرثیہ کو صرف واقعہ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کو دھراتے رہنا ..... شاعری کو محدود کرنا ہے۔[2]

"پس شاعر جو کہ قوم کی زبان ہوتا ہے جس کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ جب کسی موت سے اس کے یا اس کی قوم یا خاندان کے دل کو فی الواقع صدمہ پہونچے اس کیفیت یا حالت کو جہاں تک ممکن ہو درد اور سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے۔[3]

مولانا حالی قومی مرثیہ لکھے جانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"قوم میں قومیت کی روح اس طرح پھونکی جا سکتی ہے کہ قوم کے افراد مثل ایک خاندان کے ممبروں کے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں۔ زندگی میں ان کی نیکیوں کو چمکائیں اور مرنے کے بعد ان کی ایسی یادگاریں قائم کریں جو صفحۂ ہستی سے کبھی مٹنے والی نہ ہوں .....

طالب فن کو اس سے نہایت عمدہ سبق مل سکتا ہے۔"

اس طرح حالی نے "نئی طرز کے مرثیوں" سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا اور اس امر پر زور دیا کہ مرثیہ کو شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس میں مشاہیر قوم اور ارباب کمال کی موت پر بھی ان کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا جائے۔ قوم کو ان کی پیروی پر ابھارا جائے۔

مولانا حالی نے اسی قسم کے خیالات اپنی ایک تقریر میں ظاہر کئے تھے جو انھوں نے حکیم محمود خاں کے تعزیتی جلسے میں اپنا مرثیہ پڑھنے سے قبل کی تھی۔ اپنے ان مشوروں پر خود عمل کیا۔ انھوں نے خود واقعۂ کربلا یا حضرت امام حسین علیہ السلام کا کوئی مرثیہ نہیں لکھا۔ شاید اس لئے کہ میر انیس مرحوم کے بعد وہ اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کا یہ فعل ایک حیثیت سے مرثیہ نگاری کے اصول اور مذہب کے خلاف اعلان بغاوت بھی تھا۔

(یوں تو مولانا حالی نے قومی بہبود، مادر وطن کی تباہی پر ہر صنف سخن میں آنسو بہائے ہیں اسی لئے انھیں قومی مرثیہ خواں کہا گیا۔ غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند ہر صنف ہے جس میں انھوں نے ملک و ملت کی تباہی کا ماتم نہیں کیا۔ مسدس حالی ملت اسلامیہ کا مرثیہ ہے اس میں انھوں نے ان اسباب کا تجزیہ کیا ہے جن کی وجہ سے مسلمان کبھی دنیا کی ایک عظیم طاقت تھے اور اب ان کے پستی کا گداز اور زوال کا سوز محسوس کرتے ہیں۔ اس کا ہر مصرع اور ہر لفظ سے ٹپکتا ہے۔)

---

[1] تا [3] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵

Marfat.com

مولانا حالی نے اردو میں حسب ذیل مرثیے لکھے ہیں۔

۱۔ مرثیہ غالب	۱۸۶۹ء میں یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے۔
۲۔ بڑے بھائی کا مرثیہ	۱۸۸۵-۸۶ء میں یہ مرثیہ قطعہ میں ہے
۳۔ مرثیہ حکیم محمود خاں	۱۸۹۲ء میں یہ مرثیہ مسدس میں ہے
۴۔ ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ	۱۹۰۱ء میں یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے
۵۔ محسن الملک کا مرثیہ	۱۹۰۷ء میں یہ مرثیہ قطعہ یا ایک بند کی شکل میں ہے۔

مرثیہ غالب اردو شاعری میں بے مثل و بے مثال ہے۔ حالی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو میں مرثیہ ترکیب بند میں لکھا۔ حالی کو اپنے استاد سے جو قلبی محبت اور روحانی عقیدت تھی وہ اس مرثیہ کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہے۔ سنجیدگی و متانت کا پیکر، صبر و استقامت کا مجسمہ اپنے استاد کی موت پر بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ اس کا دل عالم فانی کا رنگ دیکھ کر عیش دنیا سے سرد ہو جاتا ہے اس مرثیہ میں کل دس بند ہیں۔ پہلے دو بندوں میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کر کے یہاں کی ہر چیز کو فریب اور دھوکا بتایا ہے۔

کچھ نہیں بجز طلسم خواب و خیال — گر سنے فقر و بزم سلطانی
نوں نہ اک مشت خاک کے بدلے — سنکڑے خاتم سلیمانی
بحر ہستی بجز سراب نہیں — چشمۂ زندگی میں آب نہیں

یہ بے مروت و بے رحم دنیا آج تک نہ کسی کی ہوئی ہے اور نہ کبھی کسی کی ہوگی؟

جس سے دنیا نے آشنائی کی — اس سے آخر کو کج ادائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ — ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
خندۂ گل سے بے ثبات تر ہے — شان ہو جس میں دلربائی کی

آخر کلیجہ پکڑ کر، پرسوز آواز میں کہتے ہیں۔

رشک عرفی و فخر طالب و مرد — اسد اللہ خاں غالب مرد

یہ کہنا تھا کہ مرنے والے کی ایک ایک بات اور خوبی یاد آجاتی ہے۔ غالب کا چہرہ

بلبل ہستند مرگ بیدلیہا ست — جس کی کتنی ہی بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج — رند اور مرجع کرام و ثقات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یاں اگر ذات تھی، تو اس کی ذات

Marfat.com

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا　　شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

اپنے استاد کے فضل و کمال کا اظہار کس خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

نثر حسن و جمال کی صورت　　نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر　　تعزیت اک ملال کی صورت
لطف آغاز سے دکھاتا تھا　　سخن اس کا مآل کی صورت

نقد معنی کا گنجداں نہ رہا　　خوان مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہار سخن　　اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا اک ایک کاروان سالار　　کوئی سالار کاروان نہ رہا
اہل ہنداب کریں گے کس پر ناز　　رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا
اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن　　کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

وہ پیکر اخلاق تھا، اس کا اخلاص، اس کا کردار، آدمیت کے لئے باعث فخر تھا۔

خاکساروں سے خاکساری تھی　　سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا گلا　　دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے　　زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب　　ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا
مظہر شان حسن فطرت تھا　　معنی لفظ آدمیت تھا

یہی وجہ ہے کہ اس پیکر انسانیت کے ماتم میں اپنے بیگانے سب اشکبار ہیں۔

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج　　اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
نازش خلق کا محل نہ رہا　　رحلت فخر روزگار ہے آج
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی　　اسکی چپ سے جگر فگار ہے آج
غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد　　کس سے خالی ہوا جہان آباد
کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں　　آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیت حزن　　ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
وہ گیا جس سے بزم تھی روشن　　شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں
ماہ کامل میں آگئی ظلمت　　آب حیواں پہ چھا گئی ظلمت

کس بھولے پن سے کہہ رہے ہیں؟ لیکن یہ بول کتنے درد بھرے ہیں؟

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں　　اہل میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو　　سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

تاکہ آج یہ آخری دیدار جی بھر کے کر لیا جائے۔ اس کے بعد پھر ہم کہاں اور غالب کہاں"؟

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے　　غالب بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ　　کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

آخری بند میں غالب کی خصوصیات اور مرحوم سے اپنے روابط کا ذکر کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں اظہارِ غم کر رہے ہیں؟

ہند میں نام پائے گا اب کون؟　　سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون؟

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے　　جا کے دلی سے آئے گا اب کون؟

مر گیا تشنۂ مذاق کلام　　ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون؟

تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک　　ہم کو چالیں بتائے گا اب کون؟

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون؟

حالی کے صدپارۂ دل میں سے یہ نے چند پارے پیش کر دیئے۔ اس مرثیہ سے اردو میں ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی۔ اردو میں پہلی مرتبہ ترکیب بند میں مرثیہ لکھا گیا۔ فارسی میں محتشم کاشی کا مرثیہ ضرور موجود تھا۔ شخصی مرثیوں میں ملک و ملت کے احساس کے ساتھ یہ مرثیہ اپنی زبان کی سلاست و روانی اور اپنے بیان کی اثر آفرینی میں شاہکار تسلیم کیا گیا ہے جس پر" اردو شاعری جس قدر ناز کرے کم ہے"[1]

دوسرا مرثیہ حالی نے اپنے بڑے بھائی کی موت پر لکھا جس بھائی نے انھیں بیٹے کی طرح پالا تھا۔ اس کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد حالی بے سہارا ہو گئے اور بچوں کی طرح پھوٹ بہے۔ یہ مرثیہ قطعہ کی شکل میں ہے۔ حالی نے اسے نئے انداز سے شروع کیا ہے۔

کل سوگ میں بھائی کے اسے دیکھ کے چپ چپ　　حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحرِ معانی!

خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا　　کیا ہو گئی ہے تیری طبیعت کو روانی

حالی نے جواب دیا۔ یہ جواب انتہائی غم انگیز ہے۔

ایک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے　　دل ہل گئے اور بحر رکے پانی

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت　　مشکل ہے کہ کچھ دل کی زبانوں کو دکھائی

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے　　موت ایک کے آگے ہے نہ رہ ایک کو آنی

---

[1] شعر الہند دوم، صفحہ ۳۶۲

Marfat.com

بر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی　　غم بھائی کا مرجانے کی ہے اس کے نشانی

اس کے بعد بھائی کی محبت و شفقت اور ان کے تمام احسانات کا ذکر کر کے اپنی بے کسی پر آنسو بہائے ہیں

جیتا بھی رہا بھائی مگر اس بھائی کے پیچھے　　لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو　　کیا ڈھونڈھتے ہو اسکی طبیعت میں روانی
یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ　　یہ چپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر　　ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

یہ صحیح ہے کہ "اس میں شاعری کی وہ فنی خوبیاں پیدا نہیں ہو سکیں جو غالب کے مرثیہ میں ہیں۔ پھر بھی درد و اثر اس مرثیے میں بھی کم نہیں ہے"[1]

اس کی خاص وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حالی کے دل میں قوم کا درد ذاتی درد سے زیادہ ہو چکا تھا غالب کی موت تنہا غالب کی موت نہیں تھی بلکہ ایک ایسے دور کی موت تھی جس میں علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا عروج تھا۔ مرزا غالب کے ساتھ یہ سب روایات وابستہ تھیں لیکن بھائی کی موت سے ملک و ملت کو کوئی نقصان نہیں ہوا ذاتی رنج و غم خواہ کتنا زیادہ ہی کیوں نہ ہو ملت کے غم سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ اس مرثیہ سے کہیں زیادہ تاثرات غم حکیم محمود خاں کے مرثیہ میں موجود ہیں کیونکہ حکیم محمود خاں کا مرثیہ تنہا ان کی ذات کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ غالب کی طرح پوری ملت اسلامیہ کا مرثیہ ہے اس میں جہان آباد کی عظمت و دولت اس کے عروج و اقبال، اس کے علوم و فنون اور اس کے ہنر و حکمت کا ماتم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے الفاظ میں

"اس میں دلی کی تباہی اور مسلمانوں کی پستی کا ذکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز طریقہ سے کیا ہے"[2]

یہ مرثیہ مسدس میں ہے اس میں کل چھیاسی بند ہیں۔ ابتدائی دس بندوں میں دلی کی مرکزیت شہرت اور عظمت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اے جہان آباد اے اسلام کے دار العلوم　　اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنر ور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم　　تھا افاضہ تیرا جا دی ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

---

[1] یادگار حالی صفحہ ۲۰۹　[2] تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۱۴

Marfat.com

لیکن جب گردش افلاک نے اس مخزن العلوم اور مرکز علم و دانش کو جو حسن صورت و حسن سیرت میں بے مثال تھا انقلاب زمانہ کے ہاتھوں تباہ برباد کر دیا تو

چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب — مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب — اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب
جن کو کھو بیٹھے نظیر ان کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی — ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی — اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

اس کے بعد حکیم محمود خاں کے عادات و خصائل، فضائل و کمالات، ان کا تبحر علمی، فن طب پر ان کا کمال، ان کی انسانی ہمدردی، ان کی مقبولیت و ہر دلعزیزی، ان کی حق گوئی و بے باکی، انقلاب ۱۸۵۷ء میں ان کی جرأت و ہمت مظلومین کی امداد و معاونت پر اور اسی قسم کے دوسرے تمام محاسن کا ذکر کیا ہے۔

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار — قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار
گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب باد بہار — رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار
کہتے ہیں جب ان حوادث کی نظر انجام پر
قوم میں اک ہم کو سناٹا سا آتا ہے نظر

حالی کو مستقبل تاریک نظر آتا ہے ان کے دل پر مایوسی چھا جاتی ہے۔

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا — مرثیہ ہے ایک کتاب نوحہ ساری قوم کا

ایسے پر آشوب زمانہ میں فن کی ساری وسعتیں ختم ہو گئیں، جس بخشش کے افسانے سنے تھے اور لکھنے کا وقت آیا تو قصیدے لکھ کر خلعت و انعام پانے کی تو قع رہی تھی وہ بھی ختم ہو گئیں، دلوں کی بستیاں اجڑ گئیں اور گذشتہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں، کس حسرت و یاس کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔

یہ تھی ہم کو ملال افسانہ اس محفل میں کم کم — ترانہ رنگیں کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
نالہ و فریاد کا تو تھا کہیں یارا کہ نہ سم — ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا

Marfat.com

۱۹۰۱ء میں حالی نے ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے لکھا۔ یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے۔ یہ مرثیہ چھ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں گیارہ اشعار ہیں۔ یہ مرثیہ

"حقائق و واقعات سے پُر اور جذبہ و اثر سے لبریز ہے"[1]

اس مرثیہ میں بھی حالی نے اخلاقی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔

شاہ ہوں یا ہوں گدا محکوم ہوں یا حکمراں — وہ نہیں مرتے کبھی جیتی ہیں جن کی نیکیاں
جاگتا ہے ان کا تار و زر قیامت تک نمیک — گو کہ ہیں وہ بے خبر سوتے لحد کے درمیاں

تیسرے بند میں حالی نے انجیل مقدس کی کوئی نہ کوئی تلمیح نظم کی جن میں دنیا کے مصائب و آلام کو بے حقیقت بتایا گیا ہے یہ مرثیہ چونکہ کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے لکھا گیا تھا اس لئے آخر میں کالج کا ذکر کر کے نائب السلطنت کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ہے علی گڑھ میں ہماری یہ جو قومی درس گاہ — ہے حقیقت میں یہ تیرے نام کی اک یادگار
اس کی رسم فونڈیشن اور جشن تیسری — دونوں تقریبیں ہوئی ہیں ایک ہی وقت آشکار
جب تلک قائم ہے کالج جب تلک باقی ہے قوم — یہ شہنشاہی عطیہ یاں رہے گا یادگار

آخری مرثیہ نواب محسن الملک کی وفات پر ۱۹۰۷ء میں لکھا۔ اس مرثیہ میں کل نو شعر ہیں۔ حقیقت نگاری اور جذبات نگاری اور درد و اثر ہر شعر میں موجود ہے افسوس کہ یہ ملک کا محسن مسلمانوں کا غمخوار اور سید کا بدل قوم کی مہم سر کر کے چلا گیا اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک ملک کو عزادار بنا گیا۔

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غمخوار — سر کر کے مہم قوم کی کام آ گیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا — پر مر کے خلوص اپنا وہ سنوا گیا آخر

مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حالی نے اس مرثیہ میں "حقیقت نگاری اور جذبات نگاری جن مختصر الفاظ میں کی ہے اس کی مثالیں بہت کم ہماری زبان میں ملتی ہیں"[2]

ان مرثیوں میں متحرک کے سچے محاسن اور اوصاف اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ دوسرے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ ان میں نیک بننے، نیکیاں پھیلانے، ملک و ملت کی خدمت کرنے کا جوش اور ولولہ پیدا ہو۔

---

[1] تذکرہ حالی ص ۱۰۴ [2] حالی کا ذہنی ارتقاء ص ۲۰۴

Marfat.com

حالی نے مرثیوں کو کسی مخصوص صنف میں محدود نہیں رکھا بلکہ مسدس، قطعہ، ترکیب بند میں لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　نالہ پابند نے نہیں ہے

آسان زبان، سلجھا ہوا بیان، سادگی، خلوص، دلسوزی و دردمندی، ان مرثیوں کا طرۂ امتیاز ہیں ان میں سماجی شعور اور قومیت کے احساس کی جھلک نمایاں ہے۔

رباعیات

مولانا حالی نے رباعی کو ایک خاص مناسبت کی وجہ سے غزل کے ذیل میں داخل کیا ہے ان کے خیال میں شاعر کے جذبات و خیالات کے اظہار کا

"کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا"[1]

اور "بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے"[2]

انھوں نے غزل اور مثنوی کی طرح رباعی یا قطعہ پر جداگانہ بحث نہیں کی ہے۔ بظاہر اس کے اسباب یہ معلوم ہوتے ہیں کہ

وہ رباعی کو غزل کا ایک جزو سمجھتے تھے۔

اردو شعرا نے رباعی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی وہ کبھی کبھی مختلف موضوعات پر رباعیاں لکھ لیتے تھے۔ ان کی زیادہ تر توجہ غزل اور [illegible] اور مثنوی کی طرف رہی۔ شاعروں کی عدم توجہی کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے کہ رباعی کی چند مخصوص بحریں ہوتی ہیں جن کی پابندی کرنا لازمی ہے۔ ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے خیالات کا ادا کرنا [illegible] آسان نہ تھا۔

عام طور پر رباعیوں کا موضوع بھی مشکل ہوتا ہے یعنی ان میں پند و نصائح، مذہب و اخلاق، فلسفہ و تصوف کے مضامین لکھے جاتے ہیں

رباعی اپنی ہیئت اور اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت مفید مگر مشکل صنف سخن ہے اس کو اصلاحی و اخلاقی، سیاسی اور سماجی، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین کے لحاظ سے امتیاز حاصل ہے۔ اردو میں دوسرے شعرا کے مقابلہ میں مرثیہ گو شعرا نے رباعیاں زیادہ لکھیں۔ مرثیہ و [illegible]

---

[1] [2] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۷

اور میر انیس کی رباعیوں کو اردو ادب کا بہترین سرمایہ کہا جاتا ہے خاص طور پر میر انیس کی رباعیاں کافی مشہور و مقبول ہوئیں مولانا حالی شیخ سعدی کے ساتھ میر انیس سے کافی متاثر ہیں۔ وہ میر انیس کو سرتاج الشعراء اور لکھنؤ اور دلی دونوں کی آنکھ کا تارا سمجھتے تھے۔

دلی کی زباں کا سہارا تھا انیس　　اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلی جو پڑھتی تو لکھنؤ اس کی بہار　　دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

لکھنؤ اور دلی دونوں کا یہ دعویٰ صحیح تھا۔ انیس نے زیادہ تر رباعیاں مذہب و اخلاق پر لکھیں حالی کی شاعری کا میدان بھی اصلاح و اخلاق تھا اسلئے وہ فطری طور پر رباعیاں لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے مشن کی تبلیغ و ترویج رباعیوں کے ذریعہ سے کی رباعی میں وہ اپنے خیالات کو بڑی خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اثر ہوتا ہے رباعیوں ہی کی بدولت قوم نے انھیں سعدی ہند کا لقب دیا۔

حالی نے دیوان کے ساتھ اپنی رباعیاں بھی شائع کی تھیں اس کے بعد رباعیات حالی کے نام سے متعدد ایڈیشن علیحدہ شائع ہوئے۔ رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔ اب تک حالی کی ۵۳ رباعیات کا علم ہوا ہے جن میں سے ۵۰ کلیات نظم حالی جلد اول مرتبہ شیخ محمد اسماعیل میں موجود ہیں۔ بقیہ تین رباعیاں نواب محسن الملک مرحوم کی خدمات پر ہیں۔ [1]

حالی کی رباعیات کا موضوع دینی و دنیوی اصلاح و ترقی ہے۔ عام طور پر انھوں نے اپنی رباعیوں میں حسب ذیل مضامین لکھے ہیں

مذہب و اخلاق　فلسفہ و حکمت، تعلیم و تربیت، ادب و سیاست،
تمدن و معاشرت　پند و موعظت، ملک و ملت، کردار و عمل۔

حالی کی رباعیوں کا معتدبہ حصہ مذہب و اخلاق کے متعلق ہے۔ مذہب میں سب سے زیادہ

---

[1] یہ رباعیاں حسب ذیل ہیں۔ (منقول از نقوش شخصیات نمبر ۲۔ صفحہ ۱۵۰۶)

۱　دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا　　خدمت کے لئے قوم کی مر کے جیا
پیری ہوئی سد راہ اس کی نہ مرض　　صدیوں کا جو تھا کام وہ برسوں میں کیا

۲　پیری میں جوانوں کو کیا مات اس نے　　آرام پہ اپنے مادر ذات اس نے
تدبیر سے محنت سے دکھا دی اس کو　　کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

۳　مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر　　گل علم کا برما میں بچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی　　وہاں آب حیات سب کو پلایا جا کر

Marfat.com

رباعیاں وحدانیت پر ہیں۔ توحید و نعت کے سلسلہ میں جو رباعیاں ہیں، ان میں مذہبی رواداری مساوات انسانی، عالمی محبت، اور ہمہ مذاہب کی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر مذہب و ملت کے ماننے والے، براہ راست یا بالواسطہ ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں اور سب وحدانیت کے قائل ہیں کوئی صنم میں اس کا جلوہ دیکھتا ہے، کوئی آگ پر اسی کے راگ گاتا ہے۔ یہاں تک کہ منکر و ملحد بھی 'مادہ' کا اقرار کر کے خالق کائنات کو تسلیم کرتا ہے۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

اس کی موجودگی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو بے ساختہ اسی کی یاد آتی ہے اور انسان اسی کو پکارتا ہے۔

طوفان میں ہے جب جہاز چکر کھاتا　　جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا　　والا تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

حمد و توحید کے بعد نعت کے متعلق رباعیاں ہیں۔ ہادی اسلام نے تشریف لا کر لوگوں کو توحید سے روشناس کیا۔ اور تصور ہی کی بدولت دنیا کے بچھڑے ہوئے گلے مل گئے۔

زہاد کو تو نے محو تسبیح کیا　　عشاق کو مست لذت دید کیا
طاعت میں، ریا نہ حق کے باغی کو کوئی　　توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف　　یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو نہیں کچھ تجھ پر　　آبا کو بھی ہے تیری ابوت سے شرف

حالی کی رباعیات میں اخلاقی و اصلاحی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے قوم کی پستی و بدحالی کو دور کرنے اس کو محنت و مشقت، ہمت و حوصلہ، جوش و استقلال کے ساتھ کام کرتے رہنے اور اعلیٰ کردار، بلند اخلاق پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے۔ انھوں نے [illegible] طلبی کے بجائے [illegible] اور جائیت کے جذبات بیدار کیے۔ اس کو عمل کی طرف توجہ دلائی [illegible] کا درس دیا۔

گر چاہو کہ جیتے جی بھلا نام کرو　　اپنوں کو سلوک نیک سے رام کرو
پر مد نظر ہو شکر خدا سے ابدی　　بیکسوں کو آسرا بنا کام کرو

محنت و ہمت کے ساتھ کام کرنے میں کامیابی اور ترقی کا راز پنہاں ہے۔ آرام طلبی اور تعیش پسندی تباہی اور ہلاکت کے مترادف ہے۔

Marfat.com

محنت ہی سے چلتی ہیں یاں ہر اک دکانیں — محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو نہ ملی قوم کی چوپانی — جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

عشرت کا تمر تلخ سدا ہوتا ہے — ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں — کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

اس لئے انھوں نے کہا ہے کہ یہ دنیا کلیگ نہیں ہے بلکہ کرجگ ہے۔ جب تک جہد سرگرم عمل رہ

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو — روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کوئی آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے — آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی جی میں ٹھان — طبلی کا پیام وہ چلا آتا ہے

معاشرہ کی ایک ایک خرابی پر حالی کی نظر تھی غیبت و بدگوئی، مکر و ریا، نخوت و غرور، خود بینی و خود پسندی، نفاق و شقاق، بے پروائی و بے غیرتی، جہالت و اسراف، کاہلی و پست ہمتی، نکبت و افلاس کے نتائج سے خبردار کیا ہے۔

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں — بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی پہ ہے فخر و ناز یاں — خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

آباد کوئی ملک پر اطمینان — اولاد کو سستی پہ قناعت کا گماں
بچے آوارہ اور سپہ کار جواں — ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہماں

زوال ملت اسلامیہ کا غم حالی کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے اس کی بے حسی و بے عملی پر انھیں بے حد افسوس ہے اس کی تباہی و بربادی نے حالی کو مایوس کر دیا ہے۔

صحرا میں جو پایا اک چٹیل میداں — برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشاں
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقاں — یاد آئی تمہیں قوم کے ادبار کی شاں

علم کی عظمت و اہمیت و افادیت پر حالی نے کئی رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کے نزدیک علم ہی سرمایہ ابدی ہے اسی سے دین و دنیا دونوں سنورتی ہے وہی دونوں جہاں کی آسائش ہے۔

اے علم کیا ہے تو نے مٹتوں کو نہاں — غائب ہوا تو جہاں سے نہ بن آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح — جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

Marfat.com

اے علم کلید گنج شادی کوہے　　سرچشمۂ نعماء ایادی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سایہ میں ترے　　دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

عشق جو ہوا و ہوس کا مترادف ہو چکا تھا۔ قوموں کی تباہی کا خاص سبب تھا۔ مولانا حالی اس سے سخت بیزار و متنفر ہیں۔ اس کو ہزاروں بیماریوں کا گھر بتاتے ہیں۔

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا　　یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر　　اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

اکثر رباعیوں میں مناظرہ کی شان پائی جاتی ہے۔

دولت نے کہا مجھ سے ہے عزت ہے جہاں　　فرمایا ہنر نے میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی "غلط ہے دونوں کا بیاں　　میں، بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

اک مرد توانا کو جو سائل پایا　　کی میں نے تلاش دولت شرمایا
بولا کہ "ہے اسکا ان کی گردن پہ وبال　　دے دے کے جنہوں نے مانگنا سکھلایا"

مولانا حالی سیاسی آدمی نہ تھے لیکن سیاسی شعور ان میں موجود تھا انھوں نے رباعیات میں اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ ہنگامۂ مسجد کان پور، ٹیکس، سبب زوال سلطنت پر جو رباعیاں لکھی ہیں ان میں سیاست کی جھلک موجود ہے۔

واعظ نے کہا کہ "وقت سب کھاتے ہیں ٹال　　اک وقت ہے اپنے نہیں ٹلتی کو اجل
کی عرض یہ اک بیٹھے نے اٹھ کر کہ حضور　　بے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح ٹل

مولانا نے حزنیہ اور مدحیہ رباعیاں لکھی ہیں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محسن الملک اور دیگر حضرات کی موت پر غم کے آنسو بہائے ہیں۔

غالب ہے نہ شیفتہ، نہ نیر باقی　　وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو　　یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

ہمت، استقلال، جوش و حوصلہ، وقت کی قدر و قیمت پر حالی نے متعدد رباعیاں لکھی ہیں۔ کم ہمتی اور بزدلی کی برائیاں کی ہیں۔ وقت کو دوست، یادگار، تیغ اور [illegible]

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ　　[illegible]
ہو جائے اگر تو ایک ہمارا ساتھی　　[illegible]

جبریہ وقدریہ فرقوں کے پیدا ہونے کا مذہبی سبب کوئی ہو [illegible] کرتی، بتاتی ہے۔

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار　　دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور　　جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

بعض رباعیوں میں شان تغزل موجود ہے۔

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گزرے　　اک خستہ جگر کی رات کیونکر گزرے؟
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی　　یہ چار پہر کی رات کیوں کر گزرے؟

بڑھاپے کی مجبوری اور بے کسی پر متعدد رباعیاں ہیں۔

علم و عمل و کتاب سے نفرت ہے　　لکھنے پڑھنے کے نام سے وحشت ہے
تو نے ہر درد سر سے دی آ کے نجات　　پیری! رحمت ہے تجھ کو صد رحمت ہے

پیری نہیں منزل فنا ہے گویا　　اب کوچ کا وقت آ لگا ہے گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کا فور　　اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

چند اور عنوانات کی رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

صلح کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں　　شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ جہنم ہے دنیا　　وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بدائے تسرزند　　اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں　　ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

احسان بے منت

احسان کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو　　تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو اگر احساں تو کر دو اے عام　　اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنوں نہ ہو

حالی کی رباعیوں میں مصلح کا دل، سیاست داں کا دماغ، ماہر تعلیم کا ذہن، فلسفی اور حکیم کی نظر سب کچھ موجود ہے۔ ان کی ژرف نگاہی نے جو دیکھا، ان کے شعور نے جس طرح زمانے کے حالات کو سمجھا اور انھوں نے زندگی میں جس قسم کے تجربات، حاصل کئے ان سب کا نچوڑ ان کی رباعیاں ہیں۔ یہ

"علم و حکمت کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ جو بھی رباعی لیجئے ایک کامل فن کار کا شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ خوبصورت اور اثر انگیز۔"[1]

---

[1] ذکر حالی۔ صادق قریشی صفحہ ۸۶

Marfat.com

رباعیات کی زبان عام طور پر نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ کسی کسی رباعی میں گراں اور ثقیل الفاظ آگئے ہیں یا تعقید لفظی پیدا ہوگئی ہے لیکن معنوی اعتبار سے ان میں کوئی خاص خامی نہیں ہے۔ ہندی کے دوہوں کی طرح مثالیں صاف اور رسا منے کی ہیں، جو دل پر اثر کرتی ہیں۔ ان رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے[1]۔ غرض اردو ادب میں حالی کی رباعیات کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور

"انیس کی رباعیوں کے بعد اردو شاعری میں حالی کی رباعیاں سب سے بلند درجے کی کہی جا سکتی ہیں[2]۔"

قطعات

اردو شاعری میں قطعات نویسی کی ابتدا درحقیقت غزل گوئی کی مرہون منت ہے۔ غزل میں جب شاعر کسی خیال کو ایک شعر میں ادا نہیں کر سکتا تھا تو اسے دوسرے شعر میں اپنے خیال کی تکمیل کرنا پڑتی تھی اس طرح کے دو شعر قطعہ بند اشعار یا قطعہ کہلاتے ہیں ان قطعوں میں ایک ہی خیال یا جذبہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ یہ قطعات غزل کا اہم حصہ ہوتے ہوئے بھی معنویت کے لحاظ سے اپنی انفرادی اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔

"غزلوں کے اندر قطعہ بند اشعار کے جو تجربے ہوئے ان کے علاوہ ایک الگ صنف کی حیثیت سے بھی قطعہ نگاری کے تجربے ہوئے ہیں ان تجربوں کے سہارے موضوع اور ہیئت کا ایک نیا پیکر تیار ہوا لیکن اس پیکر کو شان مجبوبی عطا نہ ہو سکی[3]۔"

یوں تو ہر شاعر نے قطعات لکھے۔ میر، سودا، نظیر اکبر آبادی، ذوق، غالب، مومن وغیرہ ہر ایک کے قطعات موجود ہیں لیکن نظیر اکبر آبادی کے علاوہ کسی نے بھی قطعات پر کوئی شعوری طور پر توجہ نہیں دی۔

اردو شاعری جب مغربی ادب سے متاثر ہوئی اور آزاد اور حالی کی تحریک میں اس نے نیچرل خیالات و جذبات کو اپنانا شروع کیا اور نئے نئے موضوعات نظم کئے گئے تو دیگر اصناف سخن

---

[1] رباعیات کا ترجمہ مسٹر جی۔ ای۔ وارڈ نے کیا تھا۔ تاریخ ادب اردو سکسنہ صفحہ ۴۱۴

[2] یادگار حالی۔ صالحہ عابد حسین صفحہ ۲۰۲

[3] سرود شاہستی۔ پروفیسر محمد ذکی الحق صفحہ ۵۸ - ۵۹

Marfat.com

کی طرح قطعہ کی بھی قسمت جاگی شعراء اس طرف متوجہ ہوئے اور جدید نظم کے ساتھ ساتھ قطعات بھی لکھے جانے لگے۔

قطعہ میں عموماً وہی مضامین بیان کئے جاتے ہیں جو رباعی کے لئے مخصوص ہیں یعنی اس کے مضامین اخلاق و حکمت کے مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔ قطعہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ ان مسائل کو سلیس اور آسان زبان، موثر اور پرکیف انداز میں بیان کرے۔ حالی نے اپنے قطعات میں ان باتوں کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ ان کے قطعات ان کے اصلاحی و اخلاقی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں

"دل پسند انداز سے ایسی کارآمد اور سبق آموز باتیں بیان کی گئی ہیں جن سے اس زمانہ کے مسلمانوں کو خاص طور پر مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔" نصیحت کی تلخی کو جا بجا قصے، مکالمے، اور ظرافت کی چاشنی دے کر خوشگوار بنایا گیا ہے .... مضامین پر طبع آزمائی جدید مذاق کے موافق کی گئی ہے ..... نصیحت کو تمدنی و معاشرتی نتائج و شواہد سے موثر بنایا ہے[1]"

مولانا حالی نے مذہبی و اخلاقی، ملکی و ملی، سماجی و سیاسی، ادبی و تعلیمی، قریب قریب ہر موضوع پر قطعات لکھے ہیں۔ ان کے قطعات میں۔

"اخلاق و وعظ و پند کا عظیم الشان ذخیرہ ہے جس کو قومی دستور العمل کہنا مناسب ہے[2]" اکثر قطعات سبق آموز حکایات کا ترجمہ ہیں۔ ان قطعات سے وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو اعلیٰ خیالات، پاکیزہ جذبات اور اصلاح کردار کا عامل بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے بیشتر قطعات انھیں خیالات پر مشتمل ہیں جن کو وہ رباعیات میں زیادہ اور مثنوی نیز دیگر اصناف سخن میں ادا کر چکے ہیں۔ زیادہ تر قطعات مذہبی، اخلاقی و اصلاحی ہیں۔ کہیں ان میں نکبت اور افلاس کا رونا ہے کہیں خود پسندی و تفاخر کا ذکر ہے۔ کہیں علم و عمل کی ترغیب ہے۔ کہیں مکافات عمل سے آگاہ کیا ہے۔ کہیں رسم و رواج کی خرابیوں کا بیان ہے۔ کہیں اردو شاعری کا تذکرہ ہے مگر سب جگہ مقصد فلاح و اصلاح تعمیر و ترقی ہے ان قطعات میں نصیحت کی تلخی نے شعریت کو مجروح کیا ہے لیکن تاثر موجود ہے۔

مذہب میں بہت سی باتیں ظاہری طور پر یا محض رسم کی پابندی کی وجہ سے کی جاتی ہیں بڑے بڑے مذہبی اور دیندار لوگ اپنی ذاتی غرض کی وجہ سے فرائض مذہبی ادا کرتے ہیں اور اپنے

---

[1] دیباچہ قطعات حالی مطبوعہ عصر جدید پریس میرٹھ صفحہ ۲-۳

[2] یادایام۔ عبدالرزاق کانپوری صفحہ ۳۱۷

Marfat.com

کو مقدس ترین ہستی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں [illegible]
میں ظاہر کیا ہے۔ قطعات میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ان سے حالی
ہوتا ہے۔

حج کرنا مسلمانوں میں احترام و تقدس کی سب سے بڑی نگاہ سے بھی جاتی ہے
جانے والے کو ادب و عقیدت کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے لیکن یہ مقدس فریضہ بھی ریا کاری
فریب سے خالی نہیں۔ حالی نے اس کو ایک نظم میں ظاہر کیا ہے۔

ایک دیندار قرض لے کر حج کرنے جا رہے تھے کسی نے جو [illegible]
ناواقف تھا جب اعتراض کیا۔

کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز [illegible] اطفال کو بجاں تباہ
نہ نان و نفقہ فرزند و زن سے خاطر جمع [illegible] بزرگ خاطر خواہ

یہ اعتراض سن کر وہ دیندار مسلمان بپھر کر بولا اور ترشروئی سے کہا ؎

"کہ رزق کا ہے مسلماں کو حج سے اے گمراہ"

اور اس کے بعد ادھر ادھر دیکھ کر

بلا کے پاس پھر آہستہ اس نے فرمایا [illegible] آگاہ
نماز و روزہ ہو یا موعظت و ذکر و حج
اسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

نکتہ چینی غیبت اور بے اعتدالی جیسی تمام عادتیں فطرت [illegible]
کو پستی و ذلت کے غار میں ڈھکیل دیتی ہے۔ عام مرض [illegible]
تعریف بیان کرتا ہے۔ حالی اس راز سے [illegible]

اے دل بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں [illegible]
بیگانے اپنی بڑائی پر [illegible]
اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مختلف طریقے ہیں۔ کوئی [illegible]
کوئی خاموشی سے اپنی تعریف سنتا ہے۔

کہتا ہے ایک کنفیسی حماقت ہوئی ہے آج [illegible]

Marfat.com

کچھ اس لئے کہ ہم بھی انھیں میں ہیں یوں شمار — اہل وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ اس لئے کہ اپنا ہوا انصاف آشکار — کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں — یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا!

آخر میں حالی خود اپنے متعلق فرماتے ہیں:

حالی جو تیرے کھول رہے ہیں جہان کے — شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ تدعا
یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب — اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا
القصہ جس کو دیکھئے جاہل ہو یا حکیم — آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مبتلا

نفسیات انسانی کا اتنا گہرا شعور حالی ہی جیسے تجربہ کار اور باکمال کو ہو سکتا ہے۔

ایک اور قطعہ بے اعتدالی پر ہے۔ اس میں بے اعتدالی کی خرابیاں بتائی ہیں۔ اعتدال اور میانہ روی کی تعریف [illegible] بے اعتدالی بیماری کی نشانی ہوتی ہے۔

کم اسے خود پسند جیسے کہ [illegible] — ذرا دم لے اپنے مسخ کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو [illegible] — جو سر کو ملے ہے بس اندھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت — تو سنتا نہ کھانا دو دن بھر کے
جو کھانا تو بے حد جو پینا تو اتنا — غرض یہ کہ سر کا ہے پیٹ بھر کے

حالی نے اصلاح و ترقی نسواں کی طرف بھی توجہ کی۔ اس مسئلہ میں وہ اپنے معاصرین اور رفقا کے برخلاف "ترقی پسند" تھے سرسید احمد خاں اور دوسرے اکابر نے تعلیم نسواں اور اصلاح نسواں پر مطلق توجہ نہ کی مگر حالی چاہتے تھے کہ یہ بدنصیب اور مظلوم طبقہ زمانے بد تر سے نصف بہتر بن جائے اور ان کو بھی انسان سمجھا جائے اس سلسلہ میں نظم و نثر میں اپنے خیالات ظاہر کئے کہیں پردہ کی شدت پر مذمت لکھ رہے ہیں [illegible] کی شاعری کے تقاضا [illegible] کی مظلومیت پر چیخ کی داد دیتے ہوئے [illegible] رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صدیاں گزر گئیں، جگہ اگر وہ زندہ ہوتے ہی دفن کر دی جاتی تھیں [illegible] (بیٹیوں کی نسبت) اسی ظالمانہ رسم کے خلاف [illegible]

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہے — [illegible] دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہے بر
وہ یہی ناشدنی بربت ہے کہ جس کے کارن — [illegible] بیٹیوں سے پاتی ہیں بیوند اکثر

اور اس رسم کے نتائج، دختر کشی کی رسم سے بھی زیادہ خراب ہوتے ہیں جو کہ سیاہ، دور جاہلیت کی کرتوت دفن کر دیا جاتا تھا اور آج کل [illegible]

Marfat.com

[illegible]

لیکن ہندوستانی سماج میں آج بھی یہ [illegible] جاری ہے۔

شعر و شاعری کے متعلق کئی قطعات ہیں۔ ان میں حالی نے اپنے شعری نظریات پیش کئے ہیں۔ شعر و خطابت، مشاعرہ کی طرح، غزل، لکھنے کا طریقہ، دلی کی شاعری کا تغزل، شعرا کا سلطنت میں دخل دینا۔ ان سب قطعات میں شعر و شاعری اور شاعروں پر تبصرہ کیا ہے اور شاعری کو حقیقت پسند بنانے پر زور دیا ہے۔

دلی کی شاعری کا تغزل زبان کی حد بندیوں سے خلاف خامیوں مگر موثر استعجاج ہے۔ اردو زبان کو دلی اور لکھنؤ تک محدود رکھنا، زبان کی فطری توانائی اور صلاحیت، وسعت اور ہمہ گیری کے منافی ہے۔ چنانچہ اہل دلی کے اشعار اپنی [illegible] کے مقابلہ میں پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے۔

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے — پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

شعرا کا سلطنت میں دخل دینا۔ ایک طنزیہ قطعہ ہے۔ اس میں اردو شاعروں کی کمزوری اور اہل دلی کو [illegible] پر طنز کیا ہے کہ اگر شاعروں کو سلطنت کا کن بنا لیا گیا تو

شعر و شاعر کو تو ہو [illegible] — [illegible]

سلطنت کا یہ [illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور پھر شاعر کی دکھتی رگ پر واعظ نے ہاتھ رکھ دیا۔

ہیں ہنسی کی اور باتیں کچھ انصاف اگر ہے غزل میں آپ کی دیوان حافظ کا مزا

لیکن جب رسید[illegible] شاعر، واعظ کی باتوں سے متاثر نہیں ہوا اس نے علم و ادب کی ناقدردانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

اب تو کہتا ہوں کہ شاعر کی نہ واعظ کا مرید ہو جاؤں کسی استاد کا

اس لئے کہ کیا ہے، کیا ہے، کیا ہے، کیا ہے

حالی نے متانت کے ساتھ واعظ پر طنز کر دیا اور شعر و ادب کی ناقدری اور شاعروں کی کس مپرسی اور بے نوائی کا بیان بھی کر دیا۔ واعظ اور شاعر کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے یہ قطعہ نہایت مفید ہے۔

حالی کو سر سید [illegible] بہت کچھ سمجھتے تھے لیکن [illegible] ہے بلکہ سر سید کی بعض اصلاحات اور ان کے جذبۂ اخلاص سے حالی کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔ حالی نے سر سید احمد خاں کی خدمات پر کئی مضامین لکھے۔ نظم میں متعدد جگہ ان کی خدمات اور قیادت کو سراہا ہے جس سے ذیل میں تین قطعات سر سید کے متعلق ہیں۔

۱۔ سید احمد کی تکفیر ۲۔ سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ۔ ۳۔ سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

سر سید کی تعلیمی تحریک سے قدامت پسند طبقہ سخت ناراض ہو گیا تھا جب تہذیب الاخلاق میں انھوں نے اپنے مذہبی خیالات کا اظہار کیا اور اسلام کی توضیح و تشریح جدید طریقے سے کی اور شرک و بدعت کی مروجہ رسموں کی مخالفت کی تو علمائے اسلام سر سید کے سخت خلاف ہو گئے۔ کفر کا فتویٰ حاصل کرنے کے لئے حرمین شریفین تک گئے۔ ان قطعات میں حالی نے سید احمد خاں کی تائید کی ہے، ان کی مخالفت کے مختلف اسباب بتائے ہیں۔ مذہبی، سماجی، اقتصادی اور معاشی بنیادوں پر مخالفت کی جاتی تھی۔

پہلا قطعہ سید احمد خاں کی تکفیر [illegible] میں انھوں نے اسلام کی تعبیر میں اختلاف کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ سب ایک دوسرے کو اسلام کا مخالف اور دشمن سمجھتے ہیں۔

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعبیر میں بعض کے نزدیک تو جو اس کی حد تمام ہے

ہے مگر جو لڑ سکے نہ دیکھا یہ مرد میدان جو ہیں قائل اس کے ان پر کفر کا الزام ہے

بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ حصر کرنا ان تمام آرا کا مشکل کام ہے

لیکن سید احمد خاں کی تکفیر سب کے نزدیک جائز ہے۔

Marfat.com

اہل حل وعقد ہیں اب متفق اس رائے پر　　سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

سید احمد خاں کی مخالفت رشک و حسد کی وجہ سے بھی ہوتی تھی۔ سید احمد خاں کا ایک منکر یہ صاف اقرار کرتا ہے کہ

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ　　کس لئے سید سے صاف اے حضرت ہیں الانہیں
چشم بد دور آپ کا بھی جبکہ ہے مشرب یہی　　پھر یہ سید پر تبرا، آپ کو زیبا نہیں
سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے　　بات یہ ہے سن لو صاحب تم سے کچھ پردا نہیں
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں　　بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

مخلص المرتبت انسان کی مخالفت، مخالف کی شہرت کا سبب بن جاتی ہے۔ اور اس سے اس کی دماغی منفعت بھی ہوتی ہے۔ سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید ہوا اسی نفسیاتی مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک فاقہ کش مولوی، سرسید کی مخالفت پر آمادہ کیا گیا اور مخالفت کی وجہ سے دو کنبی جلد مالدار ہو گیا۔

اب سر پہ ہے اس کے تنگ بہت تنگ ہے معاش سے　　بہتوں کا پالا اس نے ہے جب سے شروع کی
دل میں یہ اب بہت ہوئی سرگشتگی بہت　　اک حضرت نجف کی آ کے لہر ہے
جھک کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آج کل　　سنتا ہوں چھپ کے شیخ سے تو سید احمد
جا اور لفظ لفظ کو اس کے چھپیڑ کر　　تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بڑا فی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گرد و پیش سے　　لگتی ہے کیسی آ کے زر سیم کی جھڑی

حالی کو عام طور پر انگریزی حکومت کا مدح خواں بتایا گیا ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے "راج کی حمایت کی ان کے انصاف اور عدل گستری کے گن گائے[1]"

کسی حد تک یہ باتیں صحیح ہیں۔ ابتدائی اور طوائف الملوکی کے بعد، امن اور سکون کا زمانہ نصیب ہوا تھا حالی کی امن پسند طبیعت، اس کو انعام الٰہی سے تعبیر کرتی تھی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کا سیاسی شعور اور آزادی و حریت کا جذبہ بیدار نہیں تھا۔ درحقیقت ملک کی سیاسی اور سماجی حالت پر ان کی نظر سب سے زیادہ تھی۔ وہ انگریزوں کی [illegible] واقف ہونے لگے تھے۔ اس موضوع پر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

---

[1] ترقی پسند ادب [illegible]

Marfat.com

[illegible] نظر رکھ کر حالی کی یہ سیاسی بیداری ان کے سیاسی شعور کی [illegible]

کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان ایک طرف گوروں کی نسلی برتری کی طرف نشاندہی کرتا ہے تو دوسری طرف کالوں یعنی ہندستانیوں کی مظلومی اور مظلومی کی ترجمانی۔ انگریزوں کی سفاکی اور بے انصافی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا اہل سب سے زیادہ ظالم اور بے رحم انگریز کو سمجھتے تھے۔ انیسویں صدی میں انگریز آقاؤں کو خوش کرنے والے حالی کی یہ نکتہ چینی آزاد پسندی اور حق گوئی کی شاہد ہے۔ اس قطعہ میں ایک کالا اور ایک گورا دونوں ساتھ ساتھ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لینے کے لیے جاتے ہیں۔ راستہ میں دونوں میں تکرار ہو جاتی ہے۔ گورا کالے کو مکا مار دیتا ہے کالا آدمی بیچارہ بیہوش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ڈاکٹر کے پاس پہنچتے ہیں اور اپنی اپنی بیماری بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ان دونوں کا حال سن کر۔

دی سند گورے کو لکھ کچھ جس سے تھا یہ مرض
یعنی اک کالا جسے گورے نے مکے سے مرے
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
ایک کالا پیٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے

اور یہ لکھا کر سائل ہے بہت آزردہ خوار
گو نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بہر لفظے ہر جا خاندار
آئے بابا اس کی بیماری کا کچھ کرتا علاج

لڑائی اور حکومت کرنا انگریزوں کی یا یوں کہیے کہ سلطنت کے قیام اور اس کی حفاظت کے لیے ضروری اور موثر تھی جانتے تھے سب سے پہلے انگریزوں نے اس نقاط انگیز سیاست کی طرف اشارہ کیا۔

[illegible]
اور مثل غلاموں کے تھی یہ بندہ دیتی
یہ سن کے سب بھر لیا کے منہ کو مارے
فرمایا کہ جو کہتی ہے تو بہر
مانو اسے اور عقل کا کہنا نہ ٹالو
کرنے کے جو کام ہیں وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اسے منہ سے نکالو

سو یہ تحریک تو بیسویں صدی کی ایجاد سمجھی جاتی ہے لیکن [illegible] کانگریس کے وجود سے پہلے) قوم کی پاسداری میں اپنے دیش کی بنی ہوئی [illegible] دیا ہے اور سلطانوں کے باہری اختلاط پر افسوس بھی کیا ہے۔

[illegible]
چاہتے ہیں [illegible] اپنے اہل ثروت کو
خورد فی چیزیں جو یاں [illegible]
الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
[illegible]
گو کہ ان کے [illegible]
ان کو ان [illegible]
جانتے ہیں دین و ایماں اپنے [illegible]

Marfat.com

حالی نے سن کر یہ جواب دیا کہ صرف انگریزوں ہی کا یہ حال نہیں ہے بلکہ دوسری قومیں بھی اپنی اپنی قوم کی محبت اور پاسداری میں اندھی ہو رہی ہیں البتہ اس عیب سے صرف امت مرحومہ بری ہے مگر

اور قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز — حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہوگا خوف ایسا نہ دشمن کے کسی دشمن کو یاں — جس قدر ہے ان سے اپنوں اور بیگانوں کو خطر

حالی کے قطعات میں ہمیں عصری رجحانات و میلانات ملتے ہیں۔ سیاسی و سماجی شعور کا احساس ملتا ہے۔ مذہبی و تعلیمی، اصلاحی و اخلاقی تحریکوں کا ذکر ملتا ہے مشرقی و مغربی کی تعلیم و تہذیب کی کشمکش ملتی ہے۔ یہ قطعات ادب اور زندگی کے تعلق کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ اردو ادب میں ان کا اہم مقام ہے۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے۔ انسانیت کو اعلیٰ اور بلند مرتبہ پر فائز کرنے میں یہ قطعات رہنمائی کرتے ہیں اگر ان کو گنجینۂ علم و حکمت کہا جائے تو بجا نہ ہوگا۔

دیوان حالی کے آخر میں چند قطعات ہیں۔ جو زیادہ تر تاریخ وفات یا تہنیت پر مشتمل ہیں حالی کو تاریخ گوئی کا ملکہ خاصا تھا انھوں نے ہر قسم کی تاریخیں لکھی ہیں۔ یہ کلام زیادہ تر فرمائشی اور رسمی ہے اس لئے اس کی اہمیت ادبی حیثیت سے کم ہے۔

ترکیب بند

ہیئت اصناف سخن کی طرح ترکیب بند بھی اردو شعراء کی بے توجہی کا شکار رہا۔ اس کے نہ ہر دل عزیز ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں تسلسل خیالات کا قائم رکھنا نہایت دشوار ہے۔ مولانا حالی نے اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے خیال میں ترکیب بند کے ہر بند میں

صرف ایک پوائنٹ (POINT) کی بات ہو سکتی ہے لیکن

ہر بند میں چند متعلق باتیں ہونی چاہئیں

اردو شعراء میں جن حضرات نے ترکیب بند کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے

لہ مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۰۴

قائم رکھتے ہوئے ترکیب بند لکھنا، ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ یہی دشواریاں تھیں کہ شعراء نے ترکیب بند میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن حالی مصلح ادب بن کر آئے تھے ان کا مسلک ہی ادبی دشواریوں کو حل کر کے نمونہ پیش کرنا تھا۔ اس لئے انھوں نے ترکیب بند میں اپنے خیالات ادا کرنے کا عزم بالجزم کر لیا سب سے پہلے اپنے استاد کا مرثیہ ترکیب بند میں لکھا یہ مرثیہ تاثرات غم کا تاج محل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بڑی نظمیں ترکیب بند میں لکھیں۔ ان کی اخلاقی تعلیمی اصلاحی، وطنی اور ملی نظمیں سب ترکیب بند ہی میں ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ترکیب بند حسب ذیل حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ مرثیہ	دو	مرثیۂ غالب۔ ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ
۲۔ تعلیم و متعلق تعلیم	دو	مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڑھ۔ مسلمانوں کی تعلیم۔
۳۔ قومی و ملی	سات	شکوہ ہند۔ قوم کا متوسط طبقہ۔ شکریہ وائی رام پور دہلی کا جلسۂ کانفرنس۔ تحفۃ الاخوان فلسفۂ ترقی انجمن حمایت اسلام اور اس کے کام
۴۔ اصلاح نسواں	ایک	چپ کی داد
۵۔ نیم تاریخی (ترجمہ)	ایک	زمزمۂ قیصری
۶۔ الوداعی	ایک	مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت

مرثیہ کی دونوں نظموں کا ذکر مرثیہ کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ ترکیب بند زیادہ تر اصلاحی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اس دور کے جتنے مسائل تھے خواہ وہ تعلیمی ہوں یا ادبی معاشرتی ہوں یا معاشرتی، سماجی ہوں یا سیاسی، ان سب کا مشاہدہ حالی نے بہ نظر غائر کیا ہے اور قوم و ملک کو ان کی ضروریات سے آگاہ کیا ہے۔ مرثیہ غالب کے بعد حالی نے 'زمزمۂ قیصری' لکھا۔ یہ ترکیب بند فرمائش پر ۱۸۷۷ء میں لکھا گیا۔ یہ نظم

"انگریزی پوئم کے تین حصوں میں سے پہلے حصہ کا منظوم ترجمہ ہے .... اس نظم کے تین حصے ہیں پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں تمام ہندوستانی رئیسوں کا جو دربار قیصری میں شریک ہوئے تھے عموماً اور حضور نظام کا خصوصاً تذکرہ ہے[1]"

انگریز مصنفوں اور مورخوں نے مسلمان بادشاہوں کو بدنام کرنے کی باقاعدہ مہم شروع کی تھی۔ اس نظم میں مسلمان بادشاہوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے۔ حالی نے اس خیال سے کہ نظم پڑھے

[1] کلیات نظم حالی صفحہ ۲-۳۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔

والے اس عیب گوئی کا ملزم ان کو نہ قرار دیدیں یہ وضاحت کر دی۔

"مصنف نے پہلے حصہ میں بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ناظرین اس کو دیکھ کر مجھ سے خوش یا ناراض نہ ہوں۔ میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں نے ان خیالات کو نظم کر دیا ہے۔"[1]

اس نظم میں کل ۳۵ بند ہیں اور ہر بند ۷۔ اشعار پر مشتمل ہے بعض بندوں میں اشعار کی تعداد پوری کرنے کی غرض سے حالی نے اپنی طرف سے، مصرع یا شعر کا اضافہ کر دیا ہے نظم کی ابتدا جغرافیائی اور تاریخی واقعات سے کی گئی ہے۔ ہندوستان کا مقام وقوع۔ آریوں کا یہاں آنا، سکندر کا حملہ مسلمانوں کی آمد، محمود غزنوی کے حملے۔ اس کا ظلم و غارت گری مسلمانوں کی حکومت مغل، سادات اور افغانوں کے مظالم، پھر سات سمندر پار سے رحمتوں اور برکتوں کا نزول۔ انگریزوں اور انگلستان کی مدح و ستائش ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اس کی تباہ کاریاں، پھر فتنۂ بغاوت کا ختم ہونا پرنس آف ویلز کی آمد، اور ملکہ وکٹوریہ کا جشن ہمایوں کے بیان کا نقشہ اس ترکیب بند میں کھینچا گیا ہے نظم کی روانی سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔

اے حصار عافیت! اے کشور ہندوستاں — زیب دیتا ہے اگر کہیئے تجھے سارا جہاں
خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ کچھ اندر کا فکر — (دست گلچیں نارسا و نخل دولت گلفشاں

چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوشگوار
ہو نہ اب کہہ دو خزاں سے رخصت انداز بہار)

ہندوستان میں بہت سی قومیں یکے بعد دیگرے آتی رہیں ان کے بعد مسلمان آئے۔ اب ذرا انگریز کی اسلام دشمنی ملاحظہ ہو۔

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند — جانب ہندوستاں محمود نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابر رحمت تھا مگر — ہندوؤں کے دل پہ اس کے ستم سے درد مند
غش پہ غش آتے تھے ہر ذی روح کے پیہم وہاں — سانس لیتا تھا جہاں وہ اژدہائے زر مند

الغرض جب وہ آیا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یاں سے تو مثل دشت ویراں تھا یہ ملک

---

[1] کلیات نظم حالی صفحہ ۳ مرتبہ اسماعیل پانی پتی

[2] مولانا حالی نے اس پر حسب ذیل نوٹ لکھا

"انگریز مورخوں اور شاعروں کو جب یہ ظلم نظر آتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحمدلی اور انسانی ہمدردی پر نوازش اور مسلمانوں پر غضبناک اور برافروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سخت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

Marfat.com

مسلمانوں کی حکومت میں ہندوستان مصیبتوں اور بلاؤں میں مبتلا رہا۔

کیا مرہٹے کیا مغل سادات کیا افغان کیا
عہد تیرا سب کے اوپر یاں بارش ابر بلا

علم و فن جہاد تھا کوئی نہ تھا سب خواب و خیال
وہم طوفاں بن کے اور عیب کا بڑھتا رہا

سب بلائیں تو زیادہ ہو گئیں اور ہندوستان غریب لڑکتا مرنے لگا تو سات سمندر پار سے نجات دہندہ آئے۔

ڈوبتے کو جب نظر آئے کنارے
تب نجات آئی یہاں سے تو سمندر پار سے

سوداگروں کی سنخیتوں سے ملک چھوٹا ایک قلم
ہند کو انہوں نے دی آکر نجات اغیار سے

آدھا اور ادا انگریز ایک فرقہ کے تھے مسلمان تھے۔ انگریزوں کا یہ مقدس فرض تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کو غیروں سے نجات دلائیں۔ انھوں نے یہ فرض بڑی خوبی، دانائی اور ہوشیاری کے ساتھ ادا کرنا شروع کیا یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب آگیا۔

منصوبہ تھا یہ نام زن کا مٹانے کے لئے
ہو گیا تار جہان دل سے ہر چھوٹا بڑا

لیکن ان کی گھاتیں تھا شوخ و رنگیلا
پھنس گئے پنجہ میں اسکے یک بیک اہل خطا

لے انگریز ہندوستان کا ہو گیا آخر گراں
گر پڑے تھم گئے آقائی کاؤس کے نشاں

ہندوستانیوں کو شکست ہو گئی، لال قلعہ سے ہندوستان کا پرچم اتر گیا، ہندوؤں کو مسلمانوں سے نجات دلانے والے بھائیوں یعنی انگریزوں کا پرچم اقبال لہرانے لگا۔ ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند بنیں۔ اسی خوشی کی تقریب میں یہ نظم لکھی گئی۔ تاکہ انگریزوں کے بھائیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اب غیروں (مسلمانوں) کی حکومت ختم ہو گئی اور اپنوں (انگریزوں) کی حکومت آگئی۔

تاکہ سب جانیں کہ رنجش ہند سے ختم ہوا
عہد ہنگامستان کا جو کچھ کہ تھا بویا ہوا

اس فتنہ انگیز نظم کو حالی پورا نہ کر سکے (بقیہ)

"پہلے حصہ کو نظم کر چکے تھے کہ مصنف نے فارسی میں نظم کرانا چاہا اور حالی نے بسبب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۹) اور تشنہ دہن خوب جانتے ہیں کہ جب تک کہ ہندوستان کے ایک ایک فرد نے انگریزی نظم کا ترجمہ حالی سے کیا ہے اس میں بھی محمود غزنوی کا ظلم و ستم جو ہندوؤں پر ڈھایا تھا بیان کیا گیا ہے۔

کرتا ہے قتل لڑکوں کو دے گھر لوٹ کے بیچ
اور بیچے گر پجاریوں کو ہندوؤں کے بیچ

لہ اپنوں سے مراد یہاں مغربی اور عیسائی انگریز ہیں اور غیروں سے مراد مسلمان ہیں۔ حالی حاشیہ صفحہ ۱۷

Marfat.com

Marfat.com

قوم کا فرض ہے کہ وہ اس شمع علم کی پروانہ بنے اور اس ریاض علم (مدرسہ) کو سیراب کر کے اسے سرسبز و شاداب کرتی رہے اور اس کی یہ آواز بغور سُنے۔

ملک میں عزت سے رہنا میں سکھاؤں گا تمھیں — سلطنت کا معتمد بننا بتاؤں گا تمھیں
قابلیت تم میں بڑھنے کی ہے دیکھوں کس قدر — بڑھ سکو گے جس قدر اتنا بڑھاؤں گا تمھیں
یاد ہوگا تم کو وہ کھویا ہوا اپنا خطاب — پھر مخاطب "تیرامت" کا بناؤں گا تمھیں

مجھ کو دیکھو گر مرے دعووں میں ہو کچھ اشتباہ
روزِ روشن آپ اپنی روشنی پر ہے گواہ

دوسری نظم مسلمانوں کی تعلیم سے ہے۔ اس نظم میں بھی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا ہے مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے کہ وہ زمانہ کی پکار سنیں۔ شاندار ماضی کی خوش فہمیوں اور خیالی دنیا کو ترک کر کے حال کو بہتر بنانے اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ انھیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی باری — جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے لازم ہے یہ ان کو — کریں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز — نہ نصّادی، نہ جرّاحی، نہ کحّالی، نہ عطّاری

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرمانروائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

اس کے بعد سرسید کے تعلیمی احسانات کا ذکر ہے اور قوم کی احسان ناشناسی کا شکوہ کیا ہے۔ لیکن یہ تو دیرینہ رسم ہے اس کا گلا کیا اور اس سے بددل ہونا کیسا؟ اس لئے سرسید کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

نہ ہو افسردہ دل اور قوم پر فیض اپنا جاری رکھ — کہ اک ہمت سے تیری بندھ رہی ہیں ہمتیں ساری

اور یہ اسی میر کارواں کی ہمت و جرأت کا کرشمہ ہے کہ

بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے منزل کا نشاں یارو — پہونچنے دو سلامت تا بمنزل کارواں یارو
کرو پورا حصار قوم کو سر جوڑ کر یارو — ہٹاؤ حملۂ دوراں کو سب جی توڑ کر یارو

یہ دارالعلم و عمل اسلامی اخوت کی کسوٹی ہے، آسیب زماں کا سدِّ راہ ہے، روز افزوں ترقی کا سرچشمہ ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان اور مسیحی سب شیر و شکر کی طرح بہم رہتے ہیں۔ یہ سب اسی محبت قوم کا اعجاز ہے۔ اسی اعتراف حقیقت کے ساتھ شکریہ ادا کیا ہے۔

ادا استاد کا حق تو ہم سے ہو سکتا ہے کیا حالی — مگر ہاں ہم کو اپنا فرض کرنا تھا ادا حالی

قومی و ملی نظموں میں حالی نے ملت اسلامیہ کے مسائل کو حل

لرنے کے مشورے دیئے ہیں شکوۂ ہند، تحفۃ الاخوان، فلسفۂ ترقی یہ تینوں ترکیب بند حالی کے حکیمانہ مصلحانہ، سیاسی، سماجی اور تعلیمی خیالات کے ترجمان ہیں۔

شکوۂ ہند میں حالی نے مسلمانوں کی سابقہ حالت کا موجودہ حالت سے موازنہ کیا ہے عرب کی شان سے جھٹکنے والے، ہندوستان میں آنے کے بعد کس طرح اور کیوں بے بال و پر ہو کر رہ گئے ان کے اندر کون کون سی خرابیاں پیدا ہو گئیں؟ اور ان سب کا انجام کیا ہوا؟ حالی نے وضاحت کے ساتھ ان پر روشنی ڈالی ہے۔

اس ترکیب بند میں کل تیرہ بند ہیں۔ پہلے بند میں مسلمانوں پر ہندوستان کے احسانات کا ذکر کیا ہے اور اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔

نقش ہیں دل پر ہمارے سب مدارات تری ہم نہ بھولیں گے کبھی دن تیرے اور راتیں تری

لیکن اس کرم بے پایاں کا انجام قوم کے حق میں نہایت مضر ہوا۔

آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں خاک میں آخر ملائے اے ہند سب تو نے ملا
یاد ہو گا تجھ کو یاں آئے تھے ہم کس شان سے تجھ کو سوگند اپنے ست جگ کی بتا ایمان سے

اس کے بعد مسلمانوں کے عادات و خصائل، فضائل و کمالات کا مفصل بیان ہے۔ احمدی اخلاق اور اسلامی اخوت کے علمبردار، شانِ عرب، آنِ عجم کھو بیٹھے، اخلاقی اعتبار سے کھوکھلے ہو گئے اور اپنے سارے خصائص اسلامی۔ اخوت، مساوات، غیرت و حمیت، خدمتِ مہمان و ہمسایہ رسمی ایفائے عہد، بے خوفی و بے باکی، محبت و صداقت، یک جہتی و اتحاد، نور علم و حکمت، سب کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ اور یہ سب ہندوستان کے ماحول کا اثر تھا۔

ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل مقرا کر دیا تو نے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کر دیا

آخری بند انتہائی دردناک ہے۔ "بانجمل کا رواں" کی بربادی گلشن اسلام پر خزاں کا ظلم دیکھ کے آنسو رلاتی ہے۔ ان اشعار میں کیسی عبرت و نصیحت ہے؟

کہہ رہے ہیں نقش پائے رہرواں اے خاک ہند! یاں سے گزرا ہے ابھی اک بانجمل کا کارواں
گو نہیں ہے رفتہ رفتہ یاد ایام سلف دل سے چھوڑے گی مٹا کر گردش دوراں
ماجرا ہو گا ہمارا عبرت اوروں کے لئے چیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستاں
برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہر جگہ پائیں گے بہت

حالی کا مقصد پورا ہوا۔ قوم خواب غفلت سے بیدار ہوئی لیکن رام بابو سکسینہ کے الفاظ میں کہ "اس مرقع میں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہو گیا ہے تو صرف اس غرض سے کہ

خوابیدہ جماعت چونکے اور اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو[1]

دوسرا ترکیب بند تحفۃ الاخوان ہے۔ یہ مشہور نظم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پٹنہ
اجلاس کے موقع پر حالی نے پڑھی تھی۔ قوم کے ایک درد مند بھائی نے اپنے بھائیوں کی خدمت
ایک تحفہ پیش کیا تھا جس میں ان کی پستی و نکبت، تنزل و ادبار کا مرثیہ دکھا کر غیرت و حمیت دلائی تھی
ان کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جوش اور حوصلہ دلایا تھا۔ ایک افسردہ دل نے ساری انجمن کو
افسردہ کر دیا تھا اور بقول اسماعیل پانی پتی

"ساری محفل مجلس عزا بن گئی تھی۔ حاضرین کے اندر دبی ہوئی آہ و بکا کروٹیں لینے لگی اور
اس نظم سے ہمدردی قوم کا جوش اس قدر اٹھا کہ جو کچھ جس شخص کے پاس تھا اس نے دے ڈالا"

اس نظم کا آغاز مقدمہ سے کیا ہے۔ پہلے بند میں یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے یہاں
کوئی کام بغیر کسی سبب کے نہیں ہوتا۔ خدا انھیں کی مدد کرتا ہے جو ان اسباب پر نظر رکھتے ہیں۔ دوسرے
بند میں قوم کی بے حسی و غفلت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ مسلمانوں کی بے عملی کو دوسری قوموں سے مقابلہ
کر کے یہ دریافت کیا ہے کہ

زندگی جس قوم کی دنیا میں گزرے اس طرح ۔۔۔ وہ ہے گویا قوم دنیا میں بتا گنگس طرح

تیسرے بند میں بھی قوم کی غفلت اور بے حسی کا شکوہ ہے نہ اہل علم کو فکر قوم ہے اور نہ اہل
دولت کو قوم کی مفلسی و بربادی کا خیال۔

ان کی غفلت کا وہ عالم ان کی فرصت کا یہ حال ۔۔۔ ہو یہ بیڑا کیوں نہ پھر منجدھار میں زیر و زبر
ہیں یہی گر قوم کے ساتھ آج سب پرائیاں
تب یہ سن لو نا فسوس اکل ہیں گھڑی در پیش ہیں

دوسری قوموں کے قافلے رواں دواں میدان عمل میں آگے بڑھتے جاتے ہیں اور کارواں ملت
غافل و بے حس ہے

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا ۔۔۔ ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے (حالی)

سنت الٰہی یہ ہے کہ

جو بڑھے گا حوصلہ اس کا بڑھایا جائے گا ۔۔۔ جو گرے گا پھر درجہ سے گرایا جائے گا

یہ جملے ہر سنے والے کے دل میں گھر کر گئے۔ حمایت اسلام تنگ نظری، اور کم ہمتی
شکار ہیا۔ ہر سننے والا دل انھیں قومی ذلت و پستی پر تڑپ رہا ہے۔ کون سا ایسا شعبہ ہے جو اس
پست و ذلیل نہیں ہیں۔

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۴۱۲ [2] کلیات نظم حالی حصہ دوم ص ۹۴

Marfat.com

اپنی پستی کے نشاں پاتے ہیں ہر منزل میں ہم — کیا بضاعت، کیا صناعت، اور کیا علم و ہنر
کون سا پستی کا درجہ اب رہا باقی ہے اس کے بعد — وہ یہ پستی ہے کہ بس خست شریعی ہے اس کے بعد

چھٹے بند میں حالی قوم کا اجتماعی احساس بیدار کرتے ہیں اور رؤسا و امرا کو اس بات کی یاد دلاتے ہیں کہ

ان کی کیا عزت ہے یارو قوم ہے جن کی ذلیل — ان کو کیا راحت ہے جن کی قوم ہے سب خستہ حال

اسلامی اخوت و مساوات کا تقاضا تو یہ تھا کہ قوم میں کوئی ذلیل نہ رہتا کوئی مفلس و نادار نہ رہتا۔ اسلئے ان کا فرض ہے کہ یا تو اسلام کی فہرست سے اپنا نام نکال لیں۔

ورنہ ذلت سے نکالیں ان کو اور یہ جان لیں — ان کی ذلت میں انھیں عزت سے رہنا ہے محال

آخری بند میں ماضی کی روایات حکومت کی مطلق العنانی اور اس کے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اب بڑائی کا ہے استحقاق پر اولاد — ہوگا جو کرداری کو مرہون ہوگا انساں
قسمتوں کی آزمائش کا زمانہ ہو چکا — ہے یہ اب یاں ہنر اور غیرتوں کا امتحاں
ہے تمھاری اب تمھارے ہاتھ عزت اور زندگی — ہو تمھیں اپنے سبھی اور تمھیں ہو ہر زیاں
پھر ہو کوشش کردہ تو ہر بڑی سے ہاں — اور رکھا دشمن کو اس راکھ سے اٹھا ہوا
یار ہو دنیا میں ہمتوں اور نہ بیگانگی یاں — ان کا ہے دنیا میں ہونا اور نہ ہونا یکساں

قوم گنتی ہے اسے گر مرد ہو زن سے کبھی نہ ہو

مر گئے جب قوم کے دل قوم میں کیا رہ گیا باقی

حالی کی اس نظم نے کاروان کے ہر فرد میں احساس زیاں پیدا کیا، اس کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اس میں جذبہ عمل و عمل پیدا کر کے اسے متحرک و باعمل بنایا۔

انھوں نے قوم میں جان ڈالنے کی مسلسل کوشش کی۔ قوم کی بے حسی اور غفلت سے وہ بددل نہیں ہوئے بلکہ

[illegible]

مسلسل عمل کرتے رہے۔ [illegible] اس نظم نے قوم [illegible]

'حیات نو' کا پیام لے کر نمودار ہوئی ہیں۔ یہ پیام ترقی کا پیام ہے۔ زندگی اور بقا کا پیام ہے۔ مغرب سے یہ روشنی

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی　　غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ اور علی الاعلان یہ کہہ رہی ہے۔

یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہِ عدم۔ کیونکہ

بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آجکل　　وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

اس کے بعد وہ اپنی قوم کو بتاتے ہیں کہ دنیا میں وہی قومیں سربلند اور محترم ہونے کی مستحق ہوتی ہیں جو ہمدردی و محبت، اخوت و مساوات، ہمت و استقلال کو اپناتی ہیں۔ قوم و ملک کی سچے دل سے خدمت کرتی ہیں ان کا ایک ایک فرد اپنے اندر بے پناہ جذبۂ ایثار و قربانی رکھتا ہے۔

ان کے مفلس قوم کی خاطر وہ کر جاتے ہیں کام　　پست قوموں میں نہیں کر سکتے جو کام اغنیا

ہے انھیں ہمدردیوں کا ان کی یہ ثمرہ کہ آج　　اس کرہ کے گرد ہیں وہ چھائی ہوئی مثل ہوا

آخری بند میں حالی نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں تغیر ہی کو ثبات ہے۔ عروج و زوال، امارت و افلاس لازم و ملزوم ہیں۔

ایک کا ہے جو تنزل دوسرے کا ہے عروج　　اس کا بکتا ہے مکاں تب اس کی چلتی ہے دکاں

آسماں سے بن کے خواں آتا نہیں اقبال کا　　ہے یہی اک چیز کل مہماں یہاں تھی آج واں

اقبال، فعال قوموں کا غلام ہوتا ہے۔ کبھی مسلمان بھی صاحب اقبال تھے لیکن آج ادبار کا شکار ہیں۔ لیکن قصور کس کا ہے؟ حالی نے ان اشعار میں وضاحت کی ہے۔

اے مسلمانو افلک کی گردشوں سے غافلو　　تم کو رخصت ہے لٹاؤ وقت دولت رائیگاں

مت کرو شکوہ مشیت کا خدا ظالم نہیں　　بلکہ ظالم ہیں تمھاری اپنی بداعمالیاں

ہے یہ قانونِ الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں　　گو جگہ سے اپنی ٹل جائیں زمین و آسماں

چھٹتی جائیں گی وہ قومیں جو جگڑتی جائیں گی
ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی، جھڑتی جائیں گی

کتنی صاف اور واضح مثال سے قوم کے زوال کا سبب بتا دیا۔ یہ نظم اگرچہ فلسفیانہ انداز میں لکھی گئی لیکن اپنے گہرے نقوش دلوں پر چھوڑ جاتی ہے۔

مسلمانوں کے شاندار ماضی کی یادگار، جہاں آباد اور اس کی عالی شان عمارتیں انقلابات زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ دہلی کے جلسۂ کانفرنس میں حالی نے جو ترکیب بند پڑھا اس میں عظمت ماضی سلاطین اسلام کی شان و شوکت، اور شاہان مغلیہ کا جاہ و جلال نیز ان کے عہد میں شاہانہ جشن

Marfat.com

کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد قومی جشن منانے کی اہمیت اور اک خضرہ کی قیادت پر زور دیا ہے۔ کاروان اسلام کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس خضر کے بتائے ہوئے رستے پر چلیں اور تباہی و غفلت سے خبردار رہیں۔ آخری بند کے یہ اشعار کتنے سبق آموز اور دردانگیز ہیں۔

گلشن میں فصل گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پرچین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں
اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
اک خضرہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستہ پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں
دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں

حالی کی یہ پیشین گوئی سچی اور صحیح ثابت ہوئی۔ انھوں نے جس خطرہ سے آگاہ کیا تھا وہ آ کے رہا۔

سنبھلو اگر نہ رہنا یہاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں
غفلتیں مبادا اب روز بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ نہ جائیں

اپنے معاصرین میں حالی پہلے شخص تھے جنھوں نے "ہندوستانی عورت" کے مسائل پر سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ غور کیا۔ مناجات بیوہ، اس سلسلہ کی پہلی نظم تھی جس کا ذکر مثنوی میں کیا جا چکا ہے۔ بیٹوں کی نسبت، میں بے زبان لڑکیوں کی وکالت کی ہے۔ چپ کی داد میں عورت کی زندگی کے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ خدا کی اس مخلوق پر ہمیشہ اور ہر حالت میں ظلم و ستم کیا گیا۔ ہمیشہ وہ مردوں کا کھلونا بنی رہی بلکہ بنائی جاتی رہی آج بھی اس کی اس حیثیت میں کمی ہونے کے بجائے زیادتی ہی ہے۔ حالی نے اس نظم میں عورت کو ماں، بہن اور بیٹی کے نام سے مخاطب کر کے اس کو ایک اہم مقام دیا ہے۔

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

حالی نے یہ کہہ کر ہندوستانی عورت کو احترام اور محبت کے لائق بتایا، ہندوستانی سماج کو ذہن میں رکھ کر مقلد اور دوسروں کے سہارے چلنے والے، "دوسروں کی جینک سے دیکھنے والے" حالی

Marfat.com

کی یہ جراءت و ہمت قابل صد تحسین ہے کہ انھوں نے

"اردو شاعری میں ہندوستانی عورت کو اس شان سے جلوہ گر کیا کہ ساری پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کر ڈالی۔ وہ جہاں کہیں عورت کا ذکر کرتے ہیں اُسے انسانیت کے بلند ترین مقام پر جگہ دیتے نظر آتے ہیں"[1]

عورت کے متعلق اس سے پہلے ہندوستانی سماج میں یہ الفاظ کیوں کسی نے سنے ہوں گے؟

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو — ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا — گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے
مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کاکھ — دنیا میں اے ستونتیو لے دیکھے اب ست تم سے ہے

ہندوستانی سماج لڑکیوں کی پیدائش پر غم کے آنسو بہاتا ہے۔ اس شعر میں سماج کی اسی دکھتی ہوئی رگ پر حالی کا ہاتھ ہے۔

آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم — ہر موسمی سے اپنی یہاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

یہ موسمی میکے میں چھوٹے بڑے سب کی خدمت گزار رہتی ہے سسرال جاتی ہے تو وہاں کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے۔ ہر وقت سب کی خوشنودی کا خیال رکھنا پڑتا ہے، ایک ایک کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور اپنی تمام خواہشات کو زندہ دفن کرنا پڑتا ہے۔ ہر وقت یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ

بدلے نہ شوہر کی نظر سسرے کا دل میلا نہ ہو — آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
پالا بروں سے گر پڑے بد خو ہوں سب چھوٹے بڑے — چتون پہ مل آنے نہ دو، گو دل میں ہو بیزار تم

غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خون جگر

شادی کے بعد اولاد کی تمنا ہوتی ہے اور جب خدا یہ تمنا پوری کر دیتا ہے تو خوشیاں منائی جاتی ہیں لیکن بچہ کی پرورش و پرداخت میں، ماں کو جو تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، وہ اسی کا جگر ہوتا ہے جو برداشت کرتی ہے اور ہر مصیبت جھیل لے جاتی ہے۔

کی ہے مہم جو تم نے سر، مردوں کو اس کی کیا خبر؟ — جانے پرائی پیر وہ جس کی بوائی ہو پھٹی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم، بیڑا نہ ہوتا پار یہ — چیخ اٹھتے دہر میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

مائیں اگر گوشت کے لوتھڑوں کی خبر نہ لیتیں تو دنیا کے مصلح و رہبر، عالم و فاضل، شاہ و گدا ولی و پیغمبر کہاں ہوتے؟ ماں کا درجہ کس قدر بلند کر دیا ہے؟

---

[1] یادگار حالی۔ صالحہ عابد حسین ص ۱۸۹

Marfat.com

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں یاں خالی کبھی کانسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
کیا صوفیانِ باصفا، کیا عارفانِ باخدا کیا انبیاء، کیا اولیاء، کیا غوث کیا قطب زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

لیکن افسوس ایسی مقدس ترین ہستی پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، کہیں زندہ دفن کی گئیں کہیں مردہ خاوندوں کے ساتھ زندہ جلائی گئیں، مجرموں کی طرح کم عمری ہی میں بیاہی جاتی رہیں بیوہ ہوئیں تو سارا چین ختم ہو گیا، عمر بھر دوزخ میں جلتی رہیں۔ غرض

تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائیگاں گو تم نے جانیں دیں مگر وہ کہلائیں لیکن بے وفا
گر صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یہاں پر جو فرشتے سے تھے وہ کر گئیں تم کام یہاں

اپنے اور پرائے سب تم پر ستم کرتے رہے اور سب اس رائے پر متفق رہے۔

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آبِ حیات ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

کیونکہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا کہ

گذرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں

یہ تاریخی حقائق بھی ان کے سامنے تھے۔

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب تھا پیشوا کی ٹھوکر سے پھٹ جائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں باقی نہ فرق تھا یہ کہ آدمی جنتا تھیں زیبا نہیں
یاں تک تمہاری ہجو کے گائے گئے دنیا میں راگ تم کو کبھی دنیا کی کہن آگیا آخر یقیں

لیکن تاہم کے "پیپا کی دادا" کب تک اثر نہ کرتی؟

آخر تمہاری چیپ دلوں میں اہل دل کے چھ گئی ہے کہ حیف کی دادا آخر [illegible]
نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے [illegible] جھلک دکھائی ہے
گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا [illegible] ہر آن [illegible] ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں اور بڑھے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا پر فتح جب سچائی کی پائے آخر پائی ہے

اس کے بعد تسلیم نسواں کے حامیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کو کامیابی کا یقین دلاتے ہیں۔

Marfat.com

یہ جیت کیا کم ہے کہ خود حق ہے تمہاری پشت پر
جو حق پہ منہ آیا ہے آخر اس نے منہ کی کھائی ہے

حالی کے نزدیک طبقہ نسواں کی جہالت اور علم سے محرومی ہی مظلومی و محرومی، ذلت و نکبت کا سبب ہے اسی لیئے وہ تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کرتے ہیں اور ایک ماہر و تجربہ کار حکیم کی طرح عورتوں کی ساری بیماریوں کا علاج "تعلیم" قرار دیتے ہیں۔ حالی کی آواز میں درد و خلوص تھا اس کا اثر ہوا۔ یہ آواز اس زمانہ میں منفرد تھی۔ حالی کے تمام رفقاء اس آواز کے موافق نہیں تھے۔ یہ نظم اپنے خلوص اور اثر کے لحاظ سے اردو شاعری میں لاجواب ہے بلکہ اس کا جواب

"اردو تو کیا مشرق کی زبانوں میں بھی بمشکل مل سکے گا اور یہ بھی حالی کے ان شاہکاروں میں سے ہے جن کا ایک ایک پارہ ان کی بقائے دوام کے لیئے کافی ہے"[1]

حالی کی نظمیں (ترکیب بند) ان کی حکیمانہ بصیرت کے شاہد ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری میں ان کے ذریعہ سے، مسائل زندگی کی ترجمانی کر کے حل پیش کیا ہے۔ شاعر کا خلوص اور درد سوز اور گداز لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ زبان و انداز بیان صاف و شگفتہ اور دلکش ہے اخلاقیات اور فلسفیانہ خیالات نے کہیں کہیں شاعری کے جوہر خاص یعنی سلاست و روانی اور غنائیت کو کم کر دیا ہے۔

تاہم "ان تمام نظموں کی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات سے مصنف مرتفع ہے"[2]

اس لیئے اردو شاعری میں ان کی اہمیت و افادیت پر سب کو اتفاق ہے۔

---

[1] حالی کا ذہنی ارتقاء۔ ص ۱۹۴
[2] تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص ۴۱۳

Marfat.com

مسدّس

اردو شاعری میں' مسدّس ،مرثیہ کے لئے وقف سا ہوگیا تھا۔مرثیہ گو شعراء کے علاوہ دوسرے شعراء نے مسدس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی کیونکہ

"مسدس میں یہ دقت ہے کہ ہر ایک بند میں چار قافیے ایک طرح کے اور دو ایک طرح کے لانے پڑتے ہیں۔پس اس میں مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرنے کہ مطالب برابر بے کم و کاست ادا ہوتے چلے جائیں اور قافیوں کی نشست اور روزمرہ کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جائے ہر شخص کا کام نہیں"[1]

مسلسل مضامین، مسدس کے مقابلہ میں مثنوی میں زیادہ آسانی کے ساتھ بیان کر لئے جاتے تھے اس لئے شعراء کے نزدیک مسدس کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی۔ حالی نے اس صنف سخن کو اس طرح نوازا کہ مسدس اور حالی لازم و ملزوم ہوگئے۔ مسدس کا نام آتے ہی حالی کا مسدس مدوجزر اسلام نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حالی نے کل تین مسدس لکھے۔

۱۔ مسدس مدوجزر اسلام — ۱۸۷۹ء

۲۔ مسدس نگ خدمت — ۱۸۸۷ء

۳۔ مرثیہ حکیم محمود خاں — ۱۸۹۲ء اس کا ذکر مرثیہ کے تحت کیا جا چکا۔

مسدس مدوجزر اسلام مولانا حالی کا غیر فانی شاہکار ہے۔ یہ تعارف و تعریف اور تشریح کا محتاج نہیں۔ اس کو جو شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی۔ اردو کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہو سکی۔ یہ مسدس سرسید کی تحریک پر حالی نے لکھا تھا

"قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے .... آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے .... ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل سے جو نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ اور باسی کڑھی میں ابال آیا۔ اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی"[2]

مسدس مدوجزر اسلام میں کیا کیا ہے؟ حالی لکھتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری۔ صفحہ ۲۷۶

[2] پہلا دیباچہ مسدس حالی صدی ایڈیشن صفحہ ۶-۷

Marfat.com

"اس مسدس کے آغاز میں اول پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا، اور نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعۃً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے اور اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے اپنے بے مہر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔

مسدس کی زبان اور بیان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہرا اس دبھی پھیکی، سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے کیونکہ اس میں یا تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے۔ یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے۔ نہ کہیں رنگین بیانی ہے نہ مبالغے کی چاٹ ہے۔ نہ تکلف کی چاشنی ہے ..... گویا اہل دہلی اور لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور ہے مرچ سالن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔[1]

مسدس کا پہلے پہل خاتمہ کیا ہو گئے؟ پر ہوا تھا جو بڑا مایوس کن تھا۔ حالی لکھتے ہیں۔

"یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا۔ اسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا۔ نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوششیں رائیگاں نظر آنے لگیں ..... بعض احباب کی تحریک پر ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا ..... نظم نہ پہلے پسند کے قابل تھی اور نہ اب ہے۔ مگر الحمدللہ کہ درد اور سچ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے امید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا۔[2]

مسدس میں پہلے ۲۹۴ بند تھے۔ اس کے بعد ۱۸۸۶ء میں ضمیمہ کے طور پر ۱۶۲ بند کا اضافہ کیا گیا یہ اشاعت ہوتے ہی زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ اگرچہ

"نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے۔ قوم کی خرابیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ و سناں کا کام لیا گیا تھا ..... ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ابرار و اخیار مذہبی سوءظن رکھتے تھے تعصب عموماً کلمۂ حق سننے سے مانع تھا بایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔[3]

---

[1] [2] دیباچہ اول مسدس حالی صدی ایڈیشن صفحہ ۷ - ۸
[3] [4] دیباچہ ثانی " " " صفحہ ۱۱ - ۱۲ - ۹

Marfat.com

اور یہ مقبولیت و شہرت اس وقت نصیب ہوئی جبکہ مسدس کی مخالفت ہر طبقے کی طرف سے شدت کے ساتھ کی گئی۔ مسدس کے جواب میں اعتراض و اختلاف تمسخر و استہزا کے لئے متعدد مسدس لکھے گئے لیکن حالی کا درد پھیلا اور سچ چمکا اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ

"ایشیا سے یورپ تک اس کی عالمگیر شہرت ہو گئی۔"[1]

اس درد اور سچ کی سچی داد سرسید نے دی ہے انھوں نے اس کو اعمال حسنہ میں شمار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا، میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"

سرسید نے مسدس پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی یادگار ہے۔

"اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ تشبیہات دور از کار سے جو بایہ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے[2]"

مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں

"کیا یہ کہنے کی، یہ بتانے کی حاجت ہے کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے۔ کتنی محفلوں میں اس کے بند پڑھے جا چکے۔ وعظ کی کتنی مجلسوں کو یہ گرما چکے کتنے ادبی امتحانوں کے نصاب میں داخل ہو چکا، کتنے بوڑھوں کی جوانوں کی لڑکوں کی زندگی میں انقلابی اثر پیدا کر چکا کتنوں کو رلا کر یہ رہا۔ کتنوں کے دل اس نے بڑھا دئے۔ غرض مقبولیت کے مرجعیت کے جتنے بھی معیار ہو سکتے ہیں۔ سب کے لحاظ سے آج اسے دیکھ لیجئے، جانچ لیجئے، پرکھ لیجئے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا اور اس شان کا سراپا جمال کا اور اس کمال کا اردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی؟[3]"

مسدس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پانچ برس کے اندر اندر تھیٹر میں اس کے بند گائے جاتے تھے۔

"امرتسر میں مسلمانوں نے بھی پارسیوں کی طرح تھیٹر بنا لیا تھا مسلمانوں کی تھیٹریکل کمپنی نقل ہوتی ہے اس نقل میں ایک مقام نہایت دلچسپ آتا ہے ایک پردہ کھلتا ہے سمندر لہریں مارتا ہوا اور ایک جہاز جس میں لوگ سوار ہیں طوفان میں آیا ہوا اور ڈوبتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت مسدس حالی کا یہ بند گایا جاتا ہے۔

---

[1] مسدس حالی پاکٹ ایڈیشن پیش لفظ محمد رحمت اللہ راعد مالک ناموی پریس کان پور ۱۹۰۶ء

[2] خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود مطبوعہ ۱۹۱۹ء ۳ مسدس حالی مسدسی ایڈیشن صفحہ ۳۰-۳۱

جہاز اک گرداب میں پھنس رہا ہے — پڑا جس سے جو کھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے — کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مستِ خوابِ گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خندہ زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھو کہ اے ہوش والو — کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پر آنے کو ہے جو — نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

گانے والا یا گانے والی ان بندوں کے گانے میں موقع بموقع اس جہاز کی طرف جو ڈوبنے کو ہو رہا ہے اشارہ کرتی جاتی ہے۔ اس کا ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو نکل پڑتے ہیں[1]"

یہ ۱۸۸۴ء کی بات ہے مسدس ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ صرف پانچ برس کے اندر یہ شہرت و مقبولیت حاصل کر لینا اور ہر دل میں گھر کر لینا شاعر کے خلوصِ دل اور حسنِ نیت اور جذبۂ ایثار کا ثمرہ ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں

"شاعر کی طبیعت نہایت گداز تھی وہ ازل سے دردمند دل لے کر آیا تھا.... اس انداز کا شاعر جب ملت مرحومہ کے گذشتہ اقبال اور برباد شدہ جاہ و جلال کا سوگ منائے گا تو ظاہر ہے کہ اسکے قلم کی ہر بوند آنسو کا ایک قطرہ اور اس کے لب کی ہر صدا، فریاد کی ایک لے کیونکر نہ بن جائے گی[2]"

یہ اسی کے سوز دروں کا اعجاز ہے کہ مسدس کو کسی نے انسانی تصنیف کے بجائے الہامی کتاب بتایا، کسی نے اس کو سراج منیر سے تشبیہ دی کسی نے قوم کا آئینہ کہا، کسی نے امت مرحومہ کا دلگداز مرثیہ کہا کسی نے عظمت اسلام اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کی حقیقت افروز و عبرت انگیز تاریخ کہا۔ اقتباسات نقروں ہی کے اگر پیش کئے جائیں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں اردو کا کوئی ادیب، ناقد، مورخ اور فن کار ایسا نہ ہوگا جس نے مسدس پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔ اردو کی تاریخ و تنقید و ادب کی کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی جس میں مسدس کا ذکر نہ ہو۔

"مسدس کی اس درجہ قبولیت کی ایک بڑی وجہ تو اسکی حقیقت نگاری، صداقت خلوص اور وہ درد و سوز ہے جو اس کے ہر ہر شعر میں جاری و ساری ہے دوسری وجہ زبان و بیان کی سادگی روانی شیرینی اور دسعت ہے حالی کا پیام قوم کے کسی ایک طبقے یا فرقے کے نام نہ تھا اسلئے وہ سب کے

---

[1] سید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب مرتبہ مولوی سید اقبال علی صفحہ ۶۷ - ۱۷ مطبوعہ ۱۸۸۴ء
[2] مسدس حالی صدی ایڈیشن۔ سید سلیمان ندوی صفحہ ۴۴

Marfat.com

کسی خاص اصطلاحی اور مشکل زبان میں ادا نہیں کر سکتے تھے ان کو تو پوری قوم کو اپنا پیام پہنچانا تھا خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں اسلئے انھوں نے وہ زبان استعمال کی جو ہر کس و ناکس بسانی سے سمجھ سکے[1]

مسدس کا آغاز بڑے موثر پیرایہ میں کیا ہے۔ مریض اگر اپنے طبیب کا کہنا نہ مانے اور پرہیز نہ کرے تو نقصان کس کا ہے؟ بعینہٖ یہی حال قوموں کے مرض کا ہے۔ جو قومیں اپنے مرض کا علاج نہیں کرتی ہیں طبیب قوم کا کہنا نہیں مانتی ہیں اور بدپرہیزی کرتی رہتی ہیں وہ بہت جلد موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے — فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے — چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

پر اس قوم غافل کی غفلت وہی ہے — تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت نہ ہی ہے — ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے

نہ افسوس انھیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

اس کے بعد رسالت کے قبل، عرب کی حالت زار کا ذکر کیا ہے کہ ان میں کیا کیا خرابیاں تھیں۔ جب ان کی اخلاقی گراوٹ اور تباہی و بربادی حد سے زیادہ بڑھ گئی

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت — بڑھا [illegible]
اڑا خاک بطحا نے کی وہ ولیمت — [illegible]
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ و نوید مسیحاؑ

اور اس مقدس ترین ہستی نے تشریف لا کر، سب کو گمراہی و ضلالت سے نکالا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

اس ذات گرامی نے وحدانیت کی شمع روشن کی، اخلاق حسنہ کی تعلیم دی [illegible]
بچایا اور جب وہ نبی نوع انسان کی بھلائی کا فرض ادا کر چکا اور اسے [illegible]

[illegible]
کہ دنیا میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[1] پادہ رحالی۔ صالحہ عابد حسین صفحہ ۱۷۱ - ۱۰۲

Marfat.com

لیکن ہر کمالے را زوال، اس قوم سے دین بدی کا سر رشتہ چھوٹنا تھا کہ

نہ ثروت رہی ان کی قائم نہ عزت — گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
گئے علم و فن ان سے ایک ایک کر کے — مٹیں خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت

رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

رفتہ رفتہ صرف نام کے مسلمان رہ گئے، علم و فن رخصت ہو گیا، جہل و بدی میں مبتلا ہو گئے۔

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے — کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے — ہمارا قدم ننگِ اہلِ وطن ہے

ہنر کوں نے تو تمیز کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

اسی طرح ملت کا یہ حکیم حاذق اور نباض اپنی قوم کے ایک ایک مرض کا ذکر کرتا ہے۔ معاشرہ کی ہر برائی بیان کر کے اس کے انجام سے آگاہ کرتا ہے۔ ہمسایہ قوموں کی رفتار ترقی پر رشک اور غیرت دلاتا ہے شاندار ماضی کا ذکر کر کے جذبہ قومیت بیدار کرتا ہے مگر سب بے سود

"بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں"

آخر میں ایک مثال سے پھر غیرت دلائی ہے۔

کسی نے یہ ایک مرد دانا سے پوچھا — کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا عقل جس سے ملے دین و دنیا — کہا گر نہ ہو اس سے انسان کو بہرا
کہا پھر ہم سب سے علم و ہنر ہے
کہا جو باعث افتخار بشر ہے
کہا گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسر — کہا مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر
کہا، گر یہ بھی اگر بندہ حر ہے — کہا، تو پھر اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر"

وہ ننگ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

عقل و ہنر اور مال و دولت سے محرومی موت کے برابر ہے۔ ملت اسلامیہ انھیں نعمتوں سے محروم ہو گئی ہے کیا یہ زندہ رہ سکتی ہے؟ مگر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں [illegible] دوسری قوموں کی طرح ہمت کر کے آگے بڑھو آنکھیں کھولو اور دیکھو

[illegible] بہت پوچھ باقی اپنے لدا رہے ہیں

Marfat.com

بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں　　بہت سے نہ چلنے سے پچھتا رہے ہیں
مگر اک تھپیرا ہو کہ سوتے ہوؤں کو
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل

یہاں تک تو قوم کو کچھ نہ کچھ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی امید دلائی تھی لیکن آخری [illegible] مایوسی کے بادل چھا گئے۔ قوم کا بوسیدہ گھر بننے کے بجائے گرنے لگا اس بند میں کیسی مایوسی ہے؟

یہاں ہر ترقی کی غائت یہی ہے　　سرانجام ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانے کی عادت یہی ہے　　طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے ابل کر
بہت باغ اجڑے گئے پھول پھل کر

گویا مشیت الٰہی یہی تھی کہ ملت اسلامیہ کو زوال ہو۔ اس مایوسی کو اور حوصلہ شکن خاتمہ پر [illegible] کو توجہ دلائی گئی اور پورے سات برس بعد ۱۸۷۶ء میں حالی نے ناامیدی و مایوسی کا طلسم توڑا اور مقتضائے حال کے موافق ضمیمہ شامل کیا۔ یہ ضمیمہ حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ اس سے مسدس کا عیب دور ہو گیا۔ ضمیمہ میں حالی نے خاص طور پر امید و یقین، حرکت و عمل، عزم و حوصلہ کے جذبات بیدار کئے اور انھوں نے [illegible] اعتراف کیا ہے کہ قوم میں احساس زیاں باقی ہے۔ ان میں خودی و خودداری، غیرت و [illegible] ہمدردی و غمگساری، اخوت و مساوات بالکل فنا نہیں ہوئی۔ ان کی خاکستر میں چنگاریاں موجود ہیں۔

مسلماں اسی کی گزری ہوئی حالت میں بھی

سمجھتے ہیں عزت کو دولت سے بہتر　　فقیری کو ذلت کی شہرت سے بہتر
گلیم قناعت کو ثروت سے بہتر　　انھیں موت ہے بار منت سے بہتر

سراں کا نہیں دربدر جھکنے والا
وہ خودیست ہیں پرنگاہیں ہیں بالا

اور اس کے بعد کامیابی و کامرانی کا نسخہ بتاتے ہیں۔ کاہلی کی مذمت کرتے ہیں، ہمت کی عظمت گاتے ہیں، کسب ہنر کی فکر کرنے پر زور دیتے ہیں، علم و ہنر کی قوت و فضیلت کے گن گاتے ہیں، عزم اور حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔ [illegible] لینے پر توجہ دلاتے ہیں۔ علم و ہنر کی قدر، قوم کی ہمدردی و غمگساری کی [illegible] توفیق عطا فرمائے کہ کل کی فکر آج کرنے لگیں۔ [illegible] قوم کو فرض عین سمجھیں چند بند ملاحظہ ہوں

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ ثانی مسدس حالی صفحات ۱۱۰ و ۱۱۱ (پاکٹ ایڈیشن نامی پریس کانپور)

Marfat.com

تمھیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے　　تمھیں درد کا اپنے درماں کرو گے
تمھیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے　　کرو گے تمھیں کچھ نگہباں کرو گے

چھپا زندہ ہمت میں زور قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

کرو قدر ان کی ہمت جن میں پاؤ　　ترقی کی اور ان کو رغبت دلاؤ
دل اور حوصلے ان کے مل کر بڑھاؤ　　ستوں اس کھنڈر کے انھیں بناؤ

کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے
بٹھائیں انھیں سر پہ اپنے پرائے

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت　　جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
نہ بھی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت　　نہ شخصی بزرگی، نہ شخصی حکومت

وہی شاخ پھولے گی پھلے گی
ہری ہوگی جڑ اس گلستاں میں جس کی

اس بند میں ملتِ اسلامیہ کے لئے عبرت و بصیرت کے کتنے پہلو ہیں؟

غضب ہے کہ جو نوع ہو سب سے برتر　　گنے آپ کو جو کہ عالم کا سرور
فرشتوں سے جو بھی اپنے کو بڑھ کر　　خدا کا بنے جو کہ دنیا میں مظہر

نہ ہو مردمی کا نشاں اس میں اتنا
مسلّم ہے مٹی کے کیڑوں میں جتنا

دعا کے یہ الفاظ کتنے درد و اثر اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

الٰہی! بحق رسول تہامی　　ہر اک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی　　برابر تھے مکی و زنگی و شامی

شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نبا ہا
بروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

طفیل اس کا اور اس کی عزت کا یارب　　پکڑ ہاتھ جلد اس کی امت کا یارب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یارب　　غبار اس سے جو دھوئے ذلت کا یارب

کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اس کی
ہوا پست اسلام، پستی سے اس کی

دعا دل سے نکلی تھی، اجابت و قبولیت سے سرفراز کیوں نہ ہوتی؟

Marfat.com

مسدس حالی نے صور اسرافیل کا کام کیا۔ سوئی ہوئی قوم جاگ گئی اس میں حرکت و عمل کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس نے اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنے اور سنبھالنے کی کوشش کی زندگی کے دھارے کو صحیح راستہ پر موڑا، خیال و عمل اور شعر و انشاء کی پراگندگی ہی نہیں بلکہ گندگی کو دور کیا انھوں نے مسدس لکھ کر۔

"ہمارے سامنے ایک قد آدم آئینہ رکھ دیا جس میں ہم اپنے خدوخال دیکھ سکتے تھے اور جب لوگوں کو اپنی شکل بگڑی نظر آئی تو وہ بہت چراغ پا ہوئے۔ مگر مسدس حالی کے آئینہ پر گرد و غبار نہ آسکا۔ وہ اسی طرح حالات کی عکاسی کرتا رہا۔ شعراء دھیرے دھیرے نظم کی طرف بڑھنے لگے۔ سیاسی شعور بڑھنے لگا۔ مغربی ادبیات کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے جمہوریت کا احساس اور معاشی انصاف کا تقاضا زور پکڑنے لگا۔"[1]

"غرض "مسدس" اردو زبان کی پہلی نظم ہے جسے ہم عظیم کہہ سکتے ہیں۔ اس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا۔[2] اور اس میں شک و شبہ نہیں ہے کہ یہ "اردو میں پچھلے سو سال کی بہترین مسلسل اور بیانیہ نظم ہے۔"[3]

مسدس مدوجزر اسلام کے بعد حالی نے ۱۸۷۹ء میں مسدس کا موسوم یہ ننگ خدمت لکھا اس مسدس میں جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، ملازمت کے پیشہ کی اصلیت اور حقیقت بتائی ہے حالی نے تعلیم یافتہ طبقہ کے اس خیال کی سخت مذمت کی ہے کہ وہ سب صرف ملازمت حاصل کرنے کے لئے پڑھتے ہیں۔ یہ خیال عام ہو چلا تھا۔ مولانا حالی اور ان کے معاصرین ڈاکٹر نذیر احمد، سرسید احمد خاں اور دوسرے حضرات نے اس خیال کو دور کرنے کی شعر و نظم، تقریر و تحریر کے ذریعہ کوشش کی اس مسدس میں یہ بتایا ہے کہ ملازمت، غلامی کا دوسرا نام ہے اور دوسروں کی غلامی کرنے میں ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں، ملازمت کو عزت و شرافت کا معیار سمجھنے والے غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ برخلاف اس کے آزاد پیشوں میں آزادی اور عزت دونوں ملتی ہیں۔

"لاچاری بہت سے بھاری، ہوتی ہے اور محکومی میں خواب میں بھی سکون نصیب نہیں ہوتا۔ جنت میں غلامی کرنے سے دوزخ کی حکومت بہتر ہے۔

نظم کا آغاز۔ ابتدائے آفرینش سے انسان کا فطری طور پر باہم مل [illegible] بے ریا زندگی بسر کرنا کے بیان سے ہوتا ہے۔

---

[1] تہذیب و تحریر مجتبیٰ حسین۔ دور حاضر اور اردو غزل صفحہ ۱۹۶

[2] ترقی پسند ادب۔ سردار جعفری ص ۱۰۴

[3] تنقیدیں اور خاکے۔ جلیس قدوائی۔ (اردو لٹریچر ڈاکٹر ابراہیم بیل) مطبوعہ ۱۹۵۲ء

اس قدر عیش دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم — عیش و عشرت کے طلسموں سے بہت دور تھے ہم
کسی محنت سے مشقت سے نہ مزدور تھے ہم — آپ ہی راج تھے اور آپ ہی مزدور تھے ہم
تھے غلام آپ ہی اور آپ ہی آقا اپنے
خود ہی بیمار تھے اور خود ہی مسیحا اپنے

ایک سے ایک نہ کم تھا نہ زیادہ سرمست — سب تھے ہم ایک ترائی کے درخت خودرو
حاجتیں لے کے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو — نہ جبیں بوس کی عادت تھی نہ تسلیم کی خو
دست قدرت کے سوا سر پہ کوئی ہات نہ تھا
ایک قبلہ تھا کوئی قبلۂ حاجات نہ تھا

انسانی زندگی ارتقا پذیر اور تغیر پسند ہے۔ تہذیب کی پرچھائیں پڑی طبقہ داری سماج قائم ہوا بھائی بھائی حاکم و محکوم، آقا و غلام بنے۔ خود پرستی و خود غرضی جزو ایمان بنیں۔

ناگہاں جور و ستم کا اک اٹھا طوفاں — جس کے صدمے سے ہوا زیر و زبر نظم جہاں
اقویا ہاتھ ضعیفوں پہ لگے کرنے رواں — بکریوں کو نہ رہی بھیڑیوں سے جائے اماں
تیز دنداں ہوئے جنگل میں غزالوں پہ پلنگ
مچھلیوں پر لگے منہ مارنے دریا میں نہنگ

کشمکش و کشائش شروع ہوگئی، لیکن اسی کشمکش سے تہذیب و تمدن کی سوتیں پھوٹیں عروج و زوال کے اصول و آئین بنے، فعال و صالح قوم، زندہ اور حاکم قوم کہلائی مسلمانوں کا اسی میں شمار تھا

حق نے شائستۂ ہر باب بنایا تھا ہمیں — ایک ہی دام میں پھنسنا نہ سکھایا تھا ہمیں
راستہ ہر کوچہ و منزل کا بتایا تھا ہمیں — زینہ ہر بام پہ چڑھنے کا دکھایا تھا ہمیں
ایسا کچھ بادۂ غفلت نے کیا متوالا
طوق خدمت کا لیا اور گلے میں ڈالا

در مخلوق کو ہم منجا و ماویٰ سمجھے — طاعتِ خلق کو اعزاز کا تمغا سمجھے
پیشہ و حرفہ کو اجلاف کا شیوا سمجھے — ننگ خدمت کو شرافت کا تقاضا سمجھے
عیب گننے لگے نجاری و حدادی کو
بیچتے پھرنے لگے جوہر آزادی کو

"درحقیقت" یہ دو بند پورے مسدس کا خلاصہ ہیں[1]۔"
آزادی کا جوہر بیچنے والے، غلامی اور محکومی پر فخر کرنے لگے۔ تجارت اور پیشہ کو عیب سمجھنے لگے۔

---

[1] حالی کا ذہنی ارتقاء ص ۱۰۱

Marfat.com

نوکری ٹھہرے ہے لے دے کے اب اوقات اپنی　　پیشہ سمجھے تھے جسے ہوگئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی　　جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی
ہاتھ اپنے دل آزاد سے ہم دھو بیٹھے
ایک دولت تھی ہماری سو اسے کھو بیٹھے

غلامی کے سوا کوئی پیشہ نہیں رہا۔ ہر قسم کی تباہی و بربادی نے گھیرا۔ رزق کے دروازے بند ہو گئے تلاش معاش میں عمریں گذر جاتی ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔

برسوں اس پر بھی گزر جاتے ہیں بے نیل و مرام　　کوئی آقا نہیں ملتا کہ نہیں اس کے غلام

حالی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ محنت و مشقت کرو جھوٹی نمائش پر فخر کرنا چھوڑ دو، عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھو علم و فن حاصل کرو، پیشہ اور ہنر سیکھو بغیر کچھ سیکھے اور کچھ کئے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں　　چاہئے سعی و مشقت سے نہ وہ عار کریں
ہو میسر جنھیں وہ خدمت سرکار کریں　　ورنہ مزدوری و محنت سر بازار کریں
آبرو اس میں ہے شان اس میں ہے عزت اس میں
فخر اس میں ہے، شرف اس میں ہے شرافت اس میں

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں　　کشت کاری کریں، آئین فلاحت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آداب سیاحت سیکھیں　　الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں
کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

یہ وقت کی آواز اگر قوم سن لیتی اور اس پر عمل کرتی تو ہندوستان میں وہ بھی اقتصادی بدحالی، بیکاری اور مفلسی کا شکار نہ ہوتی اور صنعت و حرفت و تجارت پر اس کا بھی قبضہ ہوتا۔

یہ پہلی نظم ہے جس میں [illegible] تجارت کی خوبیوں اور نوکری کی برائیوں کو جس طرح [illegible] گیا ہے اس کی مثالیں اردو شاعری میں شاذ و نادر ہیں۔

آخری بند میں حالی نے قوم کی بے عملی اور بے حسی پر طنز کیا ہے۔

ہوں گے حالی سے نہ دنیا میں کہیں ہرزہ سرا　　خود ہیں گرداں کہ قوم کے ہیں وارث ہم سا
جھکے جھکے ہوئی پشت آپ کی خدمت میں دوتا　　اور اپنے حق میں آزاد و روی کا ہے دعویٰ
بات کہنی وہی زیبا ہے کہ ہو جس میں کچھ فہم
ورنہ بے صرفہ نصیحت سے خموشی بہتر

لہ حالی کا ذہنی ارتقاء۔ صفحہ ۱

گذشتہ صفحات میں حالی کی شاعری کو انھیں کے شعری نظریات اور انھیں کے بنائے ہوئے اصول اور قواعد کی روشنی میں صنف وار پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ جدید نظم ہر صنف سخن میں شامل ہے اسلئے اس کا ذکر علیحدہ نہیں کیا گیا۔ حالی نے کوئی قابل ذکر ترجیع بند نہیں لکھا۔ صنف شاعری میں غزلوں کے بعد مسدس مثنوی اور ترکیب بند پر زیادہ توجہ کی۔ خیالات کے اعتبار سے ان کا کلام عصری رجحانات کا ترجمان ادب اور زندگی کا جیسا گہرا تعلق حالی کے کلام میں ملتا ہے، دوسرے شعراء کے یہاں نہیں ملتا۔ حالی کو نئے ادبی تقاضوں کا سب سے پہلے احساس ہوا۔ انھوں نے شاعری میں انفرادی شعور کے بجائے اجتماعی شعور پیدا کیا۔ وسعت و تنوع اصلیت و سادگی اور صداقت و حقیقت پسندی انکی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ غزل کی تنگ دامنی کو دور کیا، نظم کے موضوعات میں اضافے کئے۔ لفظی صناعی کے بجائے خیال اور جذبے کو شاعری کا معیار قرار دیا۔ مضمون آفرینی کے بجائے سادگی ادا اور وحدت فکر پر زور دیا۔ زبان کو وسعت دی سادگی، سلیس، رواں اور عام فہم الفاظ کو معیاری قرار دیا ان کی شاعری میں احساس کی شدت اور شعور کی گہرائی حد سے زیادہ ہے۔ اسی شعور نے انھیں حقیقت پسند بنایا اور زندگی کے ہر مسئلہ کو سمجھایا۔ انھوں نے قومی و ملکی، سیاسی و سماجی، معاشرتی و معاشی مذہبی و اخلاقی، علمی و ادبی تعلیمی و اصلاحی خیالات کی ترجمانی کی۔ انھوں نے۔

"پہلی اردو شاعری کو ماضی کے خوابوں سے چونکا کر حال کی تلخیوں کا احساس دلایا۔ اس میں عظمت اور زندگی پیدا کی اور اسے زمانے کے دوش بدوش لا کھڑا کیا"[1]

حالی کی شاعری میں عصری رجحانات کی فراوانی ہے۔ ان رجحانات پر تنقید بھی ہے اور صحیح طور پر انھیں کام میں لانے کے مشورے بھی۔ حالی نے جو کچھ کہا اس پر عمل کیا۔ شاعری سے وہ جو کام لینا چاہتے تھے، اس میں کامیاب ہوئے اردو شاعری میں مفید اور کام کی باتوں کے بیان کرنے کا راستہ کھل گیا۔

صالحہ عابد حسین کے الفاظ میں "حالی کا کلام قوم کے نام ایک حیات بخش پیام تھا جو اسے پہنچا اور اس نے حسب استعداد اسے قبول کیا۔ اب وہ اردو زبان اور ہندستانی تہذیب کی ایک عزیز دولت ہے جس سے اہل نظر اور اہل دل صدیوں استفادہ کرتے رہیں گے"[2]

مختصر یہ کہ حالی کی شاعری قوم و ملک کے حالات کا آئینہ، عصری رجحانات کی ترجمان ہے اس نے اردو شاعری کے دھارے کو صحیح سمت پر موڑا جس سے گلستان سخن سرسبز و شاداب ہوا۔ سبزۂ خوابیدہ کی طرح سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھی، سکوت و جمود، بے حسی و غفلت کا طلسم ٹوٹ گیا۔

حالی اٹھا بلا کے تحفل کو آخر اپنا کہہ گیا تو نے

---

[1] نئے اور پرانے چراغ۔ آل احمد سرور ص ۲۵ (۱۹۵۵ء) [2] یادگار حالی ص ۲۴۴

Marfat.com

باب پنجم

حالی کی مخالفت

مخالفت کے اسباب، مسدّس حالی کے جوابات، حالی کی دیگر منظومات پر فنّی و ادبی اعتبار سے اعتراضات و اصلاحات، مخالفت کا تجزیہ۔

ترتیب

آغاز مخالفت	۲۷۵
مسدس حالی کے جوابات	۲۷۷
شاعری پر اعتراضات	۲۸۶
مخالفت کا تجزیہ	۳۲۴
چند لفظی اعتراضات	۳۲۵
مخالفت کی حقیقت	۳۲۷

Marfat.com

حالی کی مخالفت

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

مولانا حالی نے اپنی شاعری کی بنیاد سادگی اصلیت اور جوش پر رکھی تھی۔ اسی اصول کے تحت انھوں نے اردو شاعری کا جائزہ لیا اور اس کے اندر جو جو خامیاں اور خرابیاں ان کو نظر آئیں، انھیں دور کرنے کا مشورہ دیا۔ شاعری کو مقصدیت، واقعیت اور سادگی کا حامل بنانے پر زور دیا لیکن یہ مشورہ ارباب ادب کے نزدیک قابل قبول نہیں تھا۔ وہ شاعری کو ان تمام جھگڑوں سے پاک رکھنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک شاعری کا حسین و نازک پیکر، مقصدیت کا بار نہیں برداشت کر سکتا۔ مگر حالی کے نزدیک یہ عقیدہ باطل تھا۔ وہ مغربی ادب کے مطالعہ اور زمانے کے نئے ٹھاٹھ سے متاثر ہو کر مشرقی شعر و ادب سے متنفر ہو گئے تھے۔ ایک دیرینہ سال پیر نے ان کے دل کی دنیا بدل دی تھی اسی دیرینہ سال پیر کی فرمائش پر انھوں نے ایک ٹوٹی پھوٹی نظر لکھی۔ جو نازک خیالی، رنگین بیانی، مبالغہ کی چاٹ اور تکلف کی چاشنی سے بالکل خالی تھی۔ حالی ہی کے الفاظ میں

"گویا اہل دہلی و لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا تھا جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں (تھا)"[1]

حالی نے یہ خوانِ ادب اسی لئے پیش کیا تھا کہ ان کی نظر میں اردو شاعری مہلک مرض میں مبتلا ہو چکی تھی۔ یہ مرض اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ شاعری ہوسناکی و لذت پرستی کا ذریعہ بن چکی تھی جس سے پورا معاشرہ متاثر تھا۔ حالی نے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح اس کہنہ مرض کا علاج کیا۔ اور جب اس کی رگوں سے فاسد اور زہریلا مادہ نکالنے کے لئے نشتر لگائے تو بیمار چیخنا چلانا، شور کرنا اور برا بھلا کہنا لازمی بات تھی۔ حالی کو بھی اس کا احساس تھا کہ

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا ترکش میں بے پناہ تیرے یہ زباں دہن تیرا

لیکن ان کے ترکش میں صداقت و خلوص اور شفا کے تیر تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کے تیر سے شاعری اور قوم دونوں کا مرض شکار ہو جائے اور دونوں تندرست و توانا ہو جائیں شاعری میں مبالغہ، جھوٹ، رنگینی اور تکلف کے بجائے سادگی، اصلیت اور جوش پیدا ہو اور شاعری

---

[1] مسدس حالی، دیباچہ اول ص ۱۱ (ناشر پرنٹ لینڈ، پاکٹ ایڈیشن)۔

انھیں خصوصیات وصفات کو اپنائیں تاکہ مشرقی ادب زندہ و پائندہ ہو جائے۔ یہ کوشش وہ عرصہ سے کر رہے تھے، شیفتہ کی صحبت اور غالب کی شاگردی نے ان کے خیالات کو تقویت دی۔ سب سے پہلے ۱۸۶۹ء میں مرثیہ غالب ترکیب بند میں لکھ کر اردو مرثیہ میں انقلاب لائے۔ ۱۸۷۲ء سے وہ جدید نظمیں لکھنے لگے۔ ۱۸۷۴ء میں لاہور کے مشاعرہ کی نظمیں لکھیں جو اردو شاعری میں نئے خیالات نئے رجحانات اور فطرت نگاری کی نشاندہی کرتی تھیں۔ ان نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی وہ نیا پن شروع کر چکے تھے لاہور والی غزل اگرچہ قدیم غزل ہے لیکن مسلسل نظم کا تاثر رکھتی ہے۔[1]

لاہور سے واپسی کے بعد، سرسید کی تحریک میں عملی طور پر شامل ہو جانے سے اصلاح و ترقی کا جذبہ اور بیدار ہو گیا لیکن یہ روشنیٔ طبع، ان کے لئے مخالفت و عداوت پریشانی اور مصیبت کا سبب بھی بن گئی۔

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو　　راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

حالی کا جرم صرف یہی تھا کہ انھوں نے شاعری کو حقیقت و صداقت کے اظہار کا آلہ بنایا اور دروغ و مبالغہ سے بچانے کی کوشش کی سچی بات کہنے کا جو اجر ملنا چاہیئے تھا وہی ان کو ملا۔

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی　　سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

مسدس کے شائع ہوتے ہی سب کی انگلیاں اٹھنے لگیں طعن و طنز کے تیر چلنے لگے۔ ان تیر اندازوں میں زندہ پارسا، معلم، مقنن، عالم و فاضل، مدبر و مصلح، شاعر و ادیب، حکیم و طبیب، مفکر و فلسفی، واعظ و خطیب غرض سب ہی حضرات تھے کیونکہ حالی نے مسدس میں، زوال امت مرحوم کے سلسلہ میں ان سب کی قلعی کھولی تھی اور ان کی ریاکاری، کو ظاہر کیا تھا۔ اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں۔

"مسدس کی تصنیف اور سرسید کی طرفداری و رفاقت کیا تھی جیسے مخالفت اور دشمنی کا ایک زبردست طوفان ملک میں ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ خائن، خیالی، ڈنخالی جیسے سنجیدہ حریف ان کو زیر کرنے کو اکھاڑے میں اتارے گئے۔[2]

مسدس کے جواب میں ایک دو نہیں درجنوں مسدس لکھے گئے، بڑے بڑے ثقہ بزرگ ظرافت کا غلاف چڑھا کر شاعر بنے اور تحفظ اسلام کی خاطر مسدس کا جواب لکھنے لگے۔ بڑے بڑے زبان داں تحفظ زبان کے لئے مسدس کی زبان کا مذاق اڑانے لگے۔ کوئی خالی بنا، کوئی خیالی، کوئی ڈنخالی بنا، کوئی موالی، کوئی مالی بنا کوئی عمامی کوئی مذہب کو پامالی سے بچانے کے لئے حاذق بنا، کوئی تسلیم۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اخبارات و رسائل نکالے گئے مسدس کے جواب میں اسی انداز میں مسدس لکھے گئے۔ لکھنؤ، دہلی، علی گڑھ

---

[1] اس غزل کا مطلع یہ ہے

نہ داں پرسش نہ داں تاب سخن ہے　　محبت ہے کہ دل میں مدعا مدفن ہے

[2] تذکرۂ حالی صفحہ ۱۹۸

Marfat.com

ہاہور، پٹنہ، گورکھپور وغیرہ کے شہسواران علم وادب کے قلم تنقید حالی میں عصائے موسوی بن کر نمودار ہوئے۔ لکھنؤ اس مخالفت کا مرکز بنا اور مسدس کی مخالفت باقاعدہ علمی وادبی، مذہبی تعلیمی، اصلاحی اور سماجی اعتبار سے کی جانے لگی۔

غالباً سب سے پہلے مسدس حالی کا جواب مولوی سلیم الدین جے پوری نے لکھنا شروع کیا۔ یہ جواب رسالہ تیرھویں صدی (ماہنامہ) میں مسلسل قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر سرسید کے مخالف خواجہ یوسف علی تھے۔ اس رسالہ [illegible] سید [illegible] اشہری، حاجی امداد علی خاں، خواجہ تجمل حسین وغیرہ لکھا کرتے تھے۔ [illegible] سال تک یہ شائع ہوگیا اس مسدس کا نام حدیقۃ المذہب تھا[1]

غرض مولانا حالی کے مسدس کے جواب میں متعدد مسدس لکھے گئے۔ ان میں سے اکثر کتابی شکل میں شائع ہوئے اور بیشتر اخبارات و رسائل ہی کے اندر گھوم رہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہاں صرف پانچ مسدسوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں اخبارات و رسائل میں شائع شدہ مسدسوں کا ذکر بھی کیا جائے گا۔

۱۔ مسدس حدیقۃ المذہب، عروج النظم، حامیٔ دین الخ، اغرب الکل مصنفہ مولوی سلیم الدین جے پوری۔

۲۔ مسدس غوثی بجواب مسدس حالی مصنفہ قاضی [illegible] چریاکوٹ

۳۔ مسدس خیالی بجواب مسدس حالی مصنفہ مولوی فخر الدین متخلص بہ خیالی

۴۔ مسدس لمعۃ العقول فی الرد علی مسدس حالی [illegible] مصنفہ حضرت خیال [illegible]

۵۔ مسدس خیالی مصنفہ حضرت خیالی

مسدس حدیقۃ المذہب کے چار نام تاریخی ہیں جن سے ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء یا ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء نکلتا ہے یہ مسدس ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس مسدس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ۳۹۲ بند اور دوسرے حصہ میں ۱۱۹ بند ہیں اس مسدس کا پہلا حصہ "سرسید اور ان کے عقائد" نیز ان کے رفقاء پر طعن و تشنیع کیے گئے ہیں دوسرے حصہ میں [illegible] پہلے حصہ میں [illegible] فرقہ ہائے اسلام کے حدوث و شیوع کا مختصر حال بیان کرکے [illegible] عقائد باطلہ و اجوبہ [illegible] دوسرا حصہ مسدس حالی کے جواب میں مشتمل ہے [illegible] بندوں کا ہوا ہے [illegible] اس کے بعد [illegible] ۱۸۸۷ء میں ہوگیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Marfat.com

تو یہ مسدس نہ معلوم کتنے بندوں کا ہوتا۔ مسدس کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

خدا سے رسول خدا نے دعا کی　　کہ دنیا میں یارب عذاب جزا کی
نہ ہو میری امت کو کچھ دردناکی　　دعا کر چکے یہ تو یوں التجا کی
کہ ان پر مسلط نہ ہو کوئی ایسا
جو بدلے کسی طور سے دین ان کا

سرسید اور ان کے رفقاء مولوی چراغ علی، مولوی مہدی علی اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ کی ہجو کرتے ہوئے حالی کے متعلق فرماتے ہیں۔

نہ تھا دوسرے صاحب طبع عالی　　فن نظم میں ہم صفیر ضلالی
یہی کچھ ہے جن کا عروج خیالی　　ہر اک قال کے راز ہیں جن پہ حالی
یہ کچھ لطف گفتار ہے کام ان کا
کہ مجموعۂ لطف ہے نام ان کا

تسلیم نے مسدس حالی کی لفظی و معنوی گرفت بھی کی ہے اور یہ خواہش سرسید سے کی ہے کہ اس نظم پر جو گرہوں میں گذارش　　وہ 'تہذیب' میں پائے حکم نگارش"[1]

اس گذارش کے بعد ایک ایک بند کو لے کر اعتراضات کئے ہیں۔ صرف ایک بند پیش ہے۔

تسامح کے لفظوں میں ہے جا بجا بل　　معانی میں ہے پھیکے پن کی لگی کل
ادا بدتوارہ ہے ترکیب مختل　　تیقن نہیں ہے تو سنئے مفصل
کہ ہر لفظ و مصرع نئے رنگ پر ہے
ہر اک شعر و بند اک جدے ڈھنگ پر ہے

مسدس حالی میں حالی کے خیالات سے بحث کی گئی ہے۔ اس مسدس میں کل ۹۵ بند ہیں ۸۰ بند عوالی کے اور ۱۵ بند حالی کے۔ پہلے چھ بند حمد و نعت پر مشتمل ہیں بقیہ ۷۲ بندوں میں ۱۵ کے ۱۵ بندوں کا جواب ہے۔ آخر کے دو بند والی رام پور کی مدح میں ہیں۔ عوالی نے طب، طبیعیات، فلسفہ، علم معقول پر حالی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور مغربی تعلیم و تہذیب کی مذمت کی ہے لیکن حالی کی نعتیہ شاعری کو سراہا ہے۔

پسند آئے مجھ کو یہ اشعار حالی　　کہ دی جس میں ہے داد نازک خیالی
جلی صفحہ سے سر بسر ہیں حالی　　عیوب کدورت سے یکسر ہیں خالی

---

[1] اردو جنوری اپریل ۱۹۵۹ء صفحہ ۴۴ (سید مبارز الدین رفعت نے تینوں مسدسوں کے جوابا بالتفصیل بیان کئے ہیں۔

معائب کے اپنے وہ خود معترف ہیں
تواضع کے انہار سے معتمرف ہیں[1]

اس کے بعد حالی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ سب سے پہلے "وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر" جواب ہے۔

کہے شعر آپ نے بیشتر سلک گوہر ہوئے آج سنڈاس سے کیوں وہ بدتر
جب آنے لگی اس میں بدبوئے نیچر ہوئے ایک دم میں وہ گندے سراسر

وہ اشعار تھے نیند دل حرز جاں ہیں
جو اسلام کے واصف و مدح خواں ہیں[2]

علماء و اطباء و حکماء وغیرہ پر حالی نے اعتراضات کئے۔ عوالی نے ان کے جوابات سختی کے ساتھ دیئے۔ یہ بند دیکھئے۔

زمانے کا بھی ان پہ جور و ستم ہے لئے ان پہ حالی بھی تیغ دو دم ہے
کبھی ان کی ہجو اور کبھی ان کی ذم ہے انھیں کے لئے تیز اس کا قلم ہے

ولیکن وہ صابر ہیں ہر اک جفا پر
محول ہے داداں کی روز جزا پر[3]

مسدس خیالی۔ اس مسدس میں بھی حالی کے خیالات کا جواب دیا گیا ہے۔ حالی نے جو مضامین پابندی احکام شرعی کے متعلق لکھے تھے۔

راقم نے ان سب کا جواب دیا ہے[4] یہ مسدس میں دو رباعیاں اور ۲۵ بند ہیں۔

ارباب صفا کی ہم زبانی چھوڑی زہد و تقویٰ کی مدح خوانی چھوڑی
جب سے اے قوم تو نے حق کو چھوڑا حق نے بھی تری ہمعنانی چھوڑی

پورے مسدس میں نیچریوں پر حملے میں نئی تعلیم و نئی تہذیب کی مخالفت ہے اور اردو افسانہ کی تعریف۔ ذہنی تحقیق اور حالی پر لعن طعن ہے۔

یہ تحقیق سب ہو گئی لا اُبالی ہوئے یہ مضامیں نہ اک دل پہ حالی
گئیں بارہ صدیاں محقق سے خالی یہ تیرہویں صدی میں ہونی تھی حالی

نہیں تھے ہمعصر بھی تحقیق والے
جو ہوتے نہ تحقیق کے پڑتے لالے[5]

---

[1] [2] [3] مسدس عوالی صفحہ ۲، ۳، ۱۵۔
[4] [5] مسدس خیالی دیباچہ صفحہ ۳، ۳۱

Marfat.com

مسدس حاذق "قومی و مذہبی سچی ہمدردی کی راہ سے لکھا گیا۔ منشی امیر اللہ تسلیم استاد حاذق نے تاریخ کہی۔

"چھپی نیچرل ردکی دلکش کتاب"

۱۳۲۴ھ م ۱۹۰۶ء

ایک اور قطعہ تاریخ آبد شیر کوٹی نے لکھا جس میں نیچری اور نیچریت کی خوب خبر لی ہے۔ مثلاً

رحم اے نیچری کہ رشتہ بباد — عزت دین و عظمت اسلام
وقف سائنس و محو نیچر فیشن — نافہی از نورغ فطرت اسلام
خانۂ دین خراب کردی و باز — ادعائے اشاعت اسلام
تو چہ فہمی حقائق دیں را — تو چہ دانی حقیقت اسلام

اس مسدس میں چار رباعیاں اور ۴۰ بند ہیں۔ مضامین کی ترتیب قریب قریب مسدس حالی کی طرح ہے البتہ کہیں کہیں اضافے کیے ہیں۔ غزوات کے بیان میں تیر و تیغ کی صفت۔ نئی تعلیم اور نئی روشنی کے مضر اثرات نیچرل شاعری اور نیچری فرقہ کی مذمت وغیرہ بیان کی ہے جوش مخالفت میں طنز و ہجو یہ انداز بیان پیدا ہو گیا اور کہیں کہیں دائرہ تہذیب سے باہر ہو گئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہمارے زمانے کے ذی ہوش نیچر — بنے فوج کے ایسے ہمدرد و مدبر
نہ خوف خدا ہے نہ خوف پیمبر — بنانے لگے دیر کعبہ کے اندر
جتھے یہ اندکان ہیں عشیطنت کے
نہیں آدمی دہریے اس صفت کے

دعاؤں میں پیدا ہوا یہ خلل ہے — کہ کہتا ہر اک نیچری بقل ہے
تمسخر کے قابل نماز آج کل ہے — مذہب کوئی اس سے کرتا خجل ہے
رکوعوں میں دو ہاتھ گھٹنوں پہ دھرنا
سُریں جانب چرخ سجدوں میں کرنا [۵]

اس کے بعد مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے کہ وہ نیچریت کے جال میں ہرگز نہ پھنسیں کیونکہ

یہ اسلام کے حق میں بوتے ہیں کانٹے — خدا ان کو بھڑکے رسول ان کو ڈانٹے [۶]

نیچری تعلیم و تہذیب سے کفر و ضلالت کی گھٹائیں چھا گئیں۔ دین و ایمان رخصت ہو گیا، بے حیائی و بے غیرتی کا بول بالا ہوا مشرقی تہذیب و اخلاق کا جنازہ نکلا، بے مردگی و بے حیائی

---

[۲] مسدس حاذق دیباچہ صفحہ ۴-۸۶

[۳] تا [۶] مسدس حاذق صفحات ۸۷-۴۳، ۸۳، ۴۴، ۵۸ علی الترتیب

Marfat.com

شن پرستی، اور آوارگی عورتوں کا شعار ہو گیا۔

کیا پاس سرمایہ یورپ میں کھو کر — چلے قید مذہب سے آزاد ہو کر
پڑے پیچھے عزت کے اب ہاتھ دھو کر — رہے ننگ و ناموس کو بھی ڈبو کر
لگے زاغ بنگال انگریز بننے
زن حاملہ جائے یورپ کو جننے [1]

اعتراضات کی یہ فہرست کافی طویل ہے۔

مولانا حالی نے مسدس میں ہماری شاعری اور شعراء کے معائب بیان کئے تھے اور ان کے وجود معاشرہ کے لئے بے کار اور مضر بتایا تھا۔

یہ کہہ جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے — کہیں مل کے دخس کم جہاں پاک "سارے

حالی نے مشرقی شاعری کی تعریف اور نیچرل شاعری کی مذمت کر کے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

ہوئے مشرقی شاعری پر بھی حملے — اجاڑے گئے باغ مضموں کے کملے
یہاں گر کوئی نام کوئے صنم لے — نئی شاعری اس کو چپ کر کے دم لے
کہ لینا نہ اب نام کوئے بتاں کا
خطر اس میں رہتا ہے ہر وقت جاں کا [2]

نہ ہے شعر گوئی کا ان کو سلیقہ — نہ سیکھا ہے شعر و سخن کا طریقہ
نہ ہے یہ اب وجد کا ان کے شیوہ — نہ پائی ہے فطرت سے طبع انیقہ
عروضی قواعد کی پروا نہیں ہے
قوافی میں تمیز اصلا نہیں ہے

نہیں جانتے خاک اردو زباں کو — سمجھتے ہیں اعجاز اپنے بیاں کو
مٹاتے ہیں یہ شاعری کے نشاں کو — برا کہتے ہیں شاعران جہاں کو
بڑی دھوم ہے نیچرل شاعری کی
حقیقت یہاں ہے بھلا کیا کسی کی [3]

توانی کہ جن پر مدار سخن ہے — انھیں سے ہوئی ان کو پیدا جلن ہے
توانی ہیں ارواح کو شعر تن ہے — نہ ہوں گر قوانی تو کیا خاک فن ہے

---

[1] مسدس حالی صفحہ ۱۰۸ [2] مسدس حالی صفحہ ۹۶ (نامی پریس کان پور)
[3] " " " ۵۲-۵۳

Marfat.com

جمے خاک اشعار میں رنگ ان کا
توانی سے ہے تا نہ تنگ ان کا [1]

حاذق کے خیال میں مشرقی شاعری کو اس لئے برا کہا گیا کہ اس کے سامنے نیچرل شاعری کا چراغ نہیں جل پاتا۔

بلا کھائے ان مشرقی شاعروں کو
فروغ ان کے آگے نہیں نیچروں کو [2]

حالی نے یونانی طب اور فلسفہ پر نکتہ چینی کی تھی۔ اس کا جواب حاذق نے یوں دیا۔

سنبھالو ذرا چونچ یارانِ نیچر — نہ جاؤ نکل پائجامے سے باہر
فلاطوں کا حکمت میں تھا کون ہمسر — ارسطو سے تھا فلسفی کون بڑھ کر
انھیں سارا یورپ بھی مانے ہوئے ہے
جہاں ان کے رتبے کو جانے ہوئے ہے [3]

مسدس حالی پر سب سے سخت حملہ "اودھ پنچ" لکھنؤ کا تھا جس نے اپنے خیال میں ان حملوں سے پانی پت کے میدان کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے — میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

پانی پت کی یہ چوتھی جنگ ادبی جنگ تھی جس میں ایک طرف مخالفین کا عظیم الشان لشکر تھا جس کے ترکش میں بے شمار تیر تھے دوسری طرف تنہا حالی جنھوں نے اس نرالی جنگ کو اپنی متانت و خاموشی اپنے صبر و استقلال اور اپنے صدق و صفا سے جیت لیا۔ بقول اسد ملتانی

ادھر قوم کی گمرہی اور شقاوت — ادھر اک مجاہد کی شان جمالی
ادھر تیرہ بینی و باطل پرستی — ادھر راست گوئی و روشن خیالی
ادھر قوم غافل کی ہر گوں پستی — ادھر ایک مصلح کے افکار عالی
ادھر قوم پر خواب غفلت کا غلبہ — ادھر شاعر قوم کی نرالی
ادھر کان نغمات سننے کے عادی — ادھر نالہ و آہ سے گوشمالی
ادھر بے شمار اعتراضات بے جا — ادھر چند نظمیں تکلف سے خالی
ادھر طعن و تشنیع کے تیر و نشتر — ادھر تلخ کامی میں شیریں مقالی
ادھر ایک بگڑی ہوئی قوم ناداں — ادھر محو فریاد بے چارہ حالی
ادھر ڈھال بے اعتنائی کی اٹھی — ادھر تیغ اس نے قلم کی نکالی

---

[1] تا [3] مسدس حاذق صفحہ ۵۲ - ۵۴ - ۵۵

اسد یہ کرشمہ تھا صدق وصفا کا
کہ اک فرد نے قوم پر فتح پالی لے

یہ جنگ کافی عرصہ تک جاری رہی۔ اس ادبی معرکہ میں زیادہ تر اہل کمال حضرات تھے اسلئے ان کے اعتراضات میں ادبی شان اور وزن دونوں ہے۔ طنز و مزاح اور ظرافت کے تیر اس انداز سے چلائے گئے کہ زخم خوردہ بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتا۔

خالی نے مسدس حالی کا جواب لکھا حضرت خالی اپنے ایک خط میں اس کے متعلق ایڈیٹر اودھ پنچ کو لکھتے ہیں۔

ظرافت الدولہ، فصیح الملک اودھ پنچ بہادر زاد قہقہائہ تسلیم

"مولانا جمعہ کے دن میں چوک میں ایک کتب فروش کی دکان پر گیا تو ایک عجیب کیفیت دیکھی ایک طرف دیکھا کہ ایک نیلے پیلے رنگ سے مسدس کا ڈھیر لگا ہے اور دوسری طرف اسکول اور کالج کے لڑکوں کا۔ جو خرید کرتا ہے باغ ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ جناب مصنف نے تو وہ زبان پائی ہے کہ چار سے ملا دی ہے۔ جس طرح چار سے نے چھوٹے سکشن کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اسی طرح مولانا نے ٹھیٹھ الفاظ کے استعمال میں کوئی دقیقہ تلاش کا اٹھا نہیں رکھا۔ کوئی کہتا ہے۔ جناب مصنف نے جغرافیہ کا تو خاتمہ کر دیا ہے۔ مسدس یاد کر لو اور انٹرنس کا امتحان پاس۔ کوئی کہتا ہے کہ "علم تواریخ میں تو مولانا کو وہ عبور ہے کہ ہسٹری آف گریس اور ہسٹری آف روم تو گویا گھر کی لونڈی ہے کوئی کہتا ہے کہ "مولانا نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ ہندوستانی فصاحت سے جب سے جنٹلمینوں کے دماغ میں خلل آتا ہے۔ اپنے کلام کو ایسا پاک صاف رکھا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

حضرت خالی طلباء کی تعریف پر سخت حیران ہوئے کیونکہ اس سے قبل انھوں نے مسدس حالی کا ذکر بزم شعراء میں نہیں سنا تھا۔ آخر صبر نہیں ہو سکا۔ طلباء سے دریافت کیا تو جواب ملا۔

"آپ نہیں جانتے یہ مولانا حالی کا مسدس ہے۔ آپ لوگ پرانے خیال والے ہیں۔ ہم لوگوں کو تو اس قدر مطبوع ہے کہ چھ مرتبہ طبع ہو چکا ہے مگر ہم لوگوں کی خواہش کر نہیں ہوتی"

جب پوچھی تو لڑکوں نے کہا۔

"ہمارے ہندوستان کی شاعری انگریزی شاعری کی نہیں ہے جو تعریف اور مبالغے سے بھری رہتی ہے لیکن انگریزی شاعری میں یہ داخل عیب ہے ہماری شاعری میں ایک تاثیر کی چیز

لہ مخزن شوال ۱۳۵۲ھ

Marfat.com

ایسی لگی ہے جس سے شعراء کا قافیہ تنگ ہوتا ہے لیکن انگریزی بلینک ورس وہ ہے جس میں قافیہ سے کچھ بحث ہی نہیں۔ مصرعوں کا چھوٹا بڑا ہو جانا عیب نہیں۔

اگر ایک مصرع "گئی ہے جو یاں سے مدینے تلک۔

تو اس کا دوسرا مصرع صرف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سڑک" کافی ہے

مولانا نے اسی شاعری کی تقلید کی ہے اور ہر چند قافیہ اور وزن کو تو ابھی چند روز کے لئے رہنے دیا ہے مگر ساری ترکیب وہی ہے اور زبان ایسی پیاری رکھی ہے جس کو ادنیٰ گنوار تک سمجھ لے۔

مسدس کی یہ مدح بالذم، سن کر حضرت خالی سننے کے لئے بیتاب ہو گئے، دو چار بند پڑھنے کی فرمائش کی اور صاحبزادے نے تعمیل کی۔ ابھی دس پانچ بند ہی سنے تھے کہ حضرت خالی کو

"متلی آنے لگی کیسی گوبر کی کھوٹی اکھاڑ تھان سنی تھی مگر واللہ کھوٹی اکھاڑ مسدس نہیں سنا تھا بعض بند تو بالکل سانپ کی جھاڑ اور بچھو کے منتر ہیں"

غالباً سانپ اور بچھو کا زہر اتارنے کے لئے حضرت خالی نے مسدس خمیدہ کر ایک مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ مسدس کے مطالعہ کے بعد انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ

"اگر کوئی شخص اس مسدس کو چالیس مرتبہ پڑھے تو یقیناً پاگل ہو جائے اعتقاد شرط ہے"

خالی کی جودت طبع اور ندرت فکر کب ماننے والی تھی؟ انھوں نے اس خیال سے کہ

"یہ لڑکے جو اس ترکیب پر فریفتہ ہیں اسی وقت لڑکے ہیں۔ آگے بڑھ کر یہی ارباب وزراء میں شمار ہوں گے اگر اس وقت ان کو مسدس حالی پسند ہے تو مسدس حالی کیوں اسی وقت ایسا نہ کہا جائے کہ ان کی پختہ دماغی کے وقت بھی ان کو پسند ہو"

یہ سوچ کر دو دن کی کاوش میں بیس بند دھر گھسیٹے" اس کی خصوصیات خالی نے یہ بتائی ہیں کہ

"بندش ایسی انوکھی کہ دیدہ ور شنید۔ لفظوں کی نشست کشت زعفران، جغرافیہ کی وہ بھرمار ہے کہ نظم کا ہے کو ہے کرۂ ارض کا نقشہ ہے۔ تواریخ میں وہ نام استعمال ہوئے ہیں کہ مولانا کے فرشتے خاں کو بھی غالباً معلوم نہ ہوں۔

مولانا حالی کا مسدس پڑھ کر تو صرف انٹرنس ہی پاس ہو سکتے تھے مسدس خالی کو پڑھ کر

"بی۔ اے کے امتحان میں فرسٹ گریڈ یقینی پاس" اس لئے یہ ہدیہ مختصر پیش ہے۔

اگر خاطر شریف میں آئے تو چھاپ دیجئے۔ والسلام۔

اس پورے مسدس میں نیا جغرافیہ اور نئی تاریخ ہے۔ نئے نئے مقام اور نئے نئے حالات ہیں۔ زبان شاعری کا کیا کہنا۔ مولانا حالی کی شاعری کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ مسدس کا آغاز دجال کے سفر سے ہوتا ہے

چلا جبکہ دجال بن ٹھن کے سیزر ۔ پریمیئر سے دم لیا بالکن پر

Marfat.com

ٹی ٹیکا کا اور اوجھو سے نکل کر لگا دینے آگے وہ ہڑڈی میں چکر
شکم کو جو پایا نہ گڈھوپ میں ہے
تو کی دھوکے آرکھٹک میں اپنا منہ قے

یہ دجال اسی طرح دنیا بھر کی سیر کرتا رہا۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں وہ نہ گیا ہو آخرش۔

ہوے ساتھ کالج کے لڑکے تو چھانٹا جو لوٹا تھا کٹھل وہ کیوبا میں بانٹا
چھپا جب برزیل میں اس کو کانٹا بڑے زور سے بھائی شاعر کو ڈانٹا
نہ نظم مرتضیٰ۔ نہ ہے نثر عادی
انوکھی میاں شاعری ہے تمہاری

اس کے بعد حالی کی شاعری کا مذاق اڑایا ہے۔

کھا بُز کو بکرا تو خندق کو گڈھا حبش کا ابی سینیا نام رکھا
جو خالص اچھوتا تو بدشکل بھونڈا بنایا کلام اپنا گڈھیوں کا
جو تحسار کہلائے نئے بیپاری
تو نسرین و [illegible] مٹر اور کھاری

حالی کی ادبی اصلاحات اور متروک الفاظ کے استعمال کا تمسخر کرنے کے بعد یہ فیصلہ لکھ دیا:

طریقہ ابا کی جو تھا سب کو چھانڈا لگایا بس انگلینڈ سے اپنا ڈانڈا [1]
بڑا عقل پر حرص بے جا کا کھانڈا رہا صرف کھرچن نہ حلوانہ مانڈا
ہوے تم نہ ناسخ بنے تم نہ ملٹن
رہے پانی پت ہی میں گوپال ٹھن ٹھن"

زیادہ حد ادب۔ راقم حالی [2]

حالی ناسخ اور ملٹن نہ بنے کو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن یہ گوپال ٹھن ٹھن [illegible]

بہرحال حالی کی 'انوکھی شاعری' پر اعتراضات یوں تو ادب کے ہر مکتب خیال [illegible] مکتب خیال کو حاصل رہی جدید رنگ غزل نیچرل شاعری [illegible] ابا [illegible] حالی کی اس رباعی کی بدولت۔ [3] اکتوبر [illegible]

جس کی چین میں ہر زبانی چھوڑی بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

[1] اودھ پنچ جلد بست و پنجم نمبر ۴۹ - ۳ اکتوبر [illegible] صفحہ ۲ تا ۶

Marfat.com

دیگر قومی و اصلاحی نظموں کی مخالفت کا سلسلہ وسیع پیمانہ پر جاری ہی تھا کہ مولانا حالی نے مجموعہ نظم حالی ۱۸۹۰ء میں شائع کیا جس میں قدیم شاعری سے انحراف کرنے اور جدید شاعری اور مغربی خیالات کو اپنانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اس کے تین سال بعد ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ حالی نے اپنا دیوان، مقدمہ شعر و شاعری، کے ساتھ شائع کیا جس میں ایشیائی شاعری خصوصاً اردو شاعری کو نشانۂ ملامت بنایا گیا اور سچائی اور ایمانداری کے ساتھ اردو شاعری کی خامیاں اور غلطیاں دور کرنے کا مشورہ دیا گیا نیز اس کو بہتر، مفید اور کارآمد بنانے کی طرف، ارباب ادب کو متوجہ کیا گیا۔ مقدمہ کا شائع ہونا تھا کہ آگ لگ گئی۔ مخالفت کا طوفان شد و مد کے ساتھ اٹھا لکھنؤ اس سیلاب مخالفت کا منبع و مرکز بنا کیونکہ

> "مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں لکھنؤ اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی ہیں ان کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعراء کے کلام سے لیا تھا جس کا لازمی منشاء اودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعراء کی توہین ہے۔ ان خیالات کا دلوں میں امنڈنا تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ اور نفس مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اودھ پنچ کی شکایت بے بنیاد نہ تھی۔"

اہل لکھنؤ کو یہ بھی اعتراض تھا کہ

> "مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطری شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔" [1]

لیکن حکیم ناطق لکھنوی کے نزدیک اعتراضات کی پہل لکھنؤ نے کی اور حالی نے انتقاماً لکھنوی شاعری کے عیب نکالے۔

> "لکھنؤ کے کسی ناعاقبت اندیش نے ان کی شاعرانہ غلطیاں شائع کیں۔ اس کے بعد سے حالی نے شعرائے لکھنؤ سے خوب خوب انتقام لیا تمام لکھنؤ کے لئے لکھ دیا کہ رعایت لفظی اور مذاق سوقیانہ پر لکھنؤ کے شعراء کا دارومدار ہے۔ حالانکہ کسی شہر میں شاعری کے اتنے رنگ نہیں جتنے لکھنؤ میں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں تمام ہندوستان کے تمام اہل کمال جمع ہوئے جو ایک دوسرے سے مختلف مذاق رکھتے تھے۔" [2]

حکیم ناطق کی یہ رائے حقیقت سے دور ہے۔ حالی نے انتقام لینا تو کجا کسی ایک اعتراض کا جواب تک نہیں دیا۔

---

[1] گلدستہ پنچ مرتبہ پنڈت کشن پرشاد کول صفحہ ۹-۱۰

[2] نظم اردو حاشیہ صفحہ ۱۸۸

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ　　سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

بلکہ وہ مقدمہ ہی میں 'مخالفت' و اعتراض پر یہ رائے ظاہر کر چکے تھے۔

"اگر صرف غلطیوں کے دکھانے ہی پر اکتفا کیا جائے اور خوبیوں کو تکلف برائیوں کی صورت میں ظاہر نہ کیا جائے تو بھی ہم اپنے تئیں نہایت خوش قسمت تصور کریں گے۔" [1]

مگر ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی، اور ان کی خامیوں کے ساتھ خوبیوں کو بھی شامل کر لیا گیا تاہم انھوں نے کوئی شکوہ نہیں کیا۔

"یہ بھی غلط ہے کہ وہ پوری لکھنوی شاعری کے خلاف تھے۔ وہ مرزا شوق کی مثنویوں کو "زبان کی گھلاوٹ، اور محاورہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدر منیر کے بہت بڑھا ہوا" سمجھتے تھے [2]

اور اسی طرح مرثیوں میں میر انیس کی تعریف کی ہے۔ میر انیس سے ان کی عقیدت روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ اگر انھیں لکھنوی زبان سے کسی قسم کی کوئی خلش ہوتی تو وہ میر انیس کی تعریف کرتے وقت یہ کبھی نہ لکھتے۔

اردو کو راج چار سو تیرا ہے　　شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی　　تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

یہ صحیح ہے کہ حالی نے مقدمہ میں لکھنؤ کے عامیانہ مذاق اور رسوقیانہ خیالات کا مفصل ذکر کیا ہے لیکن وہ کسی کے جواب یا انتقام میں نہیں بلکہ یہ تو ان کا شعری نظریہ تھا۔ وہ اردو شاعری کو اس قسم کے جذبات اور خیالات سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ اسی جذبہ اصلاح اور نظریۂ شاعری کی وجہ سے اکثر اوقات وہ شاعرانہ لطافتوں کا خیال نہیں کرتے تھے بلکہ معانی پر زیادہ توجہ دیتے تھے جس کی بدولت ان کی اصلاحی شاعری کو دائرہ شاعری سے خارج کر دیا گیا۔ غزلوں میں صرف قدیم رنگ تغزل کو تسلیم کیا گیا اور جدید رنگ کو غیر شاعرانہ۔ خود حالی بھی غزلیں لکھنے سے پرہیز کرنے لگے تھے، مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر، لکھ کر جب مشاعرہ میں پڑھا تو یہ خبر اشاعت شائع ہوئی۔

"مولوی الطاف حسین حالی نے کوئی غزل نہیں لکھی بلکہ غزل نہ لکھنے کا عذر ایک قطعہ میں بیان کیا ہے جس کو سن کر میر مشاعرہ نے ان کو غزل پڑھنے سے معذور رکھا۔ قطعہ یہ ہے

ہوئی ریحان جوانی کی بہار آخر حیف!　　طبع رنگین تھی مری عشق کی جب سوالی [3]

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۳۰۵　[2] مقدمہ شعر و شاعری ۳۰۲
[3] ریاض الاخبار۔ گورکھپور ۴ جون ۱۸۹۴ء صفحہ ۵

Marfat.com

حالی کا یہ اعتراف ان کی علمی بے مائگی، اور شاعرانہ بے بصری کا مرادف سمجھا گیا۔

"ہم حالی یا آزاد کے سراہنے والوں میں نہیں ہیں ہم کو اگر ناز ہے یا فخر ہے تو اودھ پنچ، اور ریاض اور آزاد، اور حضرت ستم ظریف پر" [1]

اودھ پنچ، ریاض الاخبار، مشیر قیصر، بہار پنچ، مشرق اور دوسرے اخبارات و رسائل، حالی کی شاعری کے پیچھے پڑ گئے۔ حالی کے ہمدرد، زیادہ تر پیسہ اخبار، اور البشیر میں لکھتے تھے۔ اخبار پنجابی لاہور میں حالی کی نظمیں معہ تعریف و تبصرہ کے شائع ہوتی تھیں۔ حالی اس قسم کے مباحثوں سے گریز کرتے تھے اور اپنے احباب کو بھی منع کرتے تھے ان کا مسلک صلح کل تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے کسی کے بُرا بھلا کہنے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ مخالفین ان کے پاکیزہ خصائل کے معترف تھے۔ وہ اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے تھے کہ

"حالی صاحب کے تقدس اور بزرگی اور قومی مرثیہ گوئی کی تعریف کرنے والوں کو یہ مان لینا چاہیئے کہ ان کے ان صفات پر کبھی اعتراض نہیں کیا گیا۔ ہم ان کے قومی درد کو مانتے ہیں" [2]

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ

"ہم ان کو شاعر نہیں سمجھتے۔ زبان داں نہیں جانتے۔ اس میں اگر ہمارا قصور ہے تو اس کی اصلاح آپ لوگ کر سکتے ہیں" [3]

شاعر نہ سمجھنے کی سب سے بڑی وجہ مولانا حالی کی نام نہاد نیچریت تھی وہ، سرسید کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ ۱۸۷۴ء سے نیچرل شاعری کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل تھے۔ نیچریت اور نیچرل شاعری کی مخالفت، ہر طبقہ کی طرف سے شدت کے ساتھ ہوئی۔ عرف میں نیچریت، کا حُسن جہاں سوز تھا، نیچری کانفرنس کی آرائش، دشمن ایمان و آگہی تھی۔ پیر نیچر کا وعظ راہزن تمکین و ہوش تھا۔ نیچری احباب، نیچری تعلیم، نیچری تہذیب، نیچری شاعری سب کفر ساماں تھی۔ ابوالمجد دردیسنوی نے نیچرل لفظوں کی تشریح اس طرح کی ہے:۔

نیچرل شاعری	وہ جنہ عروض سے نابلد، قوافی سے انجان ہو، مگر ان لن ترانی کے میدان میں شیرزیاں اور ایجاد کردہ پرنازاں"

---

[1] ریاض الاخبار۔ گورکھپور، ۲۵ مارچ ۱۸۸۸ء صفحہ ۵
[2] " " " ۲۸ جون ۱۹۰۵ء " ۲
[3] " " " " " ۱۹۰۵ء " ۲

Marfat.com

نیچرل شاعری — وہ جس کی بناوٹ حسن فروشوں کی کشش رکھتی ہو بیٹھیڑ ہندی کی بھرمار اور غیر مانوس لفظوں کا طومار ہو۔

نیچرل ترجمہ — وہ جس میں خوگیر کی بھرتی ہو۔ دہقانی جنات اور وہمی شیاطین کی بولیاں ہوں اجنبی زبانیں، عملی تاویلیں ہوں اور اس پر ہمچو من دیگرے نیست" کی احمقانہ حسد ائیں"

نیچرل تعلیم نیچرل ترقی — الحاد و دہریت کی تربیت، خدا کے وجود سے انکار، پیغمبری سے بے خبری۔ مال مفت کی تلاش، نصف الی نصف۔ الک، پرہم خیالوں کی جستجو، ریفارمر کا ادعا۔ آفسو بہانے میں یکتا، جدت کا فریفتہ، اجتہاد کا شیفتہ، ریفارمیشن قائم کرنے کا دلدادہ۔ میٹھی گرمانے کا شیدا۔

نیچرل ملا — نیمے دروں، نیمے بروں، نہ نیچرم نہ مسلمان نہ سوفیم نہ ہندو یعنی معجون مرکب ہر رنگ میں شرابور اور جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو پھر اس سے خدا سمجھے۔

نیچرل شمس العلماء — لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔ چار پائے بر کتابے چند،

مولانا حالی شاعر بھی تھے اور نثار بھی، ترجمہ بھی کرتے تھے تعلیم و ترقی کے دلدادہ بھی تھے۔ مولوی اور ملا وہ ہو چکے تھے شمس العلماء کا خطاب بھی پا چکے تھے، اس لئے یہ تمام تلمیحات انہیں کے اوپر صادق آتی تھی۔ انجمن نے شاعری کے سلسلہ میں جو صلاح اور مشورے دیئے وہ [1] انہوں نہیں ہوئے "شجر شاعری کی نئی شاخ" کے عنوان سے کسی بہتر نے لکھا تھا۔

"آج کل اردو کی ترقی کے زمانے ہیں۔ شاعری کے ڈنڈ میں پانی پت اور پنجاب، دکن وغیرہ وغیرہ کی افراط رطوبت سے بہت سی شاخیں نکل رہی ہیں مثلاً

تخیل کی جدت — اگرچہ گندہ ہو مگر ایجاد بندہ تو ہے

قافیہ پیمائی سے نفرت

زبان کی درگت — مگر اس سامان کے ساتھ گنی ہوئی اور نپے شعر ہے کا مسئلہ [2] معلوم ہوتا ہے"

اس کے بعد مثالیں دے کر رہی سہی کسر پوری کر دی۔

اسی طرح "ترقی اصلاح زبان اردو" کے نام سے ایک مصلح ادب نے مضمون لکھا اور حالی کی شاعرانہ جدت و ندرت اور ان کی ترقی پسندی پر یوں گلفشانی کی۔

---

[1] اودھ پنچ ۲۹ دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵

[2] " " ۲۸ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۵

Marfat.com

"آپ جانتے ہیں کہ ہر صیغہ میں ایک مجدد ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ حالی صاحب نے شاعری میں کیسی عمدہ تجدید فرمائی ہے اور کیسے کیسے الفاظ ایجاد کئے ہیں مثلاً

پیش گوئی بجائے پیشین گوئی پانڈی بجائے پنڈت

تانیث و تذکیر کا جھگڑا جسے ہمارے نکتہ سنج شعرا بعض وقت اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور ردیف و قافیہ بھی اس اردو سے بہتر خیال کے لئے بڑی رکاوٹ ہے۔

انھوں نے ایک مختصر نظم بطور نمونہ تانیث و تذکیر کو بدل کر اور کچھ لفظوں کے معنی اور چند کا تبادلہ دیگر حروف سے کر کے خدمت میں پیش کیا۔"

ہے ترقی پہ ان دنوں اردو — تی با تیں حرام کرتی ہوں

چھوٹی باتوں کو بڑھ کے کہتی ہوں — سچی باتوں کو بام کرتی ہوں (طشت از بام)

یہ پوری نظم اسی طرح مہمل و مضحکہ انگیز ہے۔

مولانا حالی نے مثنوی گلزار نسیم پر چند اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں پنڈت برج نرائن چکبست نے "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اس مضمون میں حالی پر سخت اعتراضات کئے ہیں۔ چکبست مولانا حالی کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے کیونکہ

"حالی کے دیگر اوصاف کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے ان کی حالت قابل افسوس ہی نہیں بلکہ قابل رحم ہے۔ انھوں نے اگر گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم کی ٹاپوں سے پامال کرنا بھی چاہا تو کچھ زیادہ فکر کا مقام نہیں۔"

مگر احباب کے اصرار کرنے پر جوابی مضمون لکھنے کے لئے مجبور ہوئے اور اسی غرض سے گلزار نسیم کے مطالعہ میں محو تھے کہ نیند آگئی اور خواب میں انھوں نے ایک باغ مینو سواد، کو دیکھا جس میں سوا ایک بلبل ہزار داستان، کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اتنے میں ایک "بزرگوار" داخل ہوئے۔ ان کے آتے ہی بلبل سریلی آواز میں یوں نغمہ سرا ہوا۔

چمن پہ ناز نہ کیونکر کرے بہار چمن — قدم نسیم کے آئے بڑھا وقار چمن

پھر باغ کے مغربی دروازے سے ایک پیر مرد ایک ہاتھ میں پانی پت کا عصا، دوسرے ہاتھ میں دیوان حالی معہ مقدمہ، لے کر تشریف لائے۔ ان کو دیکھ کر بلبل ہزار داستان ایک دردناک لہجہ میں یوں نغمہ زن ہوا۔

خزاں کے دور کے مانند دورِ حالی ہے — سمجھ لو بلبل و گل سے یہ باغ خالی ہے

لہ اودھ پنچ۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۰۴ء صہ ۲

Marfat.com

اس کے بعد دونوں بزرگوں میں بات چیت ہونے لگتی ہے۔ مولانا حالی اعتراضات کرتے جاتے ہیں اور نسیم ان کا جواب دیتے جاتے ہیں درمیان میں "بلبل ہزار داستان" بھی حالی پر نکتہ چینی کرتی جاتی ہے ایک ایک کر کے تمام اعتراضات رد ہو جاتے ہیں۔ حالی نے ایک شعر کے دوسرے مصرع میں اصلاح دی تھی۔ شعر یہ تھا۔

آتا تھا شکارگاہ سے شاہ نظر نہ کیا پدر نے ناگاہ

حالی نے یہ اعتراض کیا کہ "اس نے نظر کی" دونوں مصرع مربوط نہیں ہیں کیونکہ الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شاہ اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے دوسرا مصرع یوں ہونا چاہئے ۔۔۔ بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ"

نسیم نے اس کو بھی غلط کہا اور بتایا کہ اصل شعر یوں ہے۔

آتا تھا شکارگاہ سے ۔۔۔ ۔۔۔

اب بلبل ہزار داستان نے حالی کی بحر اور قوافی سے ۔۔۔ کی مثل چسپاں کر کے حالی کے سامنے انھیں کا یہ شعر پیش کر دیا۔

سنتے ہیں غلام نامور کے بہت گستاخ تھے ایک دن خادم کی گستاخی پہ ۔۔۔ کہا

اعتراض یہ کیا کہ آپ کا مطلب نامور سے دونوں ۔۔۔ لیکن الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ بچے ۔۔۔ اور نامور کے معنی ہیں۔ یہ اصلاح تو ایسی بانکی دی کہ بارک اللہ کہتے ہیں۔

"بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ"

کیا نشست الفاظ ہے کیا پڑی (پڑی) بنائی ہے؟ اگر آپ کی شاعری کا دام ڈھیلا نہ ہوتا تو ایسا مصرع نہ نکالتے شاعر ہیں لیکن صفائی بندش کے دشمن ہے۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں

"ایسی بندش سے تو بہتر تھا کہ بیٹھ رہتے"

ایسی بندش تو نثر میں بھی کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے۔ نظم تو درکنار۔ آپ کہتے ہیں۔

خندہ زن ہے جو مسلمانی پہ کفر ایسی ہے تاڑ مسلمانی

معلوم ہوتا ہے مولانا کے ۔۔۔

نظر ۔۔۔ اس کے بعد حالی نے ۔۔۔ کر کے اعتراض کیا اس کا ۔۔۔

مقابلہ اگست نئی معاشرت آپ شاعر ہیں ۔۔۔ آپ کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اصول شاعری سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ آپ کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے

Marfat.com

اور نثر میں کچھ فرق نہیں حالانکہ کئی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں نثر میں یہ اصول پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ جو مضمون بیان کیا جائے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ ان سے ایک ہی معنی صاف طور پر پیدا ہوں برخلاف اس کے نظم میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جاتا ہے۔ اختصار کے ساتھ باندھا جائے، محض ایک حالت کا اشارہ کرے اور ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کے متعلق مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھ کے سامنے گزر جائیں۔

بلبل ہزار داستاں نے کہا۔

"ہمارے حالی صاحب تو نظم و نثر میں سوائے قافیہ اور ردیف کی پابندی کے کوئی فرق ہی نہیں سمجھتے۔ آپ تو انگریزی نظموں کے ترجمے پڑھتے ہیں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے سے ان نظموں کی نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر تشریف لے جاتے ہیں لہذا آپ سمجھتے ہیں کہ مغربی شاعری ویسی ہی ہے جیسی کہ آپ سمجھتے ہیں آپ کے نزدیک تو نظم کرنا اور شعر کہنا ایک ہی چیز ہے۔"

یہ سننا تھا کہ مولانا حالی برافروختہ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"اس بے ادب کو کس نے آنے دیا چمن میں"

نسیم مداخلت کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کرتے ہیں کہ

"آپ کو گلزار نسیم سے کوئی خاص تعصب ہے کہ ایسے بادہوائی اعتراضات کئے؟"

بلبل ہزار داستاں تعصب ہونے میں کوئی شک بھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔"

حالانکہ سارا زمانہ جانتا ہے کہ دو ہی مثنویاں مقبول ہیں ایک سحر البیان اور دوسرے گلزار نسیم۔

اب حالی چراغ پا ہو جاتے ہیں اور بلبل ہزار داستاں کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں

"تیری زبان درازی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ لے میں تیری قضا کا پیغام لایا ہوں" یہ سننا تھا کہ بلبل ہزار داستاں نے اپنی شاخ نشیمن سے تڑپ کے پرواز کیا۔ اڑنے میں پر جو کھلے تو دیکھا کہ ان پر سنہرے حرفوں سے "اردوئے معلی" لکھا ہوا تھا۔ اتنے میں میری آنکھ بھی کھل گئی نہ وہ باغ تھا، نہ نسیم، نہ حالی نہ وہ بلبل ہزار داستان لیکن جو کچھ دیکھا احباب کی نذر ہے۔

ہاں اس خواب کا سماں انیس مرحوم کا ایک قطعہ یاد دلاتا ہے:۔

مزا یہ طرفہ کہ مضموں تو دستیاب نہیں — مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو
غلط یہ لفظ، یہ بندش بری، یہ مضموں سست — ہنر عجیب ملا ہے یہ عیب بینوں کو

"ازمغرب۔ن۔چغتائی"[1]

[1] اودھ پنچ جلد بست و ہفتم نمبر ۳۵، ۲۷ اگست ۱۹۰۹ء (اقتباس) یہ مضمون 'مضامین چکبست' میں نہیں ہے۔

Marfat.com

اس طویل مباحثہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ حالی کی شاعری پر کس قسم کے اعتراضات کئے جاتے تھے اور پڑھا لکھا طبقہ بھی ان کی شاعری کو کس نظر سے دیکھتا تھا؟ حالی جس نظریہ سے اردو شاعری کی اصلاح عملی طور پر پیش کر رہے تھے اسے اردو نے معلیٰ کی موت سمجھا جاتا تھا۔ خود اردو معلے کا مولانا حالی پر اعتراض کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ حالی کو اردو تک نہیں آتی تھی۔ اسی لئے ان کو نثر و نظم کے اصول اور قواعد بتائے گئے اپنے ایک اور مضمون میں چکبست نے اردو شاعری کے سلسلے میں مولانا حالی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، ان کی شاعری کی سخت مخالفت کی ہے۔

"اپنے انگریزی داں احباب کی مدد سے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موصوف نے قائم کیا اور جس کے سانچے میں اردو شاعری کو ڈھالنا چاہا وہ اس عیب سے خالی نہ تھا کہ "یہ خیال عالمگیر ہوگیا کہ محض بلند و پاکیزہ خیالات کا برے بھلے الفاظ میں نظم کر لینا معراج شاعری ہے جذبات کی لطافت کا خیال نظر انداز ہوگیا۔ زبان کے نغمے سے کان نا آشنا ہوگئے محض ننگے بوچے خیالات کی تصویریں کاغذ کے صفحوں پر نظر آنے لگیں۔

اس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً

دھبے نے کی ہے اے رفاء مرجا باقی — کپڑے پہ ہے جب تلک وہ دھبا باقی
دھو شوق سے کپڑے کو پہ اتنا نہ رگڑ — دھبا رہے کپڑے پہ، نہ کپڑا باقی

جو خیال ان دو شعروں میں ظاہر کیا گیا ہے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا اصول اصلاح ظاہر کرتا ہے مگر اظہار خیال کا طریقہ شاعرانہ نہیں ہے۔ ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مولانا حالی نے اردو شاعری کی اصلاح میں اپنے اصول اصلاح کو مدنظر نہیں رکھا۔ اردو شاعری کے دامن پر جو داغ اور دھبے تھے انھیں اسی طرح صاف کرنے کی کوشش کی کہ نہ داغ دھبے باقی رہے، نہ دامن کا کپڑا باقی رہا۔ ..... یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ

محض پند و نصائح نظم کرنے کا نام شاعری ہے ..... قدیم اردو شاعروں کے خیالات ایسے نہ ہوں مگر ان کا انداز سخن شاعرانہ ہے۔ ان کی زبان شاعرانہ تاثیر کا ذخیرہ ہے۔ جو مضمون ادا کرتے ہیں ان میں ان کے دل کے جذبات کا پرتو نظر آتا ہے یہی شاعری ہے۔

منشی رحمت اللہ رحمت نے رباعیات حالی کا خوبصورت پاکٹ ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اس پر اودھ پنچ میں یوں تبصرہ کیا گیا۔

لہ مضامین چکبست صفحہ ۲۶۷ - ۲۶۶ - (انڈین پریس الہ آباد ۱۹۵۵ء بحوالہ صبح امید نومبر ۱۹۱۹ء

Marfat.com

"رباعیات حالی لطافت سے خالی اور حضرت رعد کی تعریف خیالی" یہ پرتکلف ایڈیشن دیکھ کے "جب رباعیات کی شاعری پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بعینہ یہی عالم نظر آتا ہے کہ کسی کم سن ہفتاد سالہ بڑھیا کو نئی نویلی دلھن، کا لباس اور زیور پہنا دیا ہے" مذکورہ بالا رباعی کو تختۂ مشق کرکے لکھتے ہیں۔

"جو لوگ مولانا حالی کی شاعری پر ایمان لائے ہوئے ہیں ذرا ایمان سے کہیں کہ جس کی ایک رباعی میں یوں گودڑ لپٹا ہو وہ کس رخ سے نیچہ بند نہیں، شاعر ہے۔ فصاحت ایسی کہ چار مصرعوں میں چار جگہ کپڑوں کا عارضہ موجود ہے۔ رباعی کیا ہے پیرمل کی گودڑ کی ہانڈی یا دھوبی کی لادی ہے ترکیب الفاظ ایسی بانکی کہ باید و شاید خصوصاً رگڑ کا لفظ تیسرے مصرع میں لطافت کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے تلازمہ اور استعارہ ایسا لفیف کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ چرکین کے دیوان سے رباعی نقل کی گئی ہے۔

مولانا حالی بھی اردو شاعری کے ریفارمر ہیں اگر کلام میں یہ طرز متخلل رہا تو جو داغ ان کے نزدیک اردو شاعری کے دامن پر ہے۔ نہ وہ رہے گا نہ دامن رہے گا اور یہ رباعی انھیں کے حال پر صادق آئے گی۔ مگر اردو شاعری ایسے حملوں سے محفوظ ہے وہ زبان حال سے کہہ رہی ہے۔

تو پاک باش برادر مدار از کس باک زندہ جامۂ ناپاک گازراں برسنگ

افسوس تو یہ ہے کہ ایسی رباعیوں کی تعریف میں حضرت رعد کرک کے فرماتے ہیں۔

یہ رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں سے زیادہ کارآمد ہیں۔ چہ خوش چیرا نباشد

اگر دو چار اور ایسے قدرداں پیدا ہو جائیں تو اردو شاعری کے طفیل میں فارسی شاعری بھی درست ہو جائے"

راقم

عدو سے سامری فن دیکھئے اعجاز رقم میرا عصا سوجی کا ہے تنقید حالی میں قلم میرا[1]

حالی نے شاعری پر جو دھبے لگائے تھے اس کی تشریح و تعریف مرزا لاابالی نے ایک مخمس کی ہے۔ اس دھبے کی تعریف میں اٹھارہ بند ہیں اور دنیا جہان کے دھبوں سے اس کو بدنما اور خراب ثابت کیا گیا۔ حالی کے ساتھ داغ کی شاعری کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے۔ مثلاً دو بند پیش ہیں۔

لائے کیا لگتے ہیں رنگین میں داغ کیا خاک نہ لگائے کا عزیز میں داغ

---

[1] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۲۱ - ۲۶ مئی ۱۹۱۰ء ص ۱

کیا عشق نے دیئے تھے دل کو بکن میں داغ — چیچک کے داغ دھوتے ہیں بیٹھے دکن میں داغ

حالی نے شاعری میں وہ دھبہ لگا دیا

مستی نے بخی تو رکھائی ہے منہ کی دھڑی دھڑی — سوسن زباں دراز نہ کھائے پھٹکڑی پھٹکڑی

زنجیر نے بھی قید میں جھیلی کڑی کڑی — روئیں گھٹائیں بھی تو برس کر جھڑی جھڑی

حالی نے شاعری میں وہ دھبہ لگا دیا[1]

زبان و بیان کے اعتراضات کے ساتھ ساتھ حالی کے اصلاحی خیالات کی بھی مخالفت کی گئی جب انھوں نے گداگری کے خلاف یہ رباعی لکھی۔

ایک مرد توانا کو جو سائل پایا — کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا

بولا کہ ہے اس کا ان کی گردن پہ وبال — دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

تو تندرست سائل کو نکال دو، کے عنوان سے اودھ پنچ کے ۲ نومبر ۱۹۰۴ء میں یہ رباعی شائع ہوا۔ رپورٹر نے ایک ذاتی خط پیش کیا ہے۔ اس خط میں حالی کی شاعری اور ان کے خیالات پر اعتراضات کئے گئے ہیں اور یہ ہدایت کی ہے کہ

"یہ رباعی چندہ دینے والوں کو بھیجنی چاہیے، کہ "دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا"

حالی سرسید احمد کے ساتھ محمڈن اورینٹل کالج کے لئے چندہ جمع کرتے رہتے تھے، مولانا نے جو ہدایت یا نصیحت گداگروں اور خیرات کرنے والوں کو کی، وہی ان پر صادق آتی کیونکہ وہ بھی چندہ دینے والوں کی وجہ سے مانگنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ رباعی چندہ دینے والوں کے لئے بے سود تھی۔ رپورٹر اس بات کا اعتراض کرتا ہے کہ

حضرت حالی ایک اچھے خاصے معزز ہیں۔ استاد بھی کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی بندش [illegible] ڈھیلی ڈالی ہے لیکن [illegible] افسوس تو یہ ہے کہ ان کے وعظ کے رخ سے ہمدردی نہیں کر سکتا ..... اس نصیحت کا کچھ فائدہ نہیں اگر نصیحت کر بھی تو یہ رنگ اختیار ہو کہ لوگ سوال ذلت سے رکیں نہ بندگان خدا کے اندرونی حالات کیا معلوم ہیں [illegible] چیز ہے وہ، اور [illegible] چیز ہے گو [illegible] کر اگر [illegible] بولنے شخص ہیں [illegible] دیا کئے ہیں۔ ان کی نیک نیتی میں [illegible] ان رپورٹر صاحب کو تو حالی کی نیک نیتی پر شک نہیں ہوا۔ انداز بیان پر اعتراض ہوا۔

---

[1] اودھ پنچ جلد ۱۹ نمبر ۲۲ ۱۶ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۱

[2] " " نمبر ۸ ۲۵ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱

Marfat.com

اس سے پہلے جب حالی نے گداگری کے خلاف قلم اٹھایا اور وہ مضمون منشی نیاز احمد میرٹھی کے رسالہ خیرات شائع ہوا تو گداگروں کی پوری جماعت نے مقدمہ دائر کر دیا کیونکہ یہ ان کی روزی پر حملہ تھا۔ عدالت میں مولانا حالی طلب کیے گئے اور ان کا بیان بحلف لیا گیا۔ انھوں نے۔

"بیان کیا کہ میں قوم کا لیڈر ہوں منشی نیاز احمد صاحب میرٹھی نے جو رسالہ خیرات کے نام سے جاری کیا ہے اس میں ایک مضمون میرا بھی شامل ہے چنانچہ میں اس کی تائید میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے پر اس قدر لے دے کی ہے کہ بے شمار مرفوع حدیثیں سوال کی مذمت کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں مگر غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے کی مدح یا ذم کہیں صراحت کے ساتھ نہیں فرمائی۔"

اس بیان کے بعد جرح شروع ہوئی۔

وکیل مدعی	مولوی صاحب! یہ تو فرمائیے کہ آپ کو مسلمانوں کی قوم کب سے اپنا لیڈر مانتی ہے؟
مولانا حالی	میں اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوں۔ لوگ مجھے سعدی ہند کہتے ہیں۔ میں نے بہت سی قومی نظمیں تصنیف کی ہیں۔
وکیل مدعی	تو گویا محض شاعر ہونے کی وجہ سے آپ لیڈر شمار کیے جاتے ہیں نہ کہ بحیثیت عالم دینیہ ہونے کے۔"
مولانا حالی	میری توقیر و عزت کا بڑا سبب تو یہی ہے مگر میں دینی مسائل سے بھی پورے طور پر واقف ہوں۔"
وکیل مدعی	آپ نے آج تک جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں ایسی کتنی کتابیں ہیں جو علوم دینیہ پر لکھی گئی ہیں۔
مولانا حالی	میری تصنیفات میں زیادہ تر سوانح عمریاں اور شعر و شاعری کی کتابیں ہیں۔ دینی مسائل میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔"

جرح ختم ہوگئی۔ حالی نے دستخط کر دیئے اور حاکم نے بھی دستخط کر کے تصدیق کر دی۔ اب دوسرے گواہوں کا بیان شروع ہوا۔ ایڈیٹر البشیر اور محمد یعقوب علی بی۔ اے نے اپنے اپنے بیانات دیئے بیانات کے بعد حاکم نے فیصلہ سنا دیا۔

فیصلہ عدالت

"مدعا علیہ اور اس کا طرفدار گروہ سب علم سے ناآشنا ہیں۔ خود مولوی الطاف حسین حالی باوجود مولوی مشہور ہونے کے علم دین سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ ان لوگوں

Marfat.com

ا جو یہ چال چلی ہے وہ محض علی گڑھ کالج کو نیا فنڈ پیدا کرنے کی غرض سے [illegible]
[illegible]

مدعا علیہ مذکور ہمیشہ بقید حیات رہے۔"

راقم وجاہت صدیقی جنجھانوی[1]"

مولانا حالی نے شکوہ ہند لکھا جس میں ہندوستان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد شکایت کی تھی کہ ان نے مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ اس نظم کے کئی جوابات نثر و نظم دونوں میں لکھے گئے جن میں حالی کی زبان دانی اور ہندوستان دشمنی کو واضح کیا گیا حضرت بیان دیہاتی مرحوم نے اس کے جواب میں پانچ بند تحریر فرمایا اس میں حالی کے برخلاف بیان نے ہندوستان کو مظلوم قرار دیا اور براہ راست مسلمانوں کو ان کے برے اعمال کی وجہ سے برا بھلا کہا۔ حالی پر چوٹ (طنز) کرتے ہوئے آخری بند کے چند اشعار سے اس کے لب و لہجہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہم سے حالی کے موالی کیوں نکد ہو گئے — کیا کہیں یہ بھی مسلمانوں کی قسمت ہے
خواہ اعجاز بیاں ہو خواہ حسانی کا فسوں — وہ محل ہے جس کی بنیادی ہو تقویٰ پر
چاہیے آئینہ میں جوہر کو نہ کیجے دیدہ ور — جلوہ گر ہوتا کہاں حکمت اسکندری کی

تھی زباں شعلہ فشاں آئینہ برہم شاں
اتوا الاموال بالثبات" ہے قول رسول

بیان نے اس نظم کا آغاز موثر پیرایہ میں کیا ہے ہندوستان کو ایک ظلم و ستم رسیدہ مظلوم بتایا ہے جس کی گریہ و زاری اور فریاد ہے بیان تڑپ گئے ہیں [illegible] کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

دیکھتا کیا ہوں کہ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی — لوٹتی ہے [illegible] کی طرح [illegible]
کر رہی ہے دم بدم فریاد وہ آشفتہ حال — جل رہی ہے دل میں آگ اور [illegible]
پارہ پارہ ہے بدن اور ٹکڑے ٹکڑے پیرہن — [illegible]
دست و پا پر مارتی ہے چھپر پانی کا بیدرد سے — [illegible]
کوستے ہیں تیغ زن کو زخم منہ کھولے ہوئے — [illegible]
کوئی دارو کوئی درماں نفع کرنے کا نہیں
ضربت تیغ زباں کا زخم ہے سینے کا نہیں

---

[1] ادودہ پنچ جلد بست و ہفتم نمبر ۱۴ - ۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۴ تا ۱۵
[2] مراۃ الشعراء جلد دوم - مولوی محمد یحییٰ تنہا - صفحہ ۱۴۰ - ۱۴۱

Marfat.com

یہ زخم مندمل نہیں ہوا۔ ہندوستان نے کبھی حالی کے نام ایک لمبا چوڑا شکایتی خط لکھ ڈالا۔

"حالی حالی پانی پتی۔ سلامت۔ شیک ہینڈ"

تم نے شکوۂ ہند میں خصوصاً اور اپنی دیگر تصانیف میں عموماً جو میرے سر الزام رکھا ہے کہ میں نے مسلمانوں کو نقصان پہونچایا اور تمہاری قوم مسلمان میری صحبت اور تعلیم میں اپنی خوبو، لب و لہجہ نشست و برخاست، عادات و خصائل بھول گئی اور کل مال و متاع ذاتی اور صفاتی اپنا مجھے دیدیا یہ محض بہتان یا بھولا پن اور بڑھاپے کی نادانی کا وہم ہے ..... نہ میں نے مسلمانوں کو کچھ دیا تھا نہ ان سے کچھ چھین لیا۔ یہ تمہارا محض اتہام ہے ..... پرانے وقت کے مسلمان اب بھی باقی ہیں جو تم اپنے مسدس حالی اور شکوہ ہند میں روتے ہو۔[1]

ہندوستان نے ہی حالی سے صدائے احتجاج نہیں بلند کی بلکہ اسلام نے بھی حالی کو معاف نہیں کیا اور شکوۂ ہند میں انھوں نے جو اسلام کے متعلق خامہ فرسائی کی تھی اسلام نے اس کا جواب سید مہدی علی کے نام لکھا۔ اس نے براہ راست حالی کے نام خط لکھنا اپنی توہین سمجھی۔ اسلام کو شکایت یہ ہے کہ۔

"حالی نے تو کمال ہی کیا۔ ہر جگہ صاف صاف مجھے مفلس، کم مایہ بنایا۔ شکوہ ہند میں آکر میں نے راحت پائی ورنہ بھیک مانگتا تھا (دیکھو شکوہ ہند کے کل بند) ذرا حالی سے تم ایمان سے پوچھو کہ مسلمان کب ایسے مفلس تھے۔ پیدا ہوئے تو عرب کے سرداروں اور تاجروں اور امیر و کبیر کی گود میں رہے۔ جوان ہوئے تو عرب اور عجم کے بادشاہ بنے۔ بین روم غور، غزنی، اسپین، فرانس کی سلطنتوں میں جھنڈا شان و شوکت کا لہرایا۔ ہندوستان آئے تو اسی حشم و خدم سے سلطان مفلس کب تھے جو حالی نے لکھا ہے۔

"رہتے قانع اپنی محنت اور مزدوری سے خوش"

حالی کی یہ تہمت محض فضول ہے۔"[2]

ایک صاحب مسخر الدولہ بہادر تھے جنھوں نے محبت بھرے خطوط، مہدی علی خاں، حالی ڈاکٹر نذیر احمد صاحبان کو لکھے تھے۔ مولانا حالی کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔

"آپ نے جو قومی مرثیہ خوانی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ چند پنجابی احباب ملک الشعراء جانیں یا گورنمنٹ کوئی خطاب دیدے یا دراصل دلی جوش قومی محبت کا ہے اگر دلی جوش قومی محبت کا ہے تو بتلائیے کہ آپ نے اپنے مسدس اور شکوہ ہند میں جو مسلمانوں کے کل اوصاف

---

[1] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۳۰ - ۲۰ جولائی ۱۹۰۴ء صـ۲

[2] " " " " " نمبر ۳۱ ۴ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۵-۶-۷

Marfat.com

کو بُرا خیال کیا ہے اور از علما تا شعرا، از امرا تا حکما سب کو لتاڑا ہے۔ اس کا کیا نتیجہ ہے؟ لیکن پھر حافظ نے آپ کے غلطی کھائی۔ ہر موقع پر آپ نے انھیں باتوں کی خود تعریف کی ہے جس طرح ہجو شعرا کی آپ نے کی ہے۔ اسی طرح حیدر آبادیوں کی آپ نے خوشامد کی ہے۔ ایمان سے کہئے کیا حیدر آباد تجھ کو انھیں الفاظ تعریفی کا مستحق ہے جو سر آسمان جاہ کی آپ نے خوشامدانہ تعریف میں کئے ہیں۔ مسدس کے مضامین سے ملایئے اور اپنی سچی تعریف کی تصدیق کیجئے۔

حکما کو آپ نے لتاڑا ہے پھر وہی محمود خاں کے مرثیہ میں ان کی نباضی کی تعریف کی ہے۔

بہرحال آپ کا قال، حال سے جدا ہے ایک جگہ جو آپ طعنہ کر رہے ہیں خود ہی وہ کرتے ہیں[1]۔

قول و فعل کا یہ تضاد کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔ حالی کو "دروغ گو را حافظہ نباشد" اور تخریب پسند، ثابت کیا گیا۔ ان کے نظریۂ شاعری کی خوب خوب مخالفت کی گئی۔ ان کی شاعری پر جا و بے جا اعتراضات کئے گئے لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود، حالی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اور زیادہ تن دہی، ہمت، صبر اور استقلال کے ساتھ، اپنی سادگی، زبان، اپنے اسلوب بیان اور اپنی حقیقت آمیز شاعری، پر عمل کرتے رہے

تم تو حالی یہی طرز اپنی نباہے جاؤ — طرز شعر فصحا و بلغا را ہمہ ہست

وہ اس راز سے بخوبی واقف تھے۔

اگے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں اچھی کیسی — پر فتح جب پائی ہے آخر بالکی سے

اس لئے وہ ان مخالفتوں سے کبھی نہ گھبرائے نہ خوف ہوئے کبھی نہ ترک کئے

رکتے نہیں ذرا بھی ہرگز فنا کی رو سے — جو کہ کے کچھ ارادے ہیں کر رہا

ان کو جو کام کا ہے جن کو سمجھتا حالی — آسان نہیں کچھ ان کا ڈالنا مٹانا

ان کا مسلک ہی خاموش کام کرنا تھا اور وہ یہ کہہ کر کہ جو کچھ کہنا تھا سب کی باتیں سنیں اور وہ نہ ماریں ایک خاموشی ہزار بلاؤں کو ٹالتی ہے، یہ ان کا ایمان تھا

حق بولوں کے اہل شر سے الجھا نہ کبھی — بگڑے کل سے اور آج کد

گو چاہتے ہو لب پہ ہے اہل خلاف

لیکن ایک حلقہ ایسا بھی تھا جو ان کے طرز سے [illegible]

متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کے [illegible] سے زیادہ لوگ اس کو پڑھیں سمجھیں اور عمل کریں [illegible]

---

[1] اوراق زرّیں جلد بہت، ہشتم نمبر ۱۲ [illegible]

[2] طبیاتِ نظم حالی حصہ اول صفحہ ۵:

Marfat.com

[illegible] ہفتہ وار [illegible] پیسہ اخبار لاہور کچھ عرصہ [illegible] حالی کی ہر نظم شائع کرتا
اس پر [illegible] رائے لکھتا، دوسرے اخبار کو موقع نہ دیتا کہ اس [illegible] سے پہلے نظم پر تبصرہ کریں اور اس
کے محاسن [illegible] کریں۔ مخالفین اس کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ وہ بھی نکتہ چینی کا جواب
دیتے تھے کوئی نظم کتنی ہی زیادہ مفید کیوں نہ ہو۔ مخالفین اس پر اعتراضات ضرور کرتے تھے
اکثر اعتراضات سچے اور درست بھی ہوتے تھے لیکن اعتراضات کے پس پردہ جو جذبات اور خیالات
کام کر رہے تھے وہ یقیناً سچے نہیں تھے۔ مولانا حالی تو اپنا دردِ دل بیان کرتے۔ ملت کی اصلاح
[illegible] اور یہ حضرات ان کے کلام میں صرف زبان کا لطف، روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی
[illegible] کوئی غلطی کرتے اور جب [illegible] ہوتی تو مخالفین پر اثر ہوتی۔

حالی مجلس ترقی ادب اور انجمن پنجاب کے جلسوں میں کوئی نہ کوئی نظم ضرور پڑھتے تھے۔ اس
جس میں زیادہ تر قوم کو تعلیم کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ محنت و حرفت سیکھنے پر زور دیتے تھے
زمانہ کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں سے باخبر کرتے تھے۔ شاندار ماضی بیان کر کے موجودہ
[illegible] دلاتے تھے۔ ہماری معاشرت کا تعلق ہے وہ ان کی نظمیں سن کر متاثر ہوتے اور
[illegible] کی کوشش کرتے لیکن [illegible] میں سرشار اور زمانے سے بے خبر، پدرم
سلطان بود کے نشہ میں مست، [illegible] معاشرت کے عادی۔ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے اور ہر نظم
پر اعتراضات کا ڈھیر لگا دیتے تھے۔ چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کے اجلاس میں جب مولانا حالی نے
مسدس "مدوجزر اسلام" پڑھی اور اس کو سن کر سامعین اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ "جو کچھ جس کے پاس
تھا وہ کالج فنڈ میں دے دیا"، جب یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو مخالفین سے ضبط نہ ہو سکا
فوراً ایک نقاد نے حضرت اودھ پنچ کی بارگاہ میں اعتراض نامہ پیش کر دیا۔

"۲۸ دسمبر کی [illegible] کو پیسہ اخبار لاہور میں مولانا حالی پانی پتی کی اس جدید نظم کا ایک حصہ
چھپا ہے جو مولانا نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دہلی کے جلسے میں پڑھی تھی۔ یہ اخبار
[illegible] ایک بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ وہ انصاف فرمائیں
[illegible] اپنے خیال میں شعراء کا سرتاج قرار دیئے ہوئے ہے اور
[illegible] حضرت [illegible] کے ساتھ درج فرمایا ہے۔ ... وہ [illegible] کیا
[illegible] شاعر کے [illegible] اور نظر بازوں کی طرح پریشان ہو۔ اس کے
[illegible] کے [illegible] جلسوں میں [illegible] کا [illegible] مقالات

کیا معنی ہیں آپ غور کے ساتھ ملاحظہ کیجیے مگر انصاف شرط ہے۔

پہلے بند کا پہلا شعر

دوستو انکار اگر تم کو بداہت کا نہیں عالم اسباب ہے دنیا اسے جانو یقیں

یقین کا استعمال فصحا کے نزدیک ماننے کے ساتھ بہتر ہے اگر مولانا مانو یقین فرما دیتے تو فصاحت کا لطف بڑھ جاتا اور اگر جانو ہی کا لفظ پسند تھا تو یوں کہنا بہتر تھا۔

عالم اسباب ہے دنیا یہ جانو بالیقیں

جبکہ الہ آباد پوسٹ آفس انڈیا نے اس شعر پر یوں اصلاح دی۔

"واہ حضرت پہلی ہی بسم اللہ غلط دبداہت کا نہیں، یہ کہاں کا محاورہ ہے۔

بول چال میں تو بداہت سے نہیں بولتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض دفعہ شعر لاتے ہیں تو کیا کہے، سے شعر موزوں نہ ہوگا۔ جانو یقین نہیں بولتے۔ مانو یقین ہو سکتا ہے کیونکہ یقین ماننا یقین کرنا بولتے ہیں نہ کہ یقین جاننا اگر آپ مانو کہتے تو کیا نقصان تھا مگر کہتے ہی کیوں؟ آپ تو اردو زبان کو پانی پت کی سنگلاخ زمین پر دوڑانا چاہتے ہیں ذرا سنبھلیے اور دلی کی ٹھنڈی پر چھوا کھلائیے۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرع پر اعتراض ہوا مصرع تھا

"کاہ سے لے کوہ تک ذرہ سے لے تا آفتاب"

"بندش کس قدر سست ہے اور بجائے کر فرمانے کے صرف تے۔ یہ ترکیب تو مولانا حالی سے استاد کے لئے کچھ موزوں نہیں۔ کاش یوں فرماتے[۲]

کاہ سے لے کر کوہ اور ذرہ سے تا مہر منیر[۳]

تیسرے شعر کا دوسرا مصرع ہے "دشت میں پتا کھڑکتا تم اگر دیکھو کہیں"

اعتراض ہوا کہ "اس میں شک نہیں کہ مولانا حالی سے صدہا دھوکا ہوا کھڑکنے کو لوگ سنتے دیکھتے نہیں۔ کھڑک آواز ہے۔ حرکت نہیں ہے۔ یوں فرمانا چاہئے تھا

"دشت میں پتا کھڑکتا تم اگر سن لو کہیں"

یا یوں فرماتے "دشت میں پتے کو ہلتا تم اگر دیکھو کہیں"

اسی تیسرے شعر کے دوسرے مصرع پر الہ آباد پوسٹ نے اعتراض کیا مصرع یہ ہے۔

"اک مرتب سلسلہ پانے کے ہیں اسباب کو"

"اسباب کو مرتب کرنے کے لئے مصرع میں پانے سے کون زمانہ پایا جاتا ہے؟ اور

---

[۲] تا سے اردو پنچ جلد بستہ ۱۹۰۵ء صفحہ نمبر ۲۹۰ جنوری ۱۹۰۵ء

[۳] ہمدرد دہلی نمبر ۱۶-۲۱ اپریل ۱۹۰۵ء

Marfat.com

دوسرے مصرع میں دیکھو کہیں سے، کون زمانہ پایا جاتا ہے۔ دیکھو کے بعد اور کہیں کے قبل دگے، ہونا چاہیئے تھا تب جاکر عبارت کا سلسلہ نثر اور نظم میں ٹھیک ہوتا ورنہ پہلے مصرع کو بدل کر یوں کہیئے۔

"اک مرتب سلسلہ سمجھو وہاں اسباب کا"

دو استادوں نے مل کر حالی کے دو مصرعوں کو ٹھیک کیا۔ اب شعر یوں ہو گیا۔

اک مرتب سلسلہ سمجھو وہاں اسباب کا دشت میں پتا کھڑکتا تم اگر سن لو کہیں

چوتھے شعر کے دوسرے مصرع "یوں خدا چاہے تو لے اسباب کی تاثیر چھین" پر اعتراض ہوا کہ "اسباب کی تاثیر نہیں ہے بلکہ تاثیر کے اسباب ہیں۔ اگر حضرت مولانا ہی کا مصرع رہے تو ترکیب کی کایا پلٹ سے مطلب بھی ہاتھ سے جاتا ہے" اصلاح دی گئی

"یوں خدا چاہے تو لے تاثیر کے اسباب چھین"

چھٹا شعر ہے "

ہے یہ وہ قانون محکم مالک مختار کا جو کہ سطح خاک سے نافذ ہے تا چرخ بریں

اعتراض ہوا کہ "قانون الٰہی کے نفاذ کی حیثیت الخ بیان فرما دی۔ یہ گونہ بے ادبی ہے۔ چرخ بریں سے تا سطح خاک نافذ کہنا چاہیئے تھا۔ اور مصرع یوں ہونا چاہیئے تھا۔

"جو کہ اوج چرخ سے نافذ ہے تا سطح زمیں"

آٹھواں شعر ہے :-

جان لیتے ہیں کہ آمد ہے خزاں کی باغ میں شیشوں سے خود بخود جب پتیاں جھڑنے لگیں

اعتراض۔ پہلے مصرع میں "جان لیتے ہیں، دوسرے مصرع میں 'جب پتیاں جھڑنے لگیں" بول چال میں کہ یوں ہے۔

جب پتیاں جھڑنے لگیں تب جان لیا یوں جب پتیاں جھڑنے لگتی ہیں تب جان لیتے ہیں۔ بہرحال مصرع اولیٰ کو یوں ہونا چاہیئے۔

ہو گیا ظاہر کہ آمد ہے خزاں کی باغ میں" یا یوں

کھل گیا ان پر کہ آمد ہے خزاں کی باغ میں" یا یوں

عقل یہ سمجھی کہ آمد ہے خزاں کی باغ میں" یا یوں

فہم یہ سمجھا کہ آمد ہے خزاں کی باغ میں" غرض کسی نہ کسی ترکیب نقص کو رفع کرنا چاہیئے[1]"

---

[1] اودھ پنچ جلد بست دہفتہ نمبر ۵ ۲۹ جنوری ۱۹۰۲ء ص ۱

ی شعر کے پہلے مصرع پر لارڈ ریٹ پوئیٹ نے یہ اعتراض کیا
"پتیاں جھڑنا تو گنوار بھی کم بولتے ہیں۔ حضرت! پتیاں گرنا کہیئے۔ خزاں کی آمد اس وقت کہی جاتی ہے جب پتیاں زرد ہونے لگتی ہیں"[1]

لواں شعر ہے۔

بسکہ ہے ان کو قوانین الٰہی پر دو ثوق — اسلئے رکھتے ہیں اپنی پیش گوئی کا یقیں

عتراض: کیوں جناب؟ یہ پیش گوئی، چہ معنی دارد" پیش بندی یا پیشین گوئی، سنتے تھے۔ یہ پیش گوئی، نئی گڑھت ہے۔ اے جان اللہ! انھیں لفظوں سے تو اردو ترقی کرے گی اور پانی پت کو اپنا خوصدار قرار دے گی"[2]

جبکہ نظر باز صاحب نے کہا "پیش گوئی" ترکیب غلط ہے۔ محاورہ کی بول چال میں جو محاورہ ہے وہ پیشینگوئی ہے۔ اس سبب سے "پیش گوئی" کا لفظ دیکھنے میں آنکھوں کو کھٹکتا ہے اور سننے میں کانوں کو گراں معلوم ہوتا ہے اس تخصیص سے غرض طبیعت کا ظاہر کرنا کیا ضرور تھا۔ مولانا یوں فرما دیتے۔

"اسلئے رکھتے ہیں پیشین گویوں کا وہ یقیں"[3]

دوسرے بند کا دوسرا شعر (یہ شعر کلیات نظر حالی میں نہ تھا)

ہیں رواں تیرا ک سب دریا کی رو کے ساتھ ساتھ — اور انھیں کو ہے کہ دیں دریا کی روانی بہا

اعتراض۔ تیراک سے شناور مراد ہے یا غلط ہے۔ شناور تیرنے والا یا پیراک ہے۔ تیرنا ہے چاقو اور چھری وغیرہ تیز کرنے کو یا بغیر ہڈیوں کے گوشت وغیرہ تیرنے کو[4]

دوسرے صاحب نے گرفت کی "دریا کی روانی سنی تھی۔ رو کی آپ نے ایک ہی کہی۔ دوسرے دریا کی روانی بہانا، یہ کہاں کا محاورہ ہے۔ الٹی گنگا بہانا سنا تھا اور رو بہانا بھی شب لیلۃ القدر کی رات سے کم نہیں"[5]

چوتھا شعر (کلیات میں پانچواں)۔

اور اپنے اپنے جوہر ہیں جہاں دکھلا رہے — یہ دکھاتے پھرتے ہیں جو ہر اسلاف کے جا بجا

مطلب یہ کہ اور لوگ جہاں اپنے اپنے جوہر دکھاتے ہیں وہاں یہ (مسلمان) سلف کے جوہر دکھاتے ہیں مگر بجائے 'وہاں' کے 'جا بجا' حضرت مولانا نے فرمایا ہے۔ اگر ردیف کے واسطے 'جا بجا' ہی کی ضرورت تھی تو مصرع اولیٰ میں 'جہاں' کا لفظ فرمانا کیا ضرور تھا بلکہ یوں ہونا چاہیئے تھا

---

[1] تا [3] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۱۶ - ۱۸ اپریل ۱۹۰۶ء ص ۱

[4] تا [5] " " " " نمبر ۵ ۲۹ جنوری ۱۹۰۴ء ص ۱

Marfat.com

اور اپنے اپنے جوہر ہیں دکھاتے ہر طرف

بارھویں شعر کے دوسرے مصرع "تاکہ غیروں کی نہ کل کرنی پڑے کچھ التجا" پر اعتراض ہوا کہ 'غیروں کی التجا کرنا' کہاں کا محاورہ ہے 'غیروں سے التجا کرنا' بولتے ہیں[1]

بند سوم۔ دسواں شعر:۔

اب رہے عالم سو اتنا سوختاں کو کہاں دین کا پھر کون ہے دنیا میں وہ انجمیں اگر

سوختا کون لفظ، فارسی اور اردو لغات میں تو کہیں نظر نہیں پڑا۔ عبرانی یا پانی پتی زبان کا ہو تو ہو۔ عام طور پر سُبیا، بولتے ہیں۔ دوسرے اس شعر سے لے کر بند کے آخری شعر تک علماء سے آپ نے طنزاً کلام کیا ہے؟

بند سوم، ٹیپ کا شعر:۔

ہیں یہی گر قوم کے ساتھ آج بے پروائیاں تو یہ کون و نا فلاکت ہیں کھڑی رسوائیاں

اعتراض۔ ذرا شعر کی عبارت نثر میں تو لائیے اور پھر دیکھئے[2] ہیں کھڑی، چاہیئے کہ ہوں گی کا روی پہلے مصرع سے زمانہ حال پایا جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں کل کا لفظ زمانہ آئندہ بتا رہا ہے۔ پھر زمانہ آئندہ کے لیے ہیں گی، ہونا چاہیئے[3]

بند چہارم دوسرا شعر:۔

ہو رہی ہے عرصۂ آفاق میں قوموں کی دوڑ بڑھ گئے پیادوں سے پیادے اور سواروں سے سوار

اعتراض پیادہ میں 'یا' مشترک ہے مخلوط الیا نہیں" یہ بڑا تعجب ہے کہ حضرت مولانا ایسی فاش غلط ترکیب کا استعمال فرمائیں۔ بجائے لفظ پیادہ کے اگر اردو کا دوسرا مستعمل لفظ پیدل، وہ فرماتے تو بہتر ہوتا[4]

چھٹا شعر:۔

حق ہے غالب کیا کہ کچلے اور دے مغلوب کو ہے یہی مغلوب ہونے کا مآل انجام کار

اعتراض یہ حق مولانا نے ایسا قائم فرمایا ہے کہ گویا حضرت نے سیاست بدن کی کوئی نئی فلاسفی قرار دی ہے جس کا یہ ایک کلیہ بیان فرمایا ہے۔ کاش اس شعر کو یوں فرماتے تو غالب اور مغلوب دونوں کا فعل قدرتی اسباب سے متعلق ہو جاتا یعنی

مورد جو پاؤں تلے آئے وہ پسیا ہو ضرور ہے یہی مغلوب ہونے کا مآل انجام کار[5]

انھوں نے تو مآل انجام کار کی ترکیب صحیح سمجھی لیکن دوسرے صاحب نے اسی ترکیب کو مہمل

---

[1] ادھر پچ جلد بست و ہفتم نمبر ۵ - ۲۹، جنوری ۱۹۰۳ء ص ۱

[2] تا[3] " " " ہشتم نمبر ۱۶ - ۲۱، اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴، ۶، ۸، ۱۱

اور بے معنی کہا وہ لکھتے ہیں
"آل کار" یا انجام کار بولتے ہیں نہ کہ "آل انجام کار"۔

نواں شعر:-

تو ہم کا درجے سے گر جانا ہے اپنے وہ گناہ مرتکب جس کا نہیں بچتا سزا سے زینہار

اعتراض۔ اس شعر میں ایک بہت باریک نقص ہے جو بہ معمولی نگاہ شاید مشکل سے پکڑ سکے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "درجے سے گر جانا" یہ فعل اتفاقی دلالت کرتا ہے۔ اور فعل اتفاقی گناہ کی حد میں نہیں آتا سہو، خطا، دھوکا، مجبوری، اس کے لئے ہزار تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ البتہ گر! گناہ کی تعریف میں داخل ہو سکتا ہے۔ بہرحال پہلے مصرع کو یوں ہونا چاہئے۔

"اپنے درجے سے گرانا آپ کو ہے وہ گناہ"

دسواں شعر:-

یاد رکھو دستور سنت ہے یہ اللہ کی جو نہ بدلی ہے نہ بدلے گی الی یوم القرار

اعتراض۔ سنت رسول، سنت نبی سنی تھی۔ نہ کہ اللہ میاں کی سنت۔ معلوم نہیں مولانا حالی کے اور کس نے آج تک یہ سنت نہیں دیکھی ہوگی۔

پانچواں بند۔ پہلا شعر۔

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یار سب کھو کے کر جو ہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر

اعتراض۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ایک ترکیب غلط ہے۔ بول چال میں یوں ہے۔

"اس کو سر کر بیٹھے" اور وہ سر ہو چکی" تو اب یوں ہونا چاہئے۔

"جو ہم درپیش تھی وہ ہو چکی گویا کہ سر"

اسی بند کے چوتھے اور چھٹے شعر میں "جگنو کے چمکا" خدا جانے کہاں کی بولی ہے۔ فصیحا تو اس لفظ کو نہیں جانتے۔ ہم آخری شعر کی داد دیتے ہیں۔ مولانا نے بہت خوب فرمایا ہے۔ یہ کچھ مذاق نہیں ہے۔ بلکہ ہم سچے دل سے داد دیتے ہیں۔ وہ شعر یہ ہے۔

کون سا پستی کا درجہ اب رہا ہے اس کے بعد یہ وہ پستی ہے کہ بس تحت الثریٰ ہے جس کا نام

چھٹا بند۔ پانچواں شعر دوسرا مصرع۔

"ہوں ہزاروں گڈریاں اور ایک ہو چرواہا سب"

۱؎ اودھ پنچ جلد بست و ہفتم نمبر ۱۔ ۱۲ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۱

۲؎ " " " " نمبر ۱۶ ۲۱ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۱-۲

۳؎ " " " " نمبر ۱۰۔ ۵ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱

Marfat.com

اعتراض ۔ کندھا، غلط ہے یہ لفظ 'کاندھا' ہے[1]۔
کاندھا، کاٹ کر صحت میں کندھا بنایا گیا ہے۔ سبحان اللہ واژگوں دماغ کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے[2]۔"

ساتواں بند۔ پہلا شعر

وہ گئے دن جبکہ تھے مختار مطلق حکمراں قسمتوں کے قبضۂ قدرت میں تھی ان کی عناں

اعتراض پہلے مصرعہ سے اسی کا دوسرا مصرعہ الگ کٹ گیا۔ اس کے علاوہ شعر میں یہ بے ربطی اور بھی ہے کہ پہلے مصرعہ میں مختار مطلق بنایا اور دوسرے مصرعہ میں مجبور محض ظاہر کیا کہ ان کی عنان قسمتوں کے ہاتھ میں دی۔ اس شعر کو یوں ہونا چاہیئے۔

وہ گئے دن جبکہ تھے مختار مطلق حکمراں تھی انھیں کے قبضۂ قدرت میں خلقت کی عناں[3]

پانچواں شعر:۔

قوم اپنی حد سے آگے کوئی بڑھ سکتی نہ تھی پیش قدمی سے رکے کب کے ٹکڑے تھے کاروان

اعتراض پہلے مصرعہ میں کوئی لفظ قوم سے اس قدر فاصلے پر ہے کہ مصرع بگڑ گیا ہے۔ غلط نہیں ہے مگر مولانا کی فصاحت کے ضرور خلاف ہے۔

غرض "ایسے نقائص سے تمام نظم بھری پڑی ہے اور نظم کی یہ صورت ہو رہی ہے کہ جیسے اناڑی درزی کا سیا ہوا کپڑا۔ کاش اسی مصرع کو یوں فرما دیتے

"بڑھ نہیں سکتی تھی اپنی حد سے آگے کوئی قوم"[4]

نواں شعر (کلیات میں بارھواں)

سلطنت نے سب کو دے رکھے ہیں حق ڈنڈی کی تول
وزن میں پلڑا نہیں کوئی سبک کوئی گراں

اعتراض ۔ یہ پلڑا کیا چیز ہے؟ صحاء پلہ بولتے ہیں، پلڑا نہیں بولتے۔ مثلاً

نظروں میں شفاعت کے عمل تول لیے ہیں پلے پہ ہے امت کے ترازوئے محمدؐ، یا
ہم پلہ جو ذلت خم یک چشم ہو غالب ہے کہ یہ حشر تضرع کم ہو

---

[1] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۷ ۔ ۱۲ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱
[2] " " " نمبر ۱۶ ۲۱ر اپریل ۱۹۰۳ء " ۱-۲
[3] " " " نمبر ۱۰ ۵ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱
کلیات مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں دوسرا مصرع یوں ہے "قسمتوں کے قبضۂ قدرت میں تھی ان کے عناں"
[4] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۱۰ ۵ر مارچ ۱۹۰۳ء ص ۱

Marfat.com

ہزاروں ہی مثالیں ایسی موجود ہیں۔ مولانا اردو بے چاری پر رحم فرمائیں۔ یہ غریب زبان یوں ہی واجب الرحم ہو رہی ہے۔ حضرت مولانا کیوں اسے داغی فرما رہے ہیں۔

گیارھواں شعر (کلیات میں چودھواں)۔

ورنہ لینے ہوں گے اپنے دعوی سب واپس تمھیں اور بھلائی ہوگی سب دل سے بُروں کی داستاں

اعتراض۔ اگر مولانا دعوی کو مقدم اور اپنے کو مؤخر فرما دیتے تو نقص نکل جاتا۔

دعوی عربی کا لفظ ہے جو اصلی حالت میں اردو میں بھی باقی ہے اور اس لفظ کی (ے) کو دبانا کوئی نقص نہیں ہے اگر مصرع یوں فرمایا جاتا۔

"ورنہ لینے ہوں گے دعوے اپنے سب واپس تمھیں" تو فصیح رہتا اس کے بعد نظر بانہ اختتامیہ کلمات لکھتے ہیں۔

"یہ صرف سات بندوں کی نظم ہے جس کے نقائص میں نے مختصراً لکھا دیئے۔ اگر یہی نظم فصاحت کے ساتھ کہی جائے تو کایا پلٹ ہو جائے۔ اور ایک نئی نظم کہنا پڑے۔ اب ایڈیٹر صاحب اخبار ہی انصاف فرمائیں[1]"

اسی نظم کے متعلق (لا ریٹ پوئٹ آف انڈیا) نے تبصرہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ حالی کی شاعری پر بھی تنقید کر ڈالی۔

"ہمارے مولوی حالی شاعری کے بجز خار ہیں۔ بجائے اس کے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے ماہر فن، تیراک سمجھے جائیں بالکل مرفوع القلم ہیں..... مجھ کو زیادہ تر افسوس اس بات کا ہے کہ یہ شخص جس نے ترقی قوم کا بیڑا اٹھایا ہو اور قوم کی حالت خواہ وہ بری ہو یا بھلی، اپنی دردناک آواز میں سنا رہا ہو۔ اس نے خود کوئی ترقی اس وقت تک نہیں کی اور اگر کی تو معکوس، جس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ

شاعری کی جس قدر مشق کی جائے اسی قدر ترقی کرتی ہے۔ فصاحت بلاغت دن بدن بڑھتی مشق سے بڑھتی جاتی ہے۔ مگر مولانا کے ہاں برعکس۔ مسدس جس کو مولوی خلیل الرحمن کو ہم شہرت تک پہونچا دیا۔ دیوان سے ہزار ہا درجہ اچھا ہے بلکہ دیوان کے دیکھتے مسدس کے متعلق کہا جائے کہ وہ مولانا کی تصنیف نہیں ہے تو بے جا نہ ہوگا اور جس قدر نظمیں لکھی ہیں دیوان سے بھی زیادہ خراب حالت میں نظر آتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ نظمیں بیش بہا موتیوں کا ہار ہوں۔ بدنما اور خراب پوست کی لڑیاں نظر آتی ہیں۔ کیا ایسی نظمیں زبان کو ترقی دیں گی؟ اور زبان کا ایک اعلیٰ جوہر مانی جائیں گی؟ اور اسی بول چال اور فصاحت پر کہا جاتا ہے کہ اردو زبان پنجاب میں پہونچ گئی۔

---

[1] اودھ پنچ جلد ۱۱ ہفتہ نمبر ۱۰ ۵ مارچ ۱۹۰۳ء ص۱۔

اور پنجابی اسے ترقی دے رہے ہیں۔ سستی کتابیں، کم قیمت اور بکثرت رسالے زبان اردو میں نکال دینا اور بات ہے اور زبان کی ترقی فصیح و بلیغ انداز میں دینا جس کو خاص و عام قبول کر لیں اور بات ہے؟

زبان ترقی اسی وقت کرے گی جب اس میں فصیح و بلیغ الفاظ، تازہ محاورے نئی بندشیں، جس کو عام طور پر سب قبول کر لیں، اضافہ کی جائیں اور اس کی اشاعت بھی بکثرت ہو ورنہ یوں سرسری طور پر کتابوں کے ترجمے (جن میں بے معنی اور خلاف محاورہ الفاظ ہوں) شائع کر دینے سے زبان ترقی نہیں کر سکتی بلکہ اس کے غلط محاورے، بے معنی لفظوں کا استعمال، اس کے قدیم جوہر بلاغت و فصاحت کو مٹا کر اس کو بالکل تبدیل کر دیں گے اور آئندہ چل کر وہ زبان نہ اردو ہی رہے گی اور نہ وہ کہ جو آج کل پنجابی یا مولانا حالی بولتے ہیں بلکہ ایک نئی زبان ہو جائے گی جس کے سمجھنے کے لئے وہی کتابیں کار آمد ہوں گی جو اس زمانہ کی تصنیف ہوں نہ کہ اس زمانے کے انداز ناول و رسالہ۔"

(راقم لا ریٹ یونٹ آف انڈیا ہے۔[1]

ان اعتراضات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ معترضین ایک ایک لفظ کی گرفت کرتے تھے اور وہ حالی کی شاعری کو "اردو شاعری کی حسین پیشانی پر، بدنما داغ اور کلنگ کا ٹیکہ سمجھتے تھے۔ غلط اور متروک الفاظ کا استعمال، لفظی و معنوی تعقید، غیر شاعرانہ ترکیب، کو خواہ ان کے اندر کیسے ہی بلند اور اعلیٰ خیالات ادا کئے گئے ہوں، وہ شاعری کے لئے زہر ہلاہل سمجھتے تھے۔ حالی کو وہ اہل زبان نہیں مانتے تھے پنجاب اور پانی پت کی زبان کو لکھنؤ اور دہلی کی زبان سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے؟ اس لئے زبان کے متعلق ان کی کوششیں مضر اور بیکار تھیں۔ جن کی مخالفت کرنا اہل زبان کے لئے نہایت ضروری تھا تاکہ اردو زبان ختم نہ ہونے پائے۔ مخالفت کی سب سے بڑی وجہ، سرسید کی تحریک سے، حالی کی وابستگی تھی۔

مولانا حالی سرسید کی تحریک کے سرگرم رکن اور روح رواں تھے اس لئے جب کبھی وہ کسی جلسہ میں کوئی نظم پڑھتے اعتراضات کئے جاتے۔ اکثر اعتراضات محض تفریحاً کئے جاتے لیکن ان سے مخالفین نیچری کانفرنس کے حوصلے اور بڑھ جاتے۔ یہ مخالفت، مقدمہ شعر و شاعری، شائع ہونے سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ مولانا حالی نے مسلمانوں کی تعلیم، پر ایک ترکیب بند ۱۸۸۹ء میں لکھا۔ یہ نظم "سرمود گزٹ" میں شائع ہوئی اور حضرت شیدا دہلوی کی نظر سے گزری۔ انھوں نے اس نظم کی تخمیس کر کے، شائع ہونے کے لئے اودھ پنچ میں بھیجی۔ پوری نظم میں حالی پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔

---

[1] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۱۶ - ۲۱ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۱ - ۲

Marfat.com

چند بند پیش ہیں۔

یہ حالی کیا تمھیں پھسلا رہا ہے اے مسلمانو — کہ پڑھ کر مرثیہ رلوا رہا ہے اے مسلمانو
خوشامد کے ترانے گا رہا ہے اے مسلمانو — "زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز سچا نو

لکھے ہیں بندوں کے تو کیا ہی تھرکے تم نے — خوشامد میں مگر گھولے ہیں پیالے زہر کے تم نے
حدیث اک نقل کی ملا جو دیکھے شہر کے تم نے — "سنے ہوں گر نہ معنی لا تسبوا الدھر کے تم نے
تو اب سن لو کہ ہوں میں شانِ ربانی مجھے مانو

بڑی درکار ہے شہرت کے پھیلانے میں عیاری — اگر کالج نہ ہو چندہ کا کر دو مدرسہ جاری
رکھو دو چار انگریزوں سے بھی تھوڑی سہت یاری — گیا دور حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چار سو علم و ہنر کی ہے عملداری

کلام شیخ سعدی آج پارینہ ہوا دفتر — کہ روزی ملتی ہے ناداں کو دانائوں سے بھی بڑھ کر
کہ یوں فرما رہے ہیں آج کل اک ہند کے ہوفر — گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر بازار کا زیور
ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر

سرسید احمد خاں کی عزت افزائی ملاحظہ ہو؟

نہ پایا ایسا بڈھا سارا عالم چھان ڈالا ہے — کہ جو تحریر میں تقریر میں سب سے نرالا ہے
عقائد تک میں اس نے اک نیا فیشن نکالا ہے — "ہمارے شکر ہے اے قوم احساں اس کا بالا ہے
کہ جس نے قوم کی تعلیم کا یاں ڈول ڈالا ہے"

مسلمانوں کے بچوں کے دلوں کو کفر سے بھرنا — نہ ہرگز ایسے کاموں میں خدا کے قہر سے ڈرنا
ابھی جلدی ہے کیا جیتے رہو لازم نہیں مرنا — "کیا کو تو نے سب کچھ پر بہت کچھ ہے ابھی کرنا
ہے آخر قوم کی تعلیم یا نہ کا نوالا ہے"

تیری گو عمر پوری ہو چکی مرنے کے دن آئے — اگرچہ قبر میں بیٹھا ہوا ہے پاؤں لٹکائے
ٹھیٹر میں مگر پھر کون آکر کودنہ مٹکائے — "عزیزوں کو خدا وہ نا مبارک دن نہ دکھلائے
کہ سایہ تیری ہمدردی کا ان کے سر سے اٹھ جائے"

راقم، شیدا دہلوی۔ اس قسم بشرط فرصت باقی

ا۔ کلیات میں علم و عمل ہے۔ کلیات نظم حالی صفحہ ۵۸۰ ب۔ مولانا حالی سے مراد ہے۔
ج۔ کلیات میں "انسان کا زیور" ہے۔ صفحہ ۵۹
لہ اودھ پنچ جلد چہاردہم نمبر ۷۔ ۱۲ فروری ۱۸۹۰ء صفحہ ۳۰-۵-۶

Marfat.com

نیچرل شاعری کے متعلق مسٹر شوخ ظریف جون پوری نے خوب شوخی اور ظرافت دکھائی ہے۔

"واقعی ایشیائی شاعری بہت بری، ہر ہر مصرعہ میں مبالغہ، ایک ایک شعر میں تشبیہ و استعارہ جب دیکھئے وہی خیالی معشوق کا قصہ۔ اسی کے جور و ستم کا شکوہ ..... (برخلاف اس کے) نیچرل شاعری کو دیکھئے۔ اصلی مضامین، سچے واقعات، نیچرل جذبات سے بھری ہوئی پھر فصیح و بلیغ اتنی کہ ایک ایک حرف خود زبان قلم کا بوسہ لیتا ہے۔ آسان اس قدر کہ دس پندرہ منٹ میں دس پندرہ شعر بلکہ مطلع جھک مارئیے نا تو یہ کہہ ڈالئے۔

مشتے نمونہ از خروارے"

مرد ہیں باہر کے دھندے اور کمانے کے لئے — عورتیں سینے پرونے اور پکانے کے لئے
بال بچے ہیں رات دن غل مچانے کے لئے — بیوی صاحب بچے جننے اور کھانے کے لئے
ایشیائی پوئٹری ہے سر پھرانے کے لئے
نیچرل مضمون یہ ہیں دل بھانے کے لئے

راقم۔ مسٹر شوخ ظریف جون پوری"[1]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو نیچری کانفرنس، کا مبارک نام دیا گیا اور اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے گئے مولانا حالی کی ہر نظم پر نظر التفات رکھی گئی۔ ادھر مولانا نے نظم پڑھی، اُدھر اودھ پنچ میں اس کی شان میں "نذرانۂ عقیدت" پیش کیا گیا۔ مولانا حالی نے "قوم کا متوسط طبقہ" کے عنوان سے ایک ترکیب بند لکھا۔ اس نظم کا جس طرح مذاق اڑایا گیا، اس کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

"تیسرے دن مولوی حالی نے نظم پڑھی۔ اب کی مرتبہ مضمون بالکل نرالا تھا۔ آغاز یہ تھا۔

شکر اس نعمت کا یارب کر سکے کیونکر زباں — تو نے رکھا ہم کو یہاں فقر و غنا کے درمیاں

اور اس کے بعد سے تو وہ بگٹٹ بھاگے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ خلاصہ یہ کہ

بھوکے ہوئے تو تو نے نان و نانخورش بخشے پر نہ اتنے جو مودہ دا حشا پر گراں گذرے
پیاسے ہوئے تو آب شیریں و خنک بخشا پر نہ ایسا جس کی صراحی یا اردں سے نہاں ہو۔

(سبحان اللہ کیا نیا مضمون ہے) باقی "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"، کون اپنا سر پھرائے۔ ہاں چلتے چلاتے آخری بند ضرور سن لیجئے۔ کانفرنس کی تعریف پر ارشاد ہوتا ہے۔

کر رہا ہے قوم کی سرکل کو یہ مجمع وسیع — جزر سے ازدل ہو مدجس کا وہ رجعت ہے یہی

---

[1] اودھ پنچ جلد چاردہم نمبر ۲۷۔ ۱۷ جولائی ۱۸۹۰ء صـ۵

Marfat.com

قوم کی سرکل بڑھانے کی تو یہ تدبیر تھی کہ عقد بیوگان کی کوشش کی جاتی ..... پھر آپ دیکھتے کہ قوم کا سرکل کیسا بڑھتا؟ مگر افسوس کانفرنس اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔

باقی عند التلافی

رائم

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفتصد ہفتاد قالب دیدہ ام

بقلم نیازمند قدیم (نیچری کانفرنس[1])

نیچری کانفرنس اور نیچریت کے اثر سے

"قدیم شاعرانہ نازک خیالی، خوش بیانی، خوبی بندش، شستہ الفاظ کے مقابلہ میں

چشمان تو زیبا بروانند دندان تو جملہ درد ہانند

والی گل افشانی جس کا نام نیچرل شاعری ہے، گوئے سبقت لئے جاتی ہے[2]"

(تفتہ جگر بین پوری)

یہی نہیں بلکہ

جہاں کو علم ہے، روشن ہے یہ زمانے پر کہ سب علوم سکھاتا ہے اصل میں نیچر[3]"

اسی لئے اسرح (اکبر حسین) کے نزدیک

حالی نے سکت پائی: مہدی نے مفر دیکھا چھٹا ہر دل سے آخر وعظ آزادی کا فوارا[4]

اس "وعظ آزاری" کے فوارہ سے وحشت پہلے ہی ہو چکی تھی، نیچرل شاعری کی مقبولیت افادیت اور کشش سے، مدعیان علم و ادب، سہمے جا رہے تھے۔ جب کبھی مولانا حالی یا ان کے رفقاء کے ادبی کارناموں کو کوئی سراہتا تو یہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے۔ سر شیخ عبدالقادر نے انگریزی میں ایک کتاب جدید ادب پر لکھی اس میں)

"آنکھ بند کر کے ایسی دریا دلی سے تعریف کی کہ تو کریوں کانٹے ہٹا کر پھول پھول چن لئے ان میں سے ایک سرشار دوسرے شاعر غزالیاں حالی طولعمرہ ہیں۔ حالی صاحب کو

---

[1] اودھ پنچ جلد شانزدہم نمبر ۵۔ ۴ فروری ۱۸۹۲ء صفحہ ۵

[2] " " بست و سوم نمبر ۱۱۔ ۱۶ مارچ ۹۹ء صفحہ ۲-۳

[3] " " دہشتم نمبر ۲۳۔ ۲۱ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱

[4] " " " " " " " صفحہ ۵-۶

Marfat.com

لکھا ہے کہ (خود بدولت مادرزاد شاعر ہیں۔ مادرزاد شاعر ہونے کی نسبت نہ میں نے کہیں تحقیقات کی نہ اس کا حال مجھے معلوم ہے۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ حالی صاحب نہ تو زبان داں ہیں اور نہ شاعر مانے جاتے ہیں ان کا کلام جزو کل شاعری کے عیوب سے بھرا ہوتا ہے اور زباندانی کے کف دست میدان میں وہ وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ بعض اوقات تو بیچارے بھرا کے اوندھے منہ گر ہی پڑتے ہیں جیسا کہ اشعار ذیل سے معلوم ہوگا۔

اس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہیں رکھا قدم — اور کٹ کر پاؤں سے اک اک کی بیڑی گر پڑی

جوہیں کے ساتھ اور بالکل خلاف محاورہ ہے

ابھی اور سنئے :۔

بلی کہ جو بے عقل ہے دم دیتا ہے گھر پر — آتی نہ کبھی محبت تجھ کو گھر سے نہیں آیا

حالی نے کہا انس ہے چیز اور، وفا اور — بلی نے مزا کھیل کا دو غاکے نہیں پایا

اعتراض۔ اول مصرع میں (یہ دوسرا مصرع ہے) آیا اور چوتھے مصرع میں پایا بلی کے واسطے حالی کی زباندانی کو چلا چلا کے داد دے رہا ہے۔

(ایک اور شعر)۔

ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ — دیکھئے برسے گا یا برسائے گا

اعتراض۔ برق سے پانی برستا ہی ہے۔ جتنے زباندان ہیں سب برق کو برسنے کے واسطے باندھتے ہیں۔ واہ!

قانون ہے بنایا یہ ان مقننوں نے — عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا

مانے ہوئے مفعول کے ساتھ؟ مانے ہوئے کیا خوب؟ غرضکہ کہاں تک لکھا جائے یہ دیوان غلطیوں سے بھرا پڑا ہے۔ جو شخص ایک شعر بھی صحیح نہیں کر سکتا ہو۔ اس کو ساتویں آسمان پر چڑھا دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ دلی تو کچھ خراد ہے نہیں کہ جتنے تو پانی پت میں لیا اور دلی پہنچتے ہی ترش ترشا کر شاعر ہو گئے"

راقم۔ م۔ ب۔ علیہ الرحمۃ

تنقید بن کر کسی صاحب نے حالی کی غزل پر طنزیہ پیرایہ میں تبصرہ فرمایا۔

"مولانا حالی بالقابہ، جن کی صاف گوئی اور معاملہ بندی کے سامنے اس وقت زبان ہلانا کیسا کوئی قلم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک زمانہ ان کی معشوقانہ نظم پر رقیبانہ اور حاسدانہ نظریں صرف کر رہا ہے۔ اس موقع پر میں جناب ممدوح کو مبارکباد دیتا

لہ اودھ پنچ جلد بست و سوم نمبر ۱۱۔ ۱۶ مارچ ۱۸۹۹ء صفحہ ۵-۶

Marfat.com

ہوں کہ آپ محسود ہیں حاسد نہیں ہیں۔ حاسدوں کے قول کا کیا اعتبار؟ آج باریک بیان فرنگ کی موشگافانِ نظر بہ اس کو ڈھونڈھ رہی ہیں اور نہیں پاتیں ... اپنی اور اپنی تقریر کے ثبوت میں اس غزل کو پیش کر کے مدعیانِ نظم سے داد طلب ہوں۔

وصفِ چمنِ قفس میں سنو عندلیب سے — پوچھو وطن کی قدر مسافر غریب سے

اعتراض۔ غربت کے قافیہ میں ایک غرابت ہے یعنی غربت کے دو بھی معنی مسافر کے ہیں تو یہاں تاکیداً یہ لفظ لایا گیا ہے کہ مسافر یا بھیک مانگنے والا مسافر جس کو سفر و حضر دونوں برابر ہو۔

نالوں سے ایک دم نہ فراغت مگر قرار — کیا کر گئی ہے تجھ کو مسیحا عندلیب سے

اعتراض۔ مصرعِ اولیٰ میں ایک لفظ اور غضب کا رکھ دیا ہے جس کو کہنا چاہیئے اب حریفانِ سخن اس کو ڈھونڈھ رہے ہیں اور نہ پائیں تو قیامت ہے۔ بلاغت شعر میں اس لفظ سے جو ترقی ہو گئی ہے اس سے قطع نظر کر کے یاد دہانی سے کہتا ہوں کہ کسی استاد کے ... یہ بات آئی ہے اور آئے گی کہ دو بلبل کو مسیحا سے تعبیر کرے۔

اب دل سے دور رنگِ خیالِ نشاطِ عمر — آوازہ رہ گیا ہے یہ کوئی فریب سے

اعتراض۔ آب کے لفظ سے شعر کو شروع کر کے مضمون کو کس قدر بلیغ کر دیا ہے۔ واقعی کمالِ سخن کے یہی معنی ہیں کہ شعر میں جو الفاظ استعمال کیے جائیں ان میں سے ایک بھی بیکار یا سست نہ ہو پھر نشاطِ عمر کی ترکیب کو دیکھیے کہ کس قدر سادہ اور رواں ہے۔ یہاں بعض ناواقف کہیں گے کہ عمر کا لفظ ہی مضمون ہے، جہاں کہیں ہو تو ایک لفظ شعر میں ہے۔ دوسرے مصرعہ کی بھی غرابت مضمون ضرورتاً ... یعنی دوسرے تو سب ہی ... یہاں قریب ہی سے

[illegible]

سبحان اللہ! ایہام ... ضمن میں دو ... ثابت ہو ... ثابت کیا ہے۔ لہٰذا ... بیت ہدایت اللغہ کا مزا آتا ہے۔ ... دو بلبل کو مسیحا سے تعبیر کرے۔

دونوں بہ ہمہ درد دل کو مرہم داں میں یا جیوں — یا مر رہے ہے بول صلاح نہ پوچھیں طبیب سے

اس شعر کا ایک ... لے کر ... کہ کس بانکے اور ... لفظ سے شعر کو شروع کیا ہے۔ میرے جیا میں (دونوں) کی شان و شوکت پر محاسدین کی آنکھیں

لہ یہ شعر کلیاتِ نظم حالی میں ... صفحہ ۱۳۹

شادی ہو ایک کی (دو) ... صفحہ ۴۸ ... دنیا کا بھی میر شادی و غم ... ہے

Marfat.com

کھلی ہی رہ جائیں۔ اسی طرح مصرع ثانی کا ابتدائی لفظ یعنی پانڈے بھی دوں کے کلاہ کلاہ ہے یوں از راہ تعصب داد نہ دیجئے وہ دوسری بات ہے۔ مگر ان الفاظ کی نزاکت بھی اس سے کم نہیں ہے اور پھر اس پر بے ساختگی نے تو جادو بیانی کا خاتمہ ہی کر دیا ایک لطف تو دیکھئے لین دین کیا نباہا ہے اوپر کے مصرع میں دوں اور نیچے کے مصرع میں لوں، اسی کا نام صنعت تضاد ہے۔

فاقہ میں تم کو دیکھ کے جاتی ہے بھوک بھاگ ۔۔۔ پہنچا ہے نسخہ آپ کو یہ کس طبیب سے

حضرات! حاسدین۔ ذرا تو انصاف کیجئے کسی شاعر نے آج تک معشوق کو فاقہ کش باندھا ہے پھر اگر یہ جدت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ آخر مضمون آفرینی اور کسے کہتے ہیں، وہی مضمون مضمون ہے جس کی طرف کسی کا دماغ آج تک نہ پہنچا ہو۔ ادائے فاقہ کشی آج تک کسی نے نہیں باندھی ہے۔ اس میں ایک مضمون معشوق کی نزاکت کا بھی نکلتا ہے کیونکہ ظاہر ہے جو فاقہ کش ہوگا وہ لاغر ضرور ہوگا۔ اور جو لاغر ہوگا وہ یقینی نازک ہوگا۔ ممکن ہے حاسدین اس کو نحیف و ضعیف کہیں مگر ہمارا تو نازک کہنے ہی سے مطلب ہے۔ یہ تو اپنی اپنی خوش فکری ہے۔ ساتھ ہی اس کے اس مصرع میں یہ بھی وصف ہے کہ چاہو اس مضمون کو اپنی جانب لا کر لو یعنی تم نہیں بلکہ میں فاقہ کش ہوں جب فاقہ کشی کی حالت میں تم کو دیکھتا ہوں تو تمہاری صورت نہ یا ایسی سیاہیانہ ہے کہ دیوا شتہا کو بھی بھگا دیتی ہے یا ایسی دافع تمدغ معدہ ہے کہ جس کے دیدار سے آسودگی معدہ ہو جاتی ہے..... مضمون کے علاوہ لطافت لفظی کی جانب توجہ کیجئے، بھوک بھاگ کے اجتماع کو ملاحظہ فرمائیے۔ یوں ہم نہیں مانتے معترضین اسی ٹھاٹھ کا کوئی شعر اساتذہ کا ہمیں دکھائیں تو ہم ان کے اعتراض کو اعتراض سمجھیں گے۔ ورنہ یوں تو قبلہ ہم نہیں مانیں گے۔ سب آپ کے نارسائی خیال کا قصور ہے۔

کہتا ہوں دیکھتا ہوں جسے خوار و بے وقار ۔۔۔ ہے کوئی خاندان نجیب و شریف سے[1]

دیکھئے دو فعلوں کا یکے بعد دیگرے ساتھ ہی اجتماع یعنی دیدن ہماں بود و گفتن ہماں، پھر خوار و بے وقار کا مترادف بھی خالی از لطف نہیں ہے جس کے جواب کے لئے مصرعہ ثانی میں بھی دو لفظ شریف و نجیب انھیں کی ٹکر کے موجود ہیں صنعت شاعری کے بعد شوخی فکر کو دیکھئے عربی مثل "ظن المومنین خیرا" کا کیسا پورا ترجمہ کیا ہے، جسے، کی تعمیم پوری مفسر اس عربی فقرے کی ہے یعنی کسے باشد، کوئی فلک زدہ نداف بھی اگر جوتیاں چٹخا تا چلا جاتا ہو تو ہمارا حسن ظن بوجہ پاس مسلمانی اسے شریف و نجیب ہی سمجھے گا۔

اب جس کے جی میں آئے بھرے شاعری کا دم ۔۔۔ میدان آج کل ہے یہ خالی نصیب سے

بچھانہ میں ایک شاعر تھے ان کی معاملہ بندی اور وصاف گوئی کا ایک عالم قائل تھا۔ ساتھ ہی

[1] اودھ پنچ میں اسی طرح چھپا۔ کلیات میں "شریف و نجیب" ہے۔ ص ۱۳۹

Marfat.com

اس کے کم گو بہت تھے ان کی زبان و بیان کا رنگ حضرت حالی سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے.... مرزا قسمت یار خاں ان کا نام تھا اور نصیب تخلص فرماتے تھے مولانا نے اسی کا ارشاد مصرع ثانی میں بذریعہ قافیہ فرمایا ہے۔ وہ غزل کبھی ہدیۂ ناظرین ہوگی۔

نعم البدل ہے داغ کا حالی کلام داغ ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

کیا خوب تضمین فرمائی ہے گو متقدمین میں سے کوئی شاعر کہہ گیا ہے۔

مثل مسیح ہے کہ ذکر عیش نصف عیش ہوتا ہے زباں پر ذکر سے بوسہ کی لذت آ ہی جاتی ہے

مگر ہمارے مولانا کے مقطع میں اندر سے حسن الفاظ اس سے بڑھ کر کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے۔ ناظرین خود ہی بوسہ اور وصل کی نفاست احتظاظ میں تفریق کر لیں۔ ہائے افسوس انہاں ہیں نکتہ شناسان قدیم! جوان لطافتور، اور غزلوں کی داد دیں اور تو نہیں ان کی روح جدید یہ اشعار سن کر ضرور وجد کرتی ہوں گی کیا خوب ہوتا اگر اساتذۂ قدیم کے فاتحوں میں یہ اشعار بھی مولانا کے شریک کر دیئے جاتے مگر حیف آج کل ہندی دھرم شاستری ان کو نہیں مانتے تو بھلا کوڑہ مغز کا ہے کو یہ جانتا رکھنے لگے۔

اب حضرت نصیب شاگرد جناب خواجہ انعام حسین صاحب خالی سونی پتی کی غزل کے چند اشعار کا انتخاب پیش کر کے یہ تلخ نوائی ختم کرتا ہوں۔

کل کل پکارتی ہے گزرگاہ عمر ہائے غافل کشی کا ہاں نہ پونچھو غریب سے

خالد نے یہ کہا ہے آب بقا دیکھ عمر و ہیں مرد نہ مرے کبھی کچھ غریب سے

سہ شکر فیض حضرت خالی ہے یہ بیاں حالی کا لطف شعر ہے ہم نصیب سے

حالی کے شاگرد چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے اپنی تحریر [illegible]

استاد تو اندر شاگرد تمام کند" کے عنوان سے ناظر کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

سن لی ہے وقت نزع کی حالی سے داستاں [illegible]

"اس شعر میں شاعر نے اپنی تمام قابلیت، سرخ مدد دی ہے۔ رفتہ کی آواز دار ہے" ان غلطیوں سے اپنے کلام کو پاک صاف رکھنے کے لئے حالی کو بہت سے ہدایت کی تھی کہ

قطعہ، مسدس، مثنوی، خمسہ، رباعی، یا غزل جو چیز لکھو اس طرح لکھو متصل ہو

جاہل میں پیدا ہو، عالم میں ہو جس عمل اخلاق کی املا [illegible]

تہذیب کا یہ نکتہ ہے اس سے تو سیکھ لے

لہ اودھ پنچ جلد بست و ہفتم نمبر ۴ یکم اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ [illegible]

۲ہ " " نمبر [illegible] ۱۹۰۳ء صفحہ [illegible]

پس شاعری کی شاخ کمزور کا لہے حکمت کی جڑ — حکمت کی چوکھٹ برسنچ دن رات پیشانی رگڑ
زد میں تو ہی تفتیش کی جز علم وحشی ہو پکڑ — ترکیب میں رہ علم کی جہل مرکب میں نہ پڑ

تہذیب کا یہ دور ہے اس میں ہے تو سر شارہ[1]

لیکن جب مولانا عالی نہیں رہے تو مولانا حالی کے ظاہر میں شاگرد مگر باطن میں استاد نے ان کی جگہ لے لی، انھوں نے نئی شاعری کی دھن میں ایک نظم لکھی دوسرے شعرا بھی ان کے کلام کی تقلید میں نظمیں لکھنے لگے کسی نے تحقیق کی کسی نے تضمین کسی نے اپنا یہ مسلک بنایا کہ وہ قافیہ اور ردیف سے کام نہ رکھ کر شاعری کو بدنام کرے۔

قافیہ اور ردیف سے کیا کام — کرتے ہیں شاعری کو بدنام[2]

مسدس کے طرز پر آشوب دکن، مسدس نادولن، مجموعہ دیگر سے نیست، لفظ ہزار آفتاب اسلام، تیرہی کانفرنس، شام اودھ وغیرہ مسدس لکھے گئے۔ رباعیات کا جواب رباعیات میں دیا گیا، قطعات کا قطعات میں، نظم غیر مقفیٰ کی چاشنی سے بھی کلام کو محروم نہیں رکھا گیا، مثلاً

چلو بھائیو ہاں چلو بھائیو — اگر قوم کا کچھ بھی ہے تم کو پیار
نہیں سانس لیتا وہ انسان ہے — کہ ہاں جس کی اس حرف مردہ پہ قرار
کہ سنتے ہی جس قوم کا اپنی نام — نہیں اس کا دل اس کے اندر جلا
اگر آدمی کوئی ایسا ملے — تو کہدو یہی اس سے بصد لے دھنگ
دلیل اس کا جینا ہے اور بعد مرگ — نہ گائے گا اس کو ڈفالی کوئی

راقم مولانا عالی کا ظاہر میں شاگرد مگر باطن میں استاد۔[3]

یہ آخر شاگرد بھی استاد تھے، کوئی صاحب 'بے چینک' کے افیونی، تھے انھوں نے اپنی طبیعت کی جولانی دہشت بھرا افیونی، لکھ کر دکھائی جس میں ہندوستانی عورتوں کا حال زار بیان کیا اور تعلیم نسواں کا غلغلہ اڑایا ہے اور آزادی نسواں، کی وضاحت کرکے اتمام حجت کیا ہے۔

جنھیں علم کی آج حاصل ہے دولت — کوئی رکھی باتیں کوئی بی تھیسیلت
جہالت سے مردوں کے جن کو ہے نفرت — مقابل ہوا شوہر جن کا جہالت

---

[1] اودھ پنچ جلد ۱ چہار دہم نمبر ۱۳ - ۳ رجب ۱۳۱۹ھ صفحہ ۹
[2] " " " ہشتم نمبر ۱۴ - ۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱
[3] " " " ہفتدہم نمبر ۱۴ - ۶ اپریل ۱۹۱۳ء صفحہ ۵
[4] " " " ہشتم نمبر ۱۴ - ۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء لکھنؤ میں یہ شعر بہت مشہور تھا
(سید کی سرگزشت کو حالی سے پوچھئے — غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے)

Marfat.com

نیکیوں عورتوں کو پڑھائیں لکھائیں
جنھیں اس کا نقصان ہو ہم کو بتائیں

ذرا دیکھئے آپ کیا ہے زمانہ — وہ ہمشیر ہے جو کہ ہے ویل خانہ
ہے نادان شاعر کا کیا آنا جانا — پڑے ہے نرینہ کا در سنانہ
ستم گر ہمیں دانگریزوں کے نالہ
زار نالیں یا وہ فرانسیسکے نالہ

راقم راحم ناظم بنگلہ کا افیونی

ان منے کی ٹھمک کو ایک [illegible]
اس [illegible]
[illegible]
ہوسکتا ہے [illegible]
کہ بند کھولنے والوں کے بچے کچھ [illegible]
ہے تیوب سے بھرا اور حنات سے خالی

اشوب اول تفضیح الرجال آشوب دوم اخراج الملد آشوب سوم ضرب الحبیب
آشوب چہارم خسولۃ نیا آشوب پنجم بخیر استہار آشوب ششم افواہ جھوٹہ دلاکزیا

عنوانات بالا سے آشوب کی پوری روداد کا پتہ لگانے کے لئے کافی ہیں۔ پند نیز کا بیان ہے۔

ستارہ ہر مرحلہ ہو کوئی کرے کیا — [illegible]
بنایا ہے سونی کو گرا کر [illegible]

پرانی محبت کے رشتے وہ ٹوٹے — [illegible]
انکی کسد و منگوادوں [illegible]

[illegible]

سہارا تعاجن سے [illegible]
انکلتے [illegible]

[illegible]

Marfat.com

نہ دلدار باقی ۔ نہ دلخواہ باقی
فقط اب تو ہے نام اللہ باقی

راقم ۔ منطقہ حازہ ، بقلم ۔ بلبل کے چمن میں نغمہ خوانی چھوڑی ۔[1]

حالی نے فلسفۂ ترقی ۱۹۰۳ء میں لکھی جس میں ملت اسلامیہ کو غیرت دلائی تھی کہ وہ ترقی کی راہوں سے کتنی دور ہو گئی ہے ؟ قومیں ترقی کیسے کر سکتی ہیں ؟ وقت کا مطالبہ اور تقاضا کیا ہے ؟ اور مسلمان کیا کر رہے ہیں ؟ اس اعلیٰ درجہ کی فلسفیانہ نظم کا جواب لکھا گیا اور اس کا جس انداز سے مذاق اڑایا گیا ہے اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے ۔ مولانا حالی کے یہ مذاق اہل علم مخالفین میں ایک صاحب مرزا لاابالی تھے جنہوں نے "جائزۂ استاد حالی" یا تقلید کلام حالی کے عنوان سے ۵۸ ۔ اشعار پر مشتمل ایک ترکیب بند یا پنج بند کا لکھا ۔ یہ پوری نظم عامیانہ مذاق پست ذہنیت ، شوقیانہ جذبات ، رکاکت و عریانیت ، تمسخر و استہزا کی ترجمان ہے ۔ اس نظم میں مولانا کی تعلیمی و اصلاحی تحریکوں کا دل کھول کر مذاق اڑایا گیا ہے ۔ اکثر جگہ حالی ہی کے اصل مصرع رکھے ہیں لیکن خیالات بدل دیئے ہیں ۔ غرض نظم کا ڈھانچہ الفاظ کے ردوبدل سے تیار کیا گیا ہے ۔ صرف چند اشعار سے ہی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے گا ۔

مولانا حالی نے لکھا تھا ۔

اے عزیزو ! تم بھی ہو آخر بنی نوع بشر — کچھ ہے کیا نوع بشر میں تم سے بھی بے بہر

مرزا لاابالی نے پہلا مصرع بدل دیا "اے ذلیلو ! احمقو ! نکمو ! بدو ۔ برے تر" دوسرا مصرع حالی ہی کا رکھا مولانا حالی کا تیسرا شعر تھا ۔

رفتہ رفتہ یہ خبر ناتواں پہنچائے وہاں — طائر وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر

لاابالی صاحب کی فکر رسا نے اس کو قبول نہیں کیا ۔ اصلاح دی یا دوسرے مصرع پر گرہ لگائی ۔

گندہ بھی ، الو بھی تو کوشش سے پہنچ جاتے ہیں وہاں — طائر وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر

یہ شعر بھی قابل داد ہے ۔

کہتے ہیں سورج پہ ہو گی جبکہ چمگادڑ کو فتح — ہو گی پانی پت کے میداں میں قیامت جلوہ گر

حالی نے لکھا تھا کہ

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی — غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

لاابالی صاحب نے لکھا ۔ صرف چند الفاظ کے بدلنے سے معنی کیا سے کیا ہو گئے ؟

تم گدھوں کو یہ کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی — چغدوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

اس بند میں ۱۲ ۔ شعر ہیں ، میں نے صرف چار ہی پر اکتفا کی ۔

---

[1] اودھ پنچ جلد ہفتدہم نمبر ۴ ۔ ۲۶ جنوری ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۰۱ ۔

Marfat.com

دوسرے بند میں حالی نے مغربی روشنی کی آمد آمد کا ذکر کر کے اس کے نتائج اور اثرات سے باخبر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ

بے ترقی کے نہ جینا ہے دشوار آج کل　　وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

نیز زمانہ بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ

"یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہِ عدم"

مگر مرزا الا ابالی نے اس بند میں مغربی تہذیب کی دلکشیوں، عشوہ طرازیوں، شوخیوں اور کفر سامانیوں کا ذکر دل کھول کر کیا ہے۔

کر رہی ہیں کچھ مہذب لیڈیاں بھی تاک جھانک　　تار برقی پر نگاہوں کی مے جاری و ملکہ

وہ مسیں یا لیڈیاں، وہ نازنیں　　جن پہ ہم نے بھی لٹا دی عشقیہ طرز سخن

گویا مولانا حالی نے اپنی "عشقیہ شاعری" کو "بستانِ مغرب" پر قربان کر دیا

ان اشعار کی داد دینے کے لئے حوصلہ کہاں سے لایا جائے؟

اے مسیحا کچھ جانتی ہو، ہے یہ پردہ چیز کیا　　اس پہ کر لینا قناعت مل گیا جیسا نہ ہم

گو کہ بدشکلوں کے حق میں ہے یہ پردہ کیمیا　　پر حسینوں کے تو حق میں ہے یہی اکسیر سم

کانیاں، یا اندھیاں، یا لنگڑیاں، یا لولیاں　　جن کو عشرت کی تمنا ہے نہ کچھ حرماں کا غم

جس طرح موری کا کیڑا خوش ہے اپنے حال میں　　گذرے جو حالت اسی میں ان کا کٹتا ہے جنم

تیسرے بند میں حالی نے ہمدردی قوم کو سیاسی اور ترقی کی کلید ثابت کیا ہے اور مرزا الا ابالی فرماتے ہیں کہ

غیرتِ شرم و حیا ہو قوم میں لونڈی و جہاں　　واں ترقی کے لئے سب کوششیں ہیں رائگاں

یہ وہ کشتی ہے کہ جس کو یاد آئے کچھ نہ راس　　ہاں تھپیڑوں ہی میں ہو اک اس کا پھولے بادباں

سوکھی ساکھی خشک رو ہو مردہ دل وہ قوم کیا　　ایسے زندوں پر ہیں مردہ قبر میں خندہ زناں

بہ کشیں تہذیب کی ہیں کوٹ شیر کی لذتیں　　ابتدا آشنائی آخر شیر کی بی میسنا

مولانا حالی نے چوتھے بند میں اہل اسلام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

ان سے کہہ دو جو ہے مسلمانی کا جن کو ادعا　　قوم کی خدمت میں ہے پوشیدہ بھید اسلام کا

مرزا الا ابالی کی فکر جمیل نے حیوانوں کو مخاطب کیا۔

ان سے کہہ دو جنہیں حیوانیت کا ادعا　　بوم کی خدمت میں ہے پوشیدہ بھید انجام کا

کر رہا ہے پیری و مذہب کی تصدیق خوب　　جوش یہ جوش حماقت جہل یہ جہل عصا

ہے اسی حب وطن کا اس کے یہ سارا ظہور　　ہند میں ہوں آج میں الو کی دم اک فاختا

حالی نے آخری بند میں ترقی و تنزل پر فلسفیانہ بحث کرکے اس کو قانون قدرت ثابت کیا ہے۔

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں — خود تنزل میں ہے مضمر چشمہ ترقی کا نہاں
اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو — تم کو نخوت نے کیا ہے دولت و عزت سے رائگاں
مت کرو شکوہ مشیت کا خدا ظالم نہیں — بلکہ ظالم ہیں تمہاری اپنی بداعمالیاں
ہے یہ قانون الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں — گو جگہ سے اپنی ٹل جائیں زمین و آسماں

مرزا الأبالی نے اس بند میں "بانو" حسن کی ترقی و تنزل کا تجربہ بیان کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس توبہ شکن فرقے کی ہر ہر رگ سے واقف تھے اور ان کی خصوصی اصطلاحات کو بخوبی جانتے تھے۔ اس کے بعد مشرب اور مغرب پرستوں کی خبر لی ہے۔

کیا ہے ترقی اور تنزل کا بیاں — کچھ گمان میں ہے مضمر چشمہ ترقی کا نہاں
تھرو ایوان ہوں یا کہ تخم کدو ہے ہو — عقل کے بندے ہوتے ہیں ہر جا یہ خزاں
ہوا کے بگولہ اور بیرے ان کے اب نام ہیں — لادے پھرتے ہیں مزدل پہ یہ نفلی ڈگریاں
ہے یہ قانون الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں — گو کہ ٹل بھی جائیں یہ اللہ میاں کی گھوڑیاں[1]

(بقلم مرزا الأبالی الہ آبادی روڈ بمبئی)

اللہ میاں کی ان گھوڑیوں کی تشریح عجیب ہے۔ ہر ایک میں ایسی ایسی خوبیاں ہیں جن کی تعریف نہیں کی جا سکتی جیسے "گھوڑی نمبر ۱۔ اس کا نام عربی تعلیم ہے۔ اس گھوڑی کو انگریزی کارگیر نے بنایا ہے[2]"

انگریزی کارگیر کی حکمت نے الفاظ کے معنوں میں الٹ پلٹ کر دی۔ عربی پڑھائی گئی لیکن اس کے پڑھنے والوں کے خدا اور رسول بدل گئے۔ کہ انگلستان کی دوسری تیار کی گئی جس میں "زمانہ کا رنگ دیکھ کر انگریز نے ڈالنا خوب گھوڑی کی مروڑ کر ناک بنایا ہے" یعنی شاعت مقالات پر مشتمل ہے [illegible] مشہور ہیں دونوں نے بانداز کے نمونہ ملاحظہ ہوں۔

ملا دوپیازہ نے "انشاء سرسید" لکھا کیونکر

"جب قاعدے قانون میں آئے دن ترمیم اور تغیر خیالات میں الٹ پلٹ بیان میں اور زبان میں پھیر بدل ہو تو آخر ان سے (الفاظ سے) کون بندوبست استواری ہے کہ "زمین جنبد، زبان جنبد، قطب از جائی جنبد" کہتے ہوئے ایک ہی جگہ کا بوجھ سے بیٹھے رہیں۔ [illegible] شدہ لغت کے چند

---

[1] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۹ - ۲ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱ تا ۳
[2] " " " نمبر ۶ - ۱۱ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۶

Marfat.com

الفاظ کے نئے معنی معلومات میں اضافہ کی خاطر پیش ہیں

الخدا	ہم سے ان سے رسم الفت ہوگئی ۔	مدتیں گزریں زمانہ ہوگیا
ایمبیسر	ڈاکٹر معزول	الینچر پیش نظر
المذہب	آ بیل تو مجھے مار	الشیطان مرشد کامل
التربہ	مینائے مخموراں	العلی گڑھ ۔ تکیۂ امرادآں[1]

ابوالمجد دیسنوی نے اللغات المجددیہ کے نام سے دوسرا النامہ تیار کیا

الاسلام شراب خوری، سود خوری، قمار بازی، عیش بازی، قطع [illegible] پیچ بازی وغیرہ
الاتحاد انعقاد جلسہ، تحصیل پندرہ، پہ کردن دامن و جیب از روپیہ، تر کردن دہن۔
از بلائے تو رمہ۔
الاجلاس اجتماع جانوراں۔ در میان آنہا [illegible] مرگ وفادار
الیکشن والنجاح مثل صحیح [illegible]
الاسپیچ خوش آوازی، خوش کلامی، [illegible]

مولانا حالی نے بھی ایک النامہ لکھا تھا [illegible] ۱۹۰۴ء کے خط میں کیا ہے یہ النامہ فارسی میں ہے۔ غالباً یہ ان دونوں النامہ کے جواب میں ہے کیونکہ یہ دونوں ۱۹۰۴ء میں لکھے گئے تھے۔ اور مولانا نے اس کے دو برس بعد اپنے النامہ کا ذکر کیا۔ اس کا انداز طنزیہ ہے اور اس طرح ہے۔

"[illegible] نے تجھ ایسی کھری چٹکیاں بھری ہیں جو نیم تو لے بغیر نہیں [illegible]

چند نئے معنی الفاظ دیکھئے۔ مذکورہ النامہ سے [illegible]

المذہب	اعلان جنگ	[illegible]
الدین	تقلید آبا و اجداد	[illegible]
العلی گڑھ پارٹی	شہید وفا	[illegible]

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا حالی [illegible] وہ جانتے تھے کہ ان کے کلام کا مذاق [illegible] تقلید جدید

---

[1] اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۱۵۔ ۱۰ اپریل ۱۹۰۴ء ص۱
[2] " " " نمبر ۳۳۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء ص۵
[3] حالی کا ذہنی ارتقاء، ص ۱۹۵ و مکاتیب حالی جلد اول ص ۶۲

Marfat.com

کا دعویٰ کر کے منقبض حالی پر عمل کیا جاتا ہے۔ رباعیات میں ان کے دو مقلد حضرت دمباز اور حضرت ذوالفقار افغان، شاگردان ہوش تھے۔ دونوں نے نئی تعلیم اور نئی تہذیب کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار رباعیات میں کیا ہے۔ لیکن طنز کے تیر چلائے ہیں۔ حضرت دمباز فرماتے ہیں۔

ہشیار اے قوم خواب غفلت کب تک — یہ سستی و کاہلی یہ حسرت کب تک
ہے وقت نیا اٹھو اٹھو بہر خدا — چھوڑو چھوڑو پرانی عادت کب تک

حضرت ذوالفقار افغان فرماتے ہیں۔

تعلیم جدید بک رہا ہوگا تم — سب اگلے طریقے بھول جاؤ گے تم
چوپٹ جو گرے بوٹ ہوں کی آنچ — ٹھوکر بھی اسے کبھی نہ لگا پاؤ گے تم

جاتا ہے پرانا تو بھلا کرنے دو — آیا ہے نیا زمانہ تعلیم کرو
دھبے ہیں کہ ترقی نسواں تھی — بچوں کو نئے اصول تعلیم کرو[1]

ان رباعیات میں سنجیدگی ہے لیکن طنز و ظرافت آمیز رباعیاں بھی لکھی گئیں جن میں مرزا لاابالی اور اکبر الہ آبادی قابل ذکر ہیں۔ مرزا لاابالی صاحب فرماتے ہیں۔

ظلمت ہی میں ان کی ہے سب بود و نمود — آزادی سے ہیں جو یہ چمکتے جگنو
پیچھے کیا تا لیاں بجانے لڑکے — یہ ہیں نئی روشنی کے مسٹر جگنو[2]

اکبر مرحوم نے چندہ بازی پر چوٹ کی۔

چندوں ہی کے سر بکتے ہیں ان کو مضموں — دل شاد ہو قوم اس سے یا ہو محزوں
لڑکے انھیں دیکھ کر مچاتے ہیں دھوم — یہ ہیں نئی روشنی کے چندا ماموں[3]

چندا ماموں کا ذکر آگیا تو اکبر الہ آبادی ہی کی مشہور نظم "پونیہ سلی بل" کا ایک بند پیش ہے۔

پنڈت جی آ جما کے بنارس پہ آ رہے — مرہٹے کے شیخ شہر بھی پولیس پہ آ رہے
حالی غزل کو چھوڑ مسدس پہ آ رہے — ہم فرد تھے سو ہم بھی مخمس پہ آ رہے

الجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں مرا

مرزا مسدس پہ آ رہے اور اس پہ انھیں ناز بھی تھا لیکن مسدس محض پوچ اور لچر تھا۔

---

[1] اودھ پنچ جلد پانزدہم نمبر ۴ - ۲۲ جنوری ۱۸۹۱ء ص۔
[2] " " بست و ہشتم نمبر ۲۲ - ۲ جون ۱۹۰۲ء ص۔
[3] " " " نمبر ۱۷ - ۱۹ مئی ۱۹۰۴ء ص۔

Marfat.com

جس پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہی سے ہونے لگی تھی، مگر میر عبرت نے آئینہ عبرت بنا کر نہ صرف مسدس کی خبر لی بلکہ شبلی، نذیر احمد، وغیرہ کسی کو بھی نہیں چھوڑا خود ستائی کے ساتھ زبان درازی بھی کی ہے۔ یہ نظم اسماعیل میرٹھی کی نظم "کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ" کے انداز پر لکھی گئی ہے۔

حالی کو ناز تھا مسدس پر — لیک دیکھا تو محض پوچ و لچر
لکھ دیا میں نے ان سے بھی بڑھ کر — رہ گئے جس کو دیکھ کے سب ششدر

کیونکہ روح القدس ہے میرے ساتھ

گرچہ استاد ہیں مرے حالی — لیک رکھتا ہوں طبع وہ عالی
باہمہ ضعف و بے پر و بالی — دو ہی پنجوں میں ہے جیت کی یالی

"کیونکہ روح القدس ہے میرے ساتھ"

غرض مولانا حالی کی قادر الکلامی، سخن فہمی، استادی اور سخن سنجی کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ لغزشوں اور غلطیوں کو طشت از بام کیا گیا۔ ان کی زبان دانی، اور ان کے خیالات کا مذاق اڑایا گیا۔ اور بالآخر دہلی پہ دشمنِ بالذات ہنس گئی۔

آئینہ ہے سب حالتِ حالی میرے آگے — چلنے کی نہیں خام خیالی میرے آگے

یہ دعویٰ غلط نہیں تھا جس شخص کی مخالفت میں پچیس تیس سال تک مہم جاری رہی گئی ہو اس کا کون سا حال پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ پھر یہ مہم ملک گیر، منظم اور باقاعدہ جاری تھی اخبار و رسائل ہی کو اگر پیش نظر رکھ کر اس مہم کا مختصر طور پر ہی ذکر کیا جائے تو بھی ایک دفتر درکار ہے یہ تو مخالفت کے طوفانی سمندر کی چند لہریں ہیں اور چونکہ ان طوفانی لہروں کا مرکز بحر الظلمات تھا اس لئے کوشش اس بات کی گئی ہے کہ اور چیخ سے ہر صنف سخن پر شدید اعتراضات کے اقتباسات کو پیش کر دیا جائے تاکہ کلام حالی کی مخالفت واضح ہو جائے۔ اور ہر صنف [illegible] خلاف چڑھائی حالی کے کلام کی پرزہ پرزہ کی۔ ابوالنظار [illegible]

با مذاق و زندہ دل قومی معاونین کو۔ ابوالمساکین مولانا حالی مرحوم کے [illegible] مغربی پیروی، ان کے اصلاحی خیالات، اور سرسید کی تحریک سے ان کی وابستگی پر سخت اختلاف تھا اس لئے حالی کی مخالفت شعر و ادب کے میدان ہی میں نہیں کی گئی بلکہ ہر

۱؎ اودھ پنچ جلد بیست و ششم نمبر ۱۱ - ۲۷ مارچ ۱۹۰۲ء
۲؎ " " " " نمبر ۳۶ - ستمبر ۱۹۰۵ء

Marfat.com

میدان میں کی گئی۔ مختصر طور پر حالی کی مخالفت کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مخالفت کے چند بڑے بڑے سبب یہ تھے۔

۱۔ شعر و شاعری کا نظریہ۔ عشقیہ و خیالی شاعری کی مذمت، شاعری کو افادی پہلوؤں سے پیش کرنے کی کوشش۔

۲۔ مغربی پیروی پر زور۔ نیچرل شاعری کی ترویج و اشاعت۔

۳۔ سرسید کی تحریک سے وابستگی۔ دینی و ملی و قومی اور تعلیمی مسائل میں ہمنوائی۔

۴۔ قدماء کی تقلید سے انحراف۔ شاعری میں اسلاف کی زبان اور ان کے خیالات سے بغاوت

۵۔ قدیم روایات کی اصلاح۔ ادب اور زندگی میں 'مادیت' کا تصور پیدا کر کے دونوں کو زمانے کے موافق بنانے کی کوشش۔

مسدس اور مقدمہ شعر و شاعری مخالفت کی اصل وجہ قرار دیئے گئے۔ شاعری میں لفظی و معنوی خرابیاں نکالی گئیں۔ جن میں حشو، تعقید، لغوی غلطیاں، غلط ترکیب، غرابت الفاظ، حشو و زوائد، پست خیالات، شعریت کی کمی، خشک و بے مزہ انداز بیان، اخلاقیات پر زور دینے کی وجہ سے شعریت کا خاتمہ، تعقید لفظی و معنوی غرض ان کی شاعری میں ہر نقص نکالا گیا۔ سرسید کے ساتھ رہنے اور ان کی تحریک کی ہمنوائی کرنے سے مذہبی اور سماجی اعتبار سے بھی مخالفت کی گئی لیکن رفتہ رفتہ یہ طوفان مخالفت کم ہونے لگا اور حالی کی زندگی ہی میں ان کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا جانے لگا اور ان کے کلام کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ سر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں۔

"مولانا حالی اپنے رنگ کے مسلمہ استاد ہیں ..... انھوں نے رنگ خود سادہ انتخاب کیا اور اس میں وہ کمال قائم کیا ہے جس کی نظیر تاریخ اردو کے اوراق میں کم ملتی ہے .... جو کچھ بھی کبھی مولانا حالی کے قلم سے نکلتا ہے وہ فلسفۂ جدید اور معلومات طبعی سے بھرا ہوتا ہے اور جس مشکل اور دقیق مسائل سائنس کو مولانا نظم میں ادا کرتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے"[1]

ادب کے جوہریوں نے حالی کے کلام پر سنجیدگی کے ساتھ تبصرہ کیا اور اس کے اندر جو نقائص تھے بیان کئے۔ حسرت موہانی نے کلام حالی کی کمزوریاں بتائی ہیں۔ یہ کمزوریاں زیادہ تر لفظی ہیں مثلاً مرثیہ محمود خاں کا یہ شعر۔

جمع ہوں محمود خاں کے ذات میں ان کی کمال ہے یہ سب ممکن مگر محمود خاں ملنا محال

---

[1] مخزن لاہور۔ جلد ۸ نمبر ۲۔ نومبر ۱۹۰۲ء ص ۲

Marfat.com

محمود خاں ملنا محال۔ صحیح نہیں ہے بلکہ محمود خاں کا ملنا محال، صحیح ہے .... یا

غزلیات میں

عشق اس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا گودیوں میں تجھے تھا جبکہ کھلایا جاتا

تو کھلایا جاتا تھا ہونا چاہیئے ، تجھے کھلایا جاتا تھا، نہیں" ..... یا

تک جائے دل نہ منزل مقصود میں کہیں ہم جس کو ڈھونڈھتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

ملا کے بجائے پایا غلط ہے۔ ایک جگہ ملی کے بجائے پائی لکھ گئے ہیں۔

ادھر اور ادھر دیر تک آگ ڈھونڈھی کہیں روشنی دن کو پائی نہ ان کی .. یا

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز

جانا، لگانا قافیہ معہ الف کے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ شبانہ کسی طرح ہم قافیہ نہیں ہو سکتا۔ یا

باد صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

پہلے مصرعہ میں پھونک کا کاف تقطیع میں نہیں آتا"

اسی قسم کی لفظی و عروضی غلطیاں حسرت مرحوم نے نکالیں جو اردوئے معلی کی ابتدائی جلدوں میں موجود ہیں لیکن اس کا اعتراف کیا کہ

"حق یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے جذبات حقیقی ہوں اور مذاق صحیح ہو تو اس کی شاعری پر محض چند لفظی کمزوریوں کی بنا پر خرابی کا الزام لگانا کسی طور پر جائز نہیں ہو سکتا"[1]

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے نقائص حالی پر روشنی ڈالی ہے۔

"وہ کہیں کہیں قواعد و عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور بعض الفاظ و محاورات خیال نہیں رکھتے۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں۔ کبھی ان کا تخیل بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور کبھی محض تک بندی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ایک ریفارمر اور نیشنلسٹ کی حیثیت بھی کہیں کلام کے مزے کو بھیا کر دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی ان کے کمال شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا۔[2]

مولانا حالی زبان کی وسعت کے لئے متروک الفاظ کا استعمال جائز سمجھتے تھے اور انھوں نے "ارباب فن کی مقرر کی ہوئی بہت سی قیدوں کو توڑ دیا" تھا۔

---

[1] تذکرۃ الشعراء۔ حسرت موہانی صفحہ ۱۷۔۱۸

[2] تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ صفحہ ۴۱۷

متروک الفاظ	استعمال
یاں واں	تو یاد ان کی رہ جائے گی اسقدر واں — کہ ایک قوم رہتی تھی اس نام کی یاں
پہ بنی لیکن	پہ تھا ثبت علم قضا و قدر میں — کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں
پہ بجائے پر	نہ رستہ ترقی کا کوئی کھلا تھا — نہ زینہ بلندی پہ کوئی لگا تھا
تلک "تک"	صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں — کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تابعدار، متابع کے معنی میں۔ غمخوار باپوں کی رہیں، ماؤں کی تا بعدار تر"	
نظر ورا	انھیں کا ظہور اب ہے سب خشک و تر میں — انھیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں[1]

مولانا نے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال کئے ہیں جیسے

مثالب — مناقب سے بدلے گئے سب مثالب — مثالب یعنی برائیاں اردو کے لئے غیر مانوس ہے۔

اسی طرح "عرصہ تک" بھلا دیکھا۔ ہر قواعد و صرف کی تفصیل نہیں زبان کی سلاست کے دائرے سے باہر ہیں۔

اسی طرح انگریزی الفاظ کا استعمال بھی غیر ضروری کیا ہے۔ جیسے۔

وہ نیشن جو ہیں آج گہرے تالے — دھندلکے میں لپٹی کے پنہاں ہیں سارے
برٹی میں جو آج فالتو ہیں سب سے — بتائیں کہ ابرل بنے ہیں وہ کب سے
وہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سب کی — کنونڈی رہیں گی ہمیشہ عرب کی

"نیشن، برٹی، ابرل، کنونڈی ایک اردو شاعر کی زبان پر زیب نہیں دیتے۔

مگر "اس قسم کی مثالیں ان کی نئی شاعری میں مل سکتی ہیں لیکن ان کی پرانی شاعری جس کا لباس زیادہ تر غزل ہے وہ اس سے بیشتر پاک ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہی ہو کہ وہ اس شاعری کو خود بھی پروپیگنڈا والی شاعری سمجھتے تھے اور قوافی ردیف کی زیادہ پابندی ضروری قرار دیتے تھے[2]

موجودہ زمانے میں حالی کے سب سے زیادہ سنجیدہ مخالف مشہور نقاد ڈاکٹر کلیم الدین احمد "اردو شاعری پر ایک نظر" میں حالی کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"حالی کے حسن نیت سے انکار نہیں۔ ان کی اصلاحی کوششوں کی جس قدر تعریف

---

[1] صحت زبان۔ جگر بریلوی صفحہ ۱۷-۱۸-۱۹-۲۶-۴۸-۴۸

[2] عالمگیر لاہور خاص نمبر ۱۹۳۷ء مسدس حالی مجزر اسلام۔ اختر علی تلہری صفحہ ۶ تا ۶۷

کی جائے، جائز ہے۔ ان کے نظم کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے لیکن جس شاعر کا زمانہ منتظر تھا، جس آزاد خیال، مجدد، بلند پایہ شاعر کی ضرورت تھی وہ حالی نہ تھے۔ وہ قوم کی پستی دیکھ کر متاثر ہوئے۔ ان کے دل میں اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا اور ان کے اصلاحی خیالات کا قوم پر اثر پڑا اور لوگوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن حالی شاعر نہ تھے۔ ان کا تخیل نارسا تھا۔ جدت حاصل کر سکتی، اتنی کم تھی۔ جیسے یہ بھی ہی نہیں۔ ذہن و ادراک میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ احساسات شاعرانہ نہ تھے طرز ادا میں خشکی تھی۔ یکسانی تھی۔ اور بے رنگی بھی تھی۔ ہاں نثر میں جو خوبیاں ہوتی ہیں، وہ حالی کی نظم میں کبھی کبھی مل جاتی ہیں[1]۔"

سجاد انصاری حالی کا مرتبہ اردو شاعری میں بلند تسلیم کرتے ہیں لیکن "ان کی شاعری کے ہر دور کو تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ تحفظ کے ساتھ کہتے ہیں کہ

"میں آنکھ بند کر کے قائل نہیں کہ ہر شاعر کو پیغمبر سمجھوں جس کے ہر لفظ کو جبلاوحی و الہام سمجھتے ہیں[2]۔"

ڈاکٹر احسن فاروقی نے حالی کے نظریۂ شاعری پر حسب ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

"شاعرانہ فطرت کی خصوصیات اور شاعری کی اہم صفات پر حالی کی پوری بحث پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جتنی وہ یہ بحث اہم ہے حالی اتنے ہی زیادہ اس پر حق آزادی کے اہل ہیں جس علوم کی فلسفہ اور نفسیات کی صداقتوں کی اس سلسلہ میں ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھیں[3]۔"

مجنوں گورکھپوری انجمن و نیاز ادب کے تین مرتدوں میں شمار کرتے ہیں وہ ان کے قدیم رنگ کو شاعری سمجھتے ہیں۔ [illegible] حسن و عشق [illegible] زنگین بیانی [illegible] حضرت [illegible]

[illegible]

---

[1] اردو تنقید [illegible] ۲۳۔

[2] محشر خیال [illegible] صفحہ ۶۰

[3] اردو میں تنقید۔ احسن فاروقی صفحہ ۷۳

[4] نقوش و افکار۔ مجنوں گورکھپوری۔ مزالیات حالی صفحہ ۲۰۹

[5] اثر کے تنقیدی مضامین۔ اثر لکھنوی صفحہ ۲

Marfat.com

ان سب مخالفتوں اور اعتراضوں کا نتیجہ معترضین کی زبان میں یہ نکلتا ہے کہ حالی کسی رخ سے بھی شاعر کیا نیم شاعر بھی نہیں تھے۔ نہ زبان جانتے تھے۔ نہ انداز بیان شاعرانہ تھا، نہ اظہار خیال پر قدرت تھی، نہ وہ شاعری کے فن سے واقف تھے۔ مولانا حالی نے اعتراضات کا تجزیہ کر کے خود فرمایا تھا۔

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی یہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

لیکن انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا تھا کہ

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

ان کی شاعری کو دیکھتے ہوئے یہی رائے متوازن اور فکر انگیز معلوم ہوتی ہے۔

باب ششم

حالی بحیثیت شاعر

اعتراضات کی حقیقت، حالی کی غزل گوئی اور نظم نگاری پر تبصرہ، حالی کا رنگ شاعری، معاصرین شعراء میں حالی کا درجہ، چند مباحث، حالی کی خصوصیات و اولیات، شاعر کی حیثیت سے حالی کا مرتبہ۔

Marfat.com

ترتیب

اعتراضات پر ایک نظر	۳۳۱
غزل گوئی	۳۳۸
اساتذہ کا رنگ	۳۴۳
معاصرین سے تقابل	۳۴۷
موضوعات شاعری	۳۵۳
نظم نگاری	۳۵۹
خصوصیات و انفرادیت	۳۶۴
حرف آخر	۳۷۸

Marfat.com

حالی بحیثیت شاعر

متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالی　　مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

اگر حالی کا یہ دعویٰ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ان کے بلند پایہ شاعر ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ انھوں نے متعدد جگہ اپنے کلام کی بابتہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ کہیں وہ اپنے مال کو نایاب بتاتے ہیں اور کہیں بے نمک کی اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن سے تشبیہ دیتے ہیں کبھی وہ اپنی شیوہ بیانی اور جادو نگاری پر فخر کرتے ہیں اور کبھی وہ سادگی صرف اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ انھیں رنگیں بیانوں کی طرح بُولنا نہیں آتا، ممکن ہے ان کے یہ متضاد خیالات محض شاعرانہ اور صرف زیبِ داستان کے لئے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام میں یہ تضاد کسی حد تک موجود ہے ان کی شاعری پر اعتراضات کی بوچھار اور ان کے خلاف مسلسل ہنگامہ آرائی اسی وجہ سے ہوئی کہ ارباب فن خصوصاً لفظ و بیان ہی کو شاعری سمجھنے والوں کے نزدیک وہ سرے سے شاعر ہی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک شاعری صرف موزونیِ طبع، اچھے اچھے خیالات، اخلاقی اور نصیحت آمیز باتوں کو نظم کر دینے کا نام نہیں تھی بلکہ حُسنِ بیان و حُسنِ زبان کے حسین پیکر کو وہ شاعری سمجھتے تھے۔ حالانکہ کیا کہا جائے اور کس طرح کہا جائے؟ ان دونوں کے پیکرِ جمیل کا نام شاعری ہے لیکن بعض حضرات نے صرف کیا کہا جائے پر زور دیا یعنی اعلیٰ خیالات اور پاکیزہ جذبات کا مناسب اور موزوں الفاظ میں اظہار کرنا ہی شاعری کا اصل مقصد سمجھا جب کہ دوسرے حضرات نے کس طرح کہا جائے؟ پر زیادہ توجہ کی یعنی الفاظ و بیان کی عمدگی ہی کو شاعری متصور کیا۔ حالی نے ان دونوں باتوں کو مدِ نظر رکھا لیکن کیا کہا جائے؟ پر خاص توجہ کی سخن میں سلف کی پیروی کرنے کی مخالفت کی۔ ادب کی مقبول عام اور پسندیدہ شاہراہ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی۔ یہ راہ محض خیالی نہیں تھی بلکہ عملی اور زندگی کے لئے نہایت اہم اور مفید راہ تھی کہ اسی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہونچنے کا امکان تھا لیکن اس راہ پر چلنا آسان نہ تھا اور اپنے بوگوں کے لئے تو قریب قریب ناممکن تھا جو اپنی نازک خیالیوں اور تن آسانیوں میں شہرۂ آفاق تھے جن کے پاؤں فرشِ مخمل پر بھی چھل جایا کرتے تھے، اس قدامت پسند و تعیش پرست طبقہ کی ان کی سخت مخالفت کی۔

گزشتہ صفحات میں اس مخالفت پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مخالفت کے اسباب صرف ادبی، فنی یا لسانی اعتبار سے ہی نہیں تھے بلکہ سماجی مذہبی اور قومی حیثیت سے بھی تھے۔ حالی کی سب سے پہلی مخالفت مسدسِ حالی (مدوجزر اسلام) کے شائع ہونے کے بعد شروع ہوئی، اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس مخالفت میں ادیب و شاعر، سخنور و سخن فہم، معلم و

Marfat.com

واعظ، علماء اور دوسرے اکابر ملت سب شریک تھے اور ہر قسم کے اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ اس سے پانچ برس پہلے ۱۸۷۴ء میں حالی نے مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ قدیم شاعری کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور نیچرل شاعری کو مقبول عام بنانے کے لئے آزاد اور حالی دونوں نے سرگرم حصہ لیا تھا۔ لیکن اس وقت ان کی مخالفت نہ ادبی حیثیت سے ہوئی اور نہ فنی حیثیت سے۔ ہاں ان کی تقلید میں دوسرے شعراء بھی جدید قسم کی نظمیں لکھنے لگے تھے۔ جدید طرز کی انجمنیں قائم ہونے لگی تھیں، چنانچہ لکھنؤ بھی جدید خیالات و رجحانات سے متاثر ہوا تھا اور

"نئے قسم کے مشاعروں کی ایک انجمن مظفر علی اسیر کی نگرانی میں قائم ہوئی۔ پہلا مشاعرہ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۴ء کو ہوا جس میں نئے انداز کی غزلیں پڑھی گئیں"[51]

اس انجمن کا کارنامہ یہ ثابت کرنا ہے کہ لکھنؤ میں بھی شاعروں کا ایک طبقہ جدید شاعری کی اہمیت کو محسوس کر رہا تھا اور غزلوں میں نیا انداز پیش کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ حالی کی جدید نظموں سے ادبی حلقے متاثر ہو رہے تھے ان کی نظمیں

"انجمن لاہور کے مشاعروں میں جان ڈالتی ہیں۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور یہ تک ہوں جاتے کہ رات بیت چکی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں کے دم سے ان مجلسوں کی رونق ہے"[52]

حالی کا قدیم رنگ تغزل مقبول ہو چکا تھا۔ ۱۸۷۴ء سے پہلے کے کلام کی مخالفت نہیں ہوئی بلکہ

"کہنے والوں نے کہا ہے کہ حالی ..... قدیم رنگ پر اچھی اچھی غزلیں کچھ نہ کچھ ہر جا نکالتے رہتے ہیں"[53]

لیکن ۱۸۷۴ء کے بعد جدید رنگ کا اثر بڑھتا گیا۔ یہ رنگ بھی اس وقت تک پھیلا نہیں ہوا جس وقت تک حالی سرسید کی تحریک سے عملاً وابستہ نہیں ہو گئے۔ اگرچہ سرسید کی تحریک سے متاثر وہ ۱۸۷۰ء ہی سے ہو گئے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے سرسید احمد خاں کے کام میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد تہذیب الاخلاق میں ۱۸۷۵ء سے وہ مسلسل مضامین لکھنے لگے تھے، اس طرح اس دعوے کے باوجود

"اگرچہ میں نہ کبھی پہلے ان کا ہم زبان ہوا، نہ اب ہوں اور امید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا"[54]

وہ روز بروز سید احمد خاں کے ہم خیال ہی نہیں ہم عمل بنتے گئے۔ اور زبان و قلم کے بعد عملاً ان کے کام میں شریک و سہیم ہوتے گئے۔ یہ شرکت مخالفت کا خاص سبب بنی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ مولانا حالی نے سرسید کی

---

۵۱ مقالات کارسان دتاسی۔ مقالہ ۱۸۷۴ء، صفحہ ۳۶۔

۵۲ " " " " " صفحہ ۳۵-۳۵، پنجابی اخبار لاہور ۲ مئی ۱۸۷۴ء)

۵۳ ہندوستانی جلد ۲ حصہ ۳۔ جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۵۵ (اردو کا واعظ شاعر، عبدالماجد دریابادی)

۵۴ مقالات حالی حصہ اول صفحہ ۳ (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ صفحہ ۱۱۸ ۱۸۷۴ء)

Marfat.com

فرمائش پر مسدس مدوجزر اسلام، لکھا جس سے مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی۔ حالی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر فلاح قوم کے لئے شاعری کرتے رہے۔ ان کی شیوہ بیانی، قومی نوحہ خوانی میں تبدیل ہوتی گئی۔ ان کی غزلوں کی رنگت پھیکی پڑتی گئی ان کی نظمیں شاعرانہ لطافت سے رفتہ رفتہ خالی ہوتی گئیں۔ موزونیت کے علاوہ ان میں کوئی خوبی نہ رہی۔ یہ موزونیت بھی بعض جگہ الفاظ کے نامناسب استعمال کی وجہ سے ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے، اس پھیکے پن کی خاص وجہ، ان کی ناصحانہ، اصلاحی اور اخلاقی شاعری تھی۔

"رفتہ رفتہ ان کی منظومات پند و نصائح کا مجموعہ ہوگئیں، جس میں مربوط اخلاقی نظام کا ایک مکمل پیغام تو ہے، لیکن اسے شاعری نہیں کہا جا سکتا، نقد الشعر میں تمام کے سبب وہ احساسات و جذبات کو صرف خیالات سمجھتے ہوئے آخر عمر میں، رباعیات ہی پیش کرنے لگے۔ کہتے تھے وہ اقرار کرنے لگے تھے کہ اس عمر میں۔

نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی

بعض مضمون خیالات جو دماغ میں آتے ہیں اُن کو رُباعی کے سانچے میں ڈھال لیا کرتا ہوں"

یہ سعادت دارین تو ہے۔ شاعری نہیں[1]

مجنوں گورکھپوری نے حالی کی اس قسم کی شاعری کو

"دنیائے ادب میں ارتداد کی تین عبرتناک مثالوں میں سے ایک مثال" بتائی ہے۔ یعنی "حالی، ٹنی اور حالی تینوں مذہب شعر و ادب سے نکل کر مرتد ہو گئے۔ ادراضیر کے الفاظ میں حالی سرسید کے تابع مہمل، یا زیادہ سے زیادہ ضمیمہ ہو کر رہ گئے[2]"

۱۸۹۳ء میں مقدمہ شعر و شاعری شائع ہوا، جس کی وجہ سے لکھنؤ، دلی اور دوسرے مقامات کے تمام اہل زبان مخالف ہو گئے۔ مشرقی شاعری خصوصاً اردو شاعری کے اوصاف اور خصائص سے حالی کو آگاہ کیا گیا اور ان کی شاعری نیچرل شاعری کا ضحکہ اڑایا گیا۔ اگرچہ یہ اعتراضات زیادہ تر جذباتی اور انتقامی ہوتے تھے یہ عصبیت اور تنگ نظری پر مبنی تھے لیکن ادبی نکات سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ حالی کی زبان، اُن کا انداز بیان، شاعری کے متعلق ان کے خیالات پر اکثر اعتراضات صحیح تھے۔ حالی اصلاح قوم کے جوش میں۔ وہ شاعری سے دور ہوتے گئے اور جا و بیجا یا اعجاز بیان کے بجائے سادہ اور روزمرہ کی شاعری کرنے لگے۔ حکمت و فلسفہ اخلاق و اصلاح کی وجہ سے ان کی شاعری میں وہ کیف و وجدان نہیں رہا جو شاعری کی جان ہے۔

---

[1] یادگار حالی، صفحہ ۶۰، حالی دلی میں، وحید قریشی، صفحہ ۲۳۔

[2] نقوش و افکار، صفحہ ۲۰۶-۲۱۱۔

Marfat.com

انھوں نے اپنے شعری نظریات کی اساس، سادگی، جوش اور اصلیت پر رکھی لیکن اصلیت اور سچائی کے اظہار کی وجہ سے ان کے کلام میں جوش کی کمی ہوگئی، حقیقت یہ ہے کہ

"شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے کہ جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اس کے جذبات دلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں"[۵۱]

حالی کے پاس خیالات، جذبات اور احساسات کی کمی نہیں تھی وہ حالات سے متاثر ہوتے تھے اور انھوں نے ان جذبات کو حسن و خوبی کے ساتھ اظہار کرنے کی کوشش کی اور

"تقلابات تصورات میں جذبہ کی آمیزش کی اور پرانی علامتوں سے نئے معانی مراد لیے"[۵۲]

لیکن ان کا مطمح نظر اخلاقی تھا اور انھوں نے

"شعر کی حسین دیوی کو اخلاق کی چٹان سے باندھ رکھا تھا"[۵۳]

اس لیے اس میں رعنائی خیال اور حسن بیان کی گنجائش کم ہوتی گئی۔ حالی کی شاعری میں زبان و بیان کے مقابلے میں حکیمانہ اور اعلیٰ خیالات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لیکن زبان کے فدائی معانی کو زبان پر قربان کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن دہلوی لکھتے ہیں :-

"میں صحت زبان، حسن بیان، صفائی ترکیب، خوبی ادا کو، اختراع معانی پر مقدم سمجھتا ہوں اور اسی اختراع کو اچھا جانتا ہوں کہ زبان کا انداز و اسلوب اپنے مرتبے سے نہ گرنے پائے، معانی لطیف بھی اگر اچھے انداز میں ادا نہ ہوسکیں تو ان کو شاعری میں زبان و بیان پر قربان کر دینا چاہیے نہ کہ زبان و بیان کو خیال پر"[۵۴]

جب کہ کلیم الدین احمد، قریب قریب حالی کے ہمنوا ہیں۔

"شاعری میں الفاظ محض ذریعہ ہیں اظہار خیالات و جذبات کا۔ اگر انھوں نے تجربات سے زیادہ اہمیت اختیار کرلی تو پھر شاعری ممکن نہیں۔ اگر کسی شاعر نے قصداً بات کو اس طرح کہنے کی عادت ڈالی کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے چونک اٹھے تو اس کے لیے کامیاب شاعری اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جائے گی"[۵۵]

مولانا حالی نے الفاظ سے زیادہ تجربات کو اہمیت دی وہ

"شاعری سے کام لینے کے قائل تھے"[۵۶]

اسی لیے ان پر اعتراضات کیے گئے۔ ان کی شاعری کی مصلحانہ شان کو سب نے تسلیم کیا ہے لیکن اس میں سخت اختلاف ہے کہ وہ فن کارانہ اور شاعرانہ خصوصیات کی بھی حامل ہے؟ ان کی

---

۵۱ مضامین چکبست، صفحہ ۶۸۔ ۵۲ گل خنداں، غزل نمبر، جنوری ۱۹۵۹ء، عابد علی عابد، صفحہ ۲۔
۵۳ ذوق ادب و شعور، سید احتشام حسین، صفحہ ۶۴۔ ۵۴ مرآۃ الشعراء، صفحہ ۱۰۷۔
۵۵ سخنہائے گفتنی، صفحہ ۳۰۔ ۵۶ ادب اور سماج، سید احتشام حسین، صفحہ ۱۷۰۔

Marfat.com

"وہ شاعری جو اصلاح کرنا چاہتی تھی اخلاقی حیثیت سے ممکن ہے خوب ہو مگر شاعری نہیں..... ایک حقیقی شاعر کا یہ فرض نہیں۔ ہے کہ کسی مذہب یا کسی نظامِ اخلاق کے ایک ایک جزو کو صراحۃً بیان کرے۔ ایسی شاعری سے خاموشی بہتر ہے ..... حالی اپنی سعی اصلاح میں خشک ہو کر رہ گئے ..... ورنہ حالی وہ بھی تھے جنھوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

تعزیرِ جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد[1]

مجھے حالی کی شخصیت سے کوئی کاوش نہیں اُردو شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن اس اعتراف کا یہ تقاضا نہیں کہ میں ان کی شاعری کے ہر دور کو تسلیم کر لوں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ وعظ و تلقین کے سلسلہ میں انھوں نے جس قدر شاعری کی وہ سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں۔ انھیں مسائل کو وہ نثر میں ادا کر سکتے تھے اور کامیابی کے ساتھ۔ نظم کی زحمت انھوں نے ناحق گوارا کی[2]"

کسی حد تک یہ صحیح ہے کہ ان کی وعظ و تلقین کی شاعری خصوصیاتِ شاعری سے عاری ہے لیکن ان کی کل نظمیں ایسی نہیں ہیں بعض کیا اکثر و بیشتر نظموں میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان میں شاعرانہ حُسن بھی موجود ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مقدمہ سے قبل حالی کی شاعری میں شاعرانہ حُسن شباب پر ہے اور مقدمہ کے بعد اس حُسن پر زوال آتا گیا۔ رنگ و روغن اُترتا گیا، صباحت و ملاحت غائب ہوتی گئی، نزاکتِ خیال و رعنائی بیان اور پاکیزگی الفاظ کم ہوتی گئی، آخر میں یہ پیکرِ شاعری جھرّیوں کا مجسمہ بن کے رہ گیا جس میں پختگیِ عقل تو ہے لیکن دلکشی و جاذبیت مفقود۔

سجاد انصاری لکھتے ہیں :-

"میں تو اس حالی کا قائل ہوں جس نے مقدمہ کے قبل شاعری کی اور شاعری کے بعد مقدمہ لکھا[3]"

لیکن مقدمہ کے قبل حالی نے غزلوں کے علاوہ قطعات و رباعیات، نیچرل نظمیں اور دوسری نظمیں بھی لکھیں اس لئے سجاد انصاری کا مطلب غالباً یہ ہے کہ مقدمہ سے قبل حالی نے جو غزلیں لکھی ہیں وہی ان کی شاعری ہے۔ ان کی نظمیں شاعری کے دائرہ سے خارج ہیں۔ امجد علی اشہری مرحوم نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا۔

"میں ان کے طرزِ قدیم کو شاعری جانتا ہوں اور دوسرے طرز کو نظم صرف نظم[4]"

لیکن حکیم آفاق لکھنوی نے لکھا ہے کہ

"غزلوں سے بہتر نظمیں ہیں[5]"

بہرحال اس امر پر سب متفق ہیں کہ حالی کی غزلوں میں شاعری کے بہترین اجزا ہیں مگر ان کی

---

[1] اس کو عرصہ تک بڑے اساتذہ غالب یا لکھتے رہے۔ دیکھو محفل، حیدرآباد، صفحہ ۱۱

[2] محشرِ خیال، سجاد انصاری، صفحہ ۵۰ تا ۶۰۔ [3] محشرِ خیال، صفحہ ۹۵۔

[4] ایشیائی شاعری، صفحہ ۱۲۹ [5] نگار، اردو نمبر، صفحہ ۱۸۸

تخیل اصلاحی نظموں میں، یہ محاسن رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے، یہاں تک کہ آخری زمانہ میں اعلیٰ خیالات کو موزوں کر دینا ہی شاعری رہ گیا تھا۔ تاہم

"ان کی طبیعت میں ایک جچا تلا خاص طرح کا مادہ ہے ..... نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے"[1]

یہ سلیقہ ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ فراق گورکھپوری لکھتے ہیں :-

"احتیاط حالی کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی ..... وہ واقعیت کو معجزہ نہیں بنا پاتے اس لئے ان کی شاعری بھی ساحری نہیں ہونے پاتی ..... یہی وہ اسباب ہیں جن سے حالی کی غزل میں ہمیں کسی چیز کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور جو حالی کی شاعری کو عظمت کے قریب سے کتراکے نکال لے جاتے ہیں"[2]

حالی کی شاعری پر فنی، ادبی اور لسانی اعتبار سے جو اعتراضات کیے گئے ان میں مبالغہ زیادہ ہے معترضین جذبۂ مخالفت میں حد سے زیادہ بڑھ گئے۔ اور اعتراض برائے اصلاح و ترقی زبان دانی کے بجائے، اعتراض برائے اعتراض و انتقام ہو کے رہ گیا۔ اس زمانہ میں نقد و تبصرہ کا معیار اتنا ہی تھا کہ ناقد یا معترض، ادبی یا فنی اعتراضات سے زیادہ شخصی اور ذاتی اعتراضات کرتے تھے جس سے اصل مقصد فوت ہو جاتا تھا اور ادبی معرکے شروع ہو جاتے تھے، یہ معرکے جنگ و جدل کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ لکھنؤ کو اس میں خاص شہرت اور شرف حاصل ہے۔ انشا و مصحفی، ناسخ و آتش اور انیس و دبیر کے ادبی معرکے معرکۂ کارزار بن جاتے تھے۔ حالی کے زمانہ میں ان کی مخالفت کے ساتھ ساتھ معرکۂ شر و چکبست بھی جاری تھا، حالی نے تو چپ رہ کر تمام نکتہ چینوں کو خاموش کر دیا مگر ان کے ہمدرد، اکثر و بیشتر ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے، حالی ان کو منع بھی کرتے تھے مگر

کون سنتا ہے فغانِ درویش

یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ اس سے حالی کی شاعری کو فائدہ بھی ہوا۔ اس کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اعدا سبب خیر بن گئے اور رفتہ رفتہ ارباب کمال و ماہران فن، ان کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہوتے گئے، پانی پت کے میدان کو پامال کرنے والے، اور کلام حالی کی تنقید میں موسوی عصا رکھنے والے، حالی کی سخنوری اور سخن فہمی کے قائل ہوتے گئے اور [illegible] مرحوم نے، قوم کی ترجمانی ان الفاظ میں کر کے، حالی کی شاعری کا اعتراف کیا۔

وہ خضر ادب، ادیب مشاق — فرخندہ سیر، طبیب اخلاق
یکتائے زماں، وحید آفاق — گر نظم میں فرد، نثر میں طاق

---

[1] افادات مہدی، صفحہ ۲۲۲۔ [2] نوائے، صفحہ ۲۹۲

Marfat.com

پاکیزہ خیال، پاک طینت
جس بزم میں ہو وہاں کی زینت[1]

اور صادق علی خاں صادق نے صاف صاف اقرار کیا کہ

زمین شعر میں تازہ چمن لگا رہے ہیں — اور ان میں طرفہ مضامیں کے گل کھلا رہے ہیں
نگاہِ صادق مشتاق میں سمائے ہیں — ہزار طرح ہزاروں نے خار کھائے ہیں
نہ وہ رہیں گے زمانے میں، اور نہ تو حالی
رہیں گے تیرے گلستاں میں رنگ بو حالی[2]

اس طرح اعتراضات کی حقیقت واضح ہو گئی کہ ان میں سچائی کتنی تھی اور عصبیت کتنی؛ قدیم شاعری کے دلدادہ حالی کی جدت و اختراع کو اردو شاعری کے لیے سم قاتل سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک الفاظ کی تراش خراش اور بیان کی دلکشی ہی سب کچھ تھی، جب کہ حالی نے شاعری کو زندگی سے قریب تر لانے، اس میں واقعیت، مقصدیت اور افادیت پیدا کرنے کی کوشش کی، انھوں نے

"ادبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا یہ ان کا انتہائی ایثار تھا کہ باوجود اعلیٰ درجہ کی تغزل کی صلاحیت کے انھوں نے نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا"[3]

آل احمد سرور کے الفاظ میں

"بات یہ تھی کہ حالی اور ان کے ہم عمر حسن کا احساس کم رکھتے تھے یا وہ شیریں لفظوں پر قربان جانے یا وہ ان جادو کے دریچوں Casements کا حسن نہ دیکھ سکتے تھے جن کی طرف کیٹس نے اشارہ کیا ہے بلکہ دراصل ان کا ادبی شعور زیادہ [illegible] زیادہ صحت مند تھا۔ ان کی آبائی تمچھ [illegible] کے چٹخاروں سے زیادہ مزہ نہ تھا مگر اس میں یقیناً غذائیت زیادہ تھی"

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حالی نے اصناف سخن پر جو نکتہ چینی کی اس کی غرض و غایت اصلاح تھی۔ اور شاعری کے ناپاک دفتر کو پاک کرنا تھا۔ ان کا نظریہ شاعری، شعر و ادب کی طہارت، پاکیزگی، صحت و افادیت تھا، وہ اصلیت اور واقعیت کو شاعری کی اساس سمجھتے تھے۔ [illegible] اس ادب کے حامی ان کے مخالف اور معترض تھے۔ حالی نے ان [illegible]

---

[1] ہمارا ادب: آل احمد سرور، مرثیہ حالی، مرثیہ نگاری، لکھنؤ۔
[2] مجموعہ ادب، فیروز سنز لاہور، صفحہ ۲۶۱۔
[3] [illegible] حالی۔ ڈاکٹر یوسف حسین، صفحہ ۱۹۔
[4] [illegible] اور پرانے چراغ، صفحہ ۲۲۹۔

کے لئے بطور سند پیش کیا ہے۔

اعتراضوں کا زمانے کے ہی حالی پہ نچوڑ شاعر اب ساری خدائی میں ہی کیا ایک ہی شخص

یعنی حالی اپنی شاعری کی قدر و قیمت اور اعتراضات کی حقیقت سے آگاہ تھے۔

حالی کی شاعری عام طور پر دو حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ یعنی

غزل گوئی اور نظم نگاری

ان کی غزلوں میں دو رنگ پائے جاتے ہیں۔

قدیم رنگ اور جدید رنگ

اسی طرح ان کی نظموں کے دو موضوع ہیں۔

فطرت اور قومیّت

ان کی قدیم غزلیں ان تمام خصوصیات کی حامل ہیں، جو شاعری کی روح ہیں، اس لئے ان کے بہترین غزل گو ہونے میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے۔ بہترین غزل گو شاعر کے لئے شمس العلماء نواب سید امداد امام اثر نے جو شرائط بیان کئے ہیں، اُن میں سے چند یہ ہیں۔

غزل کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

"ایسے مضامین جو اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ اور ارفع درجہ کے امور ذہنیہ ہوں بیان کئے جائیں، "یہ صنف شاعری تمام تر داخلی subjective رکھتی ہے"[1]

اسی طرح غزل گو کے لئے ضروری ہے کہ وہ

"اعلیٰ قسم کا دماغ رکھتا ہو، اور خلقت کی رو سے آتش طبیعت، پاک طینت، شوخ مزاج، نازک خیال، گداختہ دل، اور برشتہ جگر ہو"

اور غزل گوئی کے لئے امور ذیل لازمی بتائے ہیں۔

۱۔ زبان شستہ ہو، سادہ ہو، کیونکہ غزل گوئی کو صنائع و بدائع کی حاجت نہیں۔

۲۔ تشبیہ و استعارہ اور مبالغہ کا استعمال فطری طور پر کیا جائے۔

۳۔ پھبتی، ضلع جگت، رعایت لفظی وغیرہ سے اجتناب واجبات سے ہے۔

۴۔ مضامین داخلی ہوں مگر ایسے رفیع درجہ کے ہوں کہ جس سے انسان کے عالم باطنی کا شرف حاصل ہو سکے۔

۵۔ کوئی خیال پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ غزل گو کو لازم ہے کہ ہمیشہ عالی مضامین پر نظر رکھے اور جس قدر بلند پروازی احاطۂ امکان میں ہو اُسے اپنا شیوہ بنائے۔

---

[1] کاشف الحقائق، صفحہ ۳۱۔

Marfat.com

۶۔ غزل گوئی کی سرسبزی کے لئے اس کی حاجت ہے کہ جو واردات قلبیہ قلمبند ہوں انھیں مُجرّد شاعری کی زبان سے تعلق نہ ہو۔ ضرور ہے کہ وہ مضامین فی الواقع دلی انداز بھی رکھتے ہوں تاکہ سامعین کے دلوں میں جگہ کر سکیں۔

۷۔ حکمت آگیں مضامین شاعری کے پردے میں قلمبند کئے جائیں۔

۸۔ غزل گو کو چاہیئے کہ تبعیت فطرت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

۹۔ غزل گو کا عاشق مزاج ہونا واجبات سے ہے۔ عاشق مزاجی سے مراد ہے عالم فطرت کے حُسن پر محویت کا پیدا ہو جانا۔

۱۰۔ غزل گوئی خستہ جگر، گداختہ دل، آزاد مزاج، عزلت نشیں، قناعت پیشہ، الم کش اشخاص کا شیوہ ہے۔ ہوسناکی، جاہ طلبی، زراندوزی، وغیرہ سے اس شیوہ کو کیا علاقہ[1]

جب مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری شائع کیا تو حضرت امیر مینائی نے بعض متنازعہ فیہ امور کی نسبت حضرت شاد عظیم آبادی سے استفسار کیا۔ انھوں نے نظم میں فن شعر کے نکات و رموز کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ یہ منظوم خط فن شعر کا صحیفہ ہے۔ سب سے پہلے فطرتی شاعر کے لیے شعر گوئی کو مناسب و موزوں بتایا۔

روا یہی ہے کہ شاعر ہو فطرتی شاعر
بغیر کسب کے ہو جوش اس کے دل میں بھرا

لیکن رؤس علم سے بھی باخبر ہو حتی الوسع
فنونِ شعر پہ حاوی ہو اس کی طبع رسا

علاوہ علم کے ادراک ہو صحیح و درست
رہیں بیاں کے نتائج پہ اس کی آنکھیں وا

ضرورتوں سے بھی آگاہ ہو زمانے کی
مذاق اہل جہاں سے بھی ہو نہ بے پروا

اس کے بعد کلام میں حسب ضرورت صنائع بدائع کے استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے اور خلاف فطرت صنائع استعمال کرنے کو ناجائز بتایا ہے۔

وہ صنعتیں جو حقیقت کو مشتبہ کر دیں
کریں گے قطع نظر ان سے باتقی اعتبار

مگر لطافت الفاظ بھی رہے ملحوظ
نہ ہو کلام بغیر اس کے دل پسند و رسا

اُردو کے شعر کیسے ہونا چاہئے؟ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ اُردو کے شعر کیسے ہوں
سیاق نظم سے ظاہر ہے مدعا میرا

مذاق ملک کو سمجھے ضرورتیں دیکھے
کرے وہ امر جو موقعے زمانے کا

محاوروں میں متانت نمک ہو لفظوں میں
پڑھے کوئی تو ملے حظ زبان کو تیری مزا

بیاں کرے جو کوئی بات نظم میں اپنی
تو اصل حال کی تصویر کھینچ دے گویا

[1] تذکرۃ الشعراء جلد سوم جنوری فروری مارچ ۱۹۱۵ء صفحہ ۳ تا ۲۱ غزل گوئی اور اسکے شرائط نواب سید امداد امام اثر

Marfat.com

سمجھ کے طرز ادا بھی وہ اختیار کرے — سُنیں تو سُن کے بھیانک ہوں کبھی فصحا

غزل کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ۔

غزل میں صرف کرے حُسن و عشق کے مضموں — پہ کوئی لفظ نہ اخلاق سوز ہو اصلا
بلند لاکھ ہوں معنے مگر ہوں لفظ سلیس — نہ یہ کہ ضیق میں پڑ جائے ذہن سامع کا

شعر و شاعری کی بنا یہ ہے

اثر زیادہ ہو سامع پہ نثر کی نسبت — اسی لئے ہے فقط شعر و شاعری کی بنا
خلاف فطرت و انسانیت ہے جو مضموں — تو اس میں قوت جذب قلوب خلق کجا؟[51]

ہماری شاعری میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے موزوں اور با اثر کلام کو شعر فرمایا ہے اور ان کے نزدیک شاعری

"جذبات کی ترجمانی ہے اور انسان کے گہرے جذبات فطرۃً موزونیت اور موسیقیت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں"[52]

یہ گہرے جذبات، موزونیت اور موسیقیت غزل کی روح ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ میں ۔

"غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجہ کی دروں بینی پائی جاتی ہے، غزل گو جو کچھ کہتا ہے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے اس کی حیات و کائنات کا نقطۂ نظر داخلی ہوتا ہے، اس کا تخیل اپنی گلکاریوں سے، اس کے دل کو ایسے ایسے حسین پیکروں سے آباد کر دیتا ہے کہ پھر اس کو ادھر اُدھر جھانکنے تاکنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی"[53]

لیکن یہ تمام خصوصیات خیال اور لفظ، دونوں کی خوبیوں کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتیں، شاعرانہ خیال کی یا شعر کی معنوی خوبیاں حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ انسلیت ۲۔ سادگی ۳۔ بلندی ۴۔ باریکی ۵۔ تڑپ

شاعرانہ بیان کی خوبیاں یا شعر کی لفظی خوبیاں یہ ہیں ۔

۱۔ سادگی ۲۔ اختصار ۳۔ زور ۴۔ مناسبت الفاظ جس کی تین صورتیں ہیں ۔

(الف) لفظ کی مناسبت خیال سے باعتبار آواز ۔

(ب) لفظ کی مناسبت خیال سے باعتبار معنی ۔ (ج) لفظ کی مناسبت لفظ سے ۔

۵۔ جدت[54]

---

[51] سروش ہستی ۔ شاد عظیم آبادی ۔ صفحہ ۱۵ تا ۳۲ ۔

[52] و [54] ہماری شاعری، صفحات ۲۰ ۔ ۲۳ ۔ ۳۱ ۔ ۴۱ ۔ ۴۲ ۔ ۴۴ ۔ ۴۵ ۔ ۴۷ ۔ ۵۵ ۔ ۶۲ ۔ ۶۴ تا ۸۴ ۔

[53] اُردو غزل ۔ صفحہ ۱۰ ۔

Marfat.com

اُردو غزل اور غزل گوئی کے متعلق یہ چند اصول سب نے تسلیم کئے ہیں۔
ان بیانات کی روشنی میں حالی کی غزل گوئی کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی قدیم رنگ کی غزلوں میں سے اکثر ان خصوصیات کی حامل ہیں کیونکہ انھوں نے

"اُردو شاعری کی فنی روایات سے رشتہ نہیں توڑا اور نئے خیالات کو پرانے جانے بوجھے آزمائے ہوئے سانچوں میں ڈھالا"[۵۱]

غزلوں میں ان کی یہ کاوش بے حد مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اسی لیے وہ

"شاعر بحیثیت نظم نگار کے اتنے دنوں زندہ نہ رہیں جتنے دنوں بحیثیت غزل گو کے کیونکہ جو کاوش انھوں نے غزلوں میں کی ہے وہ نظموں میں نہیں"[۵۲]

لیکن زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ حالی اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور و مقبول ہوئے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سنجیدہ اور مصلح حالی کبھی جوان بھی تھے اور انھوں نے اپنے جذبات کی ترجمانی غزلوں میں بھی کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بہت محتاط غزل گو ہیں اور انھوں نے طوفان جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دیا، بلکہ

"غزل کو بعض ایسے عناصر سے پاک کر دیا جو زمانہ کے امتداد کی وجہ سے متروک اور نامعقول ہو رہے تھے اور اپنی غزلوں کو اصلاح قومی اور اخلاق و موعظت کے بلند تصورات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس کے علاوہ ان کی غزلوں میں بڑی حد تک وہ ترتیب و تسلسل اور وہ ربط و نظم بھی پیدا ہو گیا جس پر زمانہ حال کے نقاد اس قدر زور دینے کے عادی ہیں"[۵۳]

اس طرح حالی اپنے عہد کے تمام غزل گویوں میں ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل کا ماحول عاشقانہ یا حسرت کی زبان میں فاقہ و فقر، غزل گو کا مذہب، بوالہوسی، عشرت پرستی اور لذت اندوزی تھا۔ شیفتہ اور غالب نے اس مذہب کے خلاف جہاد کیا۔ حالی پر ان دونوں حضرات کا اثر تھا۔ خود ان کی فطرت ہوا و ہوس اور رنگ رلیوں کو ناپسند کرتی تھی۔ اس لیے ان کی شاعری ہوسناکی اور کام جوئی سے پاک رہی۔ انھوں نے شاعری کو

"روایتی بیماری سے، چھٹکارے حقیقت نگاری کا خوبصورت لباس پہنایا"[۵۴]

انھوں نے جوانی میں عاشق ہونے کا دعوے کیا مگر

---

۵۱ انتخاب حالی۔ مقالہ سفارش حسین [illegible] ۵۲ نئی قدریں۔ مضامین حالی صفحہ [illegible]
۵۳ ماہ نو کراچی۔ جون ۱۹۵۲ء صفحہ [illegible] ۵۴ تاریخ پسندادب۔ علی سردار جعفری صفحہ ۱۰۴۔

Marfat.com

"طہارت عشق اور اُس کے انسانی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔"

اسیطرح "انھوں نے مے و نغمہ در باب دربط کی خواہش بھی ظاہر کی لیکن اس کی لے میں انحطاط و لذت موت کی خواہش پیدا نہ کی، بلکہ ایک نئے آہنگ اور ایک نئے انداز سے اپنی محفل کو اس داخلی تبدیلی سے سازگار کیا جس کا شعوری احساس اسے نہیں ہو رہا تھا۔"[۵۱]

حالی کا یہ نیا آہنگ نظیر و درد، میر و مصحفی، شیفتہ و غالب، ذوق و مومن اور امیر و داغ کے سازوں سے مل کر بنا ہے، جس کی لے میں درد و اثر، سوز و گداز، خلوص و محبت، جدت و ندرت روانی و سلاست، سنجیدگی و متانت، گہرائی و گیرائی، دلکشی و رعنائی، وسعت و جامعیت، افادیت و مقصدیت، غرض سب کچھ موجود ہے۔

"ان کے یہاں خستگی و گھلاوٹ میر کی ہے، ظرف و تمکنت کے تیور غالب کے ہیں، شائستہ حمومیت اور مہذب سادگی شیفتہ کی ہے۔ غالب کے شاگرد کو غالب کی پیچیدہ خیالی اور مشکل گوئی سے جس چیز نے بچا لیا وہ شیفتہ کی صحبت کا فیض تھا۔"[۵۲]

یہی نہیں بلکہ "آتش کی تیزی، مومن کی نازک خیالی و جذبات نگاری، غالب کی نفسیات اور داغ کی شوخ نگاری" بھی موجود ہے۔[۵۳]

مگر ان کی شاعری پر سب سے زیادہ اثر شیفتہ کا پڑا۔

"ان کا طرز کلام غالب سے زیادہ شیفتہ و دیگر شاگردان مومن کے انداز سے مشابہ ہے۔"[۵۴]

بلکہ "سادگی میں تو حالی کی لے، ذوق کی آواز، اور ظفر کی راگنی سے بھی بڑھی ہوئی تھی ..... اور کبھی کبھی دور سے سوز کی ہلکی سی پرچھائیں پڑ جاتی ہے بلکہ حاتم، قائم، اثر اور یقین کی بھی۔"[۵۵]

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حالی کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ انھوں نے تمام اساتذہ کا کلام دیکھا تھا اور اس سے استفادہ کر کے اپنا رنگ سخن الگ قائم کیا تھا، خود فرماتے ہیں۔

شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے — دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

لیکن حالی جن اساتذہ کے انداز سخن سے متاثر ہوئے وہ شیفتہ و غالب، مصحفی و میر ہیں۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں — غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا[۵۶]

---

۵۱ نئی نذریں۔ ممتاز حسین، صفحہ ۱۸۲۔

۵۲ ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری۔ صفحہ ۱۲۷۔

۵۳ اردو شاعری کی روایت، شارق میرٹھی (حالی کی شاعری اور اسکا ردعمل حسرت نعمانی) صفحہ ۸۸ سنہ ۱۹۵۲ء

۵۴ تذکرۃ الشعراء حسرت موہانی۔ صفحہ ۱۰۔ ۵۵ انداز۔ فراق گورکھپوری۔ صفحہ ۲۰۰۔ ۲۰۵۔

۵۶ تلامذہ غالب میں دوسرا مصرع اس طرح ہے "شاگرد میرزا کا معتقد ہوں میر کا" صفحہ ۸۶۔

Marfat.com

ور حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

ر شیفتہ مرحوم سے وہ سب سے زیادہ مستفید ہوئے، جس کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے۔

"درحقیقت مرزا (غالب) کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا..... وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کلام شاعری سمجھتے تھے، چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔"[1]

حالی نے اپنے نظریۂ شاعری کی اساس انھیں باتوں پر رکھی۔ وہ فطرۃً حقیقت پسند تھے۔ اسی لیے ان کے کلام پر شیفتہ کا کافی اثر ہے۔ دونوں کے مجموعۂ کلام میں متعدد غزلیں ہم طرح و ہم مضمون ہیں، یہاں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جن سے دونوں کے رنگ سخن کا اندازہ ہو جائے گا اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ حالی پر شیفتہ کا کس حد تک اثر ہے۔

شیفتہ کا مشہور شعر ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

حالی نے کہا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

شیفتہ کی مشہور غزل ہے۔

دل لیا جس نے بے وفائی کی رسم کیا ہے یہ دل ربائی کی

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر دین داری و پارسائی کی

آخر کار مئے پرست ہوا شان ہے اس کی کبریائی کی

حالی نے بھی اسی طرز میں غزل کہی۔

دھیان تھی اپنی پارسائی کی کی بھی اور کس سے آشنائی کی

دل بھی بیباک میں ہو تو یاں کس نے رکھیے امید دل ربائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں رہ گئی شرم پارسائی کی

حالی کا مشہور شعر ہے۔

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

---

[1] مقالات حالی، صفحہ ۲۶۷۔

اسی مضمون میں شیفتہ کا شعر ضرب المثل ہو چکا ہے، خصوصاً مصرع ثانی ۔

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام　　بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

مولانا حالی نے جب شاعری کے کوچے میں قدم رکھا تو غالب و مومن و ذوق کے نغموں سے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ حالی ان سے متاثر ہوئے ۔

"غالب سے انھوں نے حسنِ تخیل، ندرتِ فکر، شوخیِ گفتار سیکھی[۵۱]"

اور "مومن سے اسلوب بیان، معاملہ کی رنگینی اور شوخی سیکھی ..... یہ طرز مولانا حالی کے کلام میں بھی ہے مگر بہت نہیں کیونکہ مومن کی رنگینی اور شوخی مولانا حالی کی طبیعت کے مناسب نہ تھی پیدا کی مگر بہت کم[۵۲]"

یہ بھی صحیح ہے کہ

"حالی کی شاعری بلحاظ حسنِ بندش و ندرتِ تراکیب مومن سے پست ہے[۵۳]"

بہرحال مومن کا رنگ سخن حالی کے یہاں موجود ہے۔ شیفتہ، مومن کے شاگرد تھے۔ حالی شیفتہ سے مستفیض ہوئے، اس طرح بالواسطہ وہ مومن سے متاثر ہوئے۔ مومن کے علاوہ حالی

"فکری و تصوراتی اعتبار سے غالب کا سچا شاگرد ہے مگر اس کے تخیل کی پرواز کا انداز غالب سے جداگانہ ہے اور اس کے ظرف کی گہرائی غالب کے عمق سے مختلف ہے .....
غالب کی شاگردی و ہمنشینی نے اس کے نفس میں جو شعورِ ذات اور وقارِ خودی پیدا کر دیا تھا وہی اس کی شاعرانہ نجات کا سبب بن گیا[۵۴]"

حالی بعض جگہ بالکل اپنے استاد کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں ۔

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں　　ہر خار نخلِ ایمن و ہر رنگ طور تھا
مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ　　ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا　　ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب
سرمایۂ خلاف دو عالم ہے رازِ دل　　باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز
اک عمر چاہیے کہ گوارہ ہو نیشِ عشق　　رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی　　اتنے ہی ہم سبک نہ ہوئے جتنے گراں ہے

---

۵۱ مضامین عابد۔ صفحہ ۲۷۔
۵۲ عالمگیر خاص نمبر، جنوری ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۵ (حالی کی غزل گوئی۔ حامد حسن قادری)
۵۳ ذخیرہ (حیدرآباد) مارچ ۱۹۸۵ء (حالی کا رنگ تغزل۔ عبدالماجد دریابادی)
۵۴ صحیفۂ تاریخ اردو۔ صفحہ ۳۴۴ و ۳۴۵۔

یہ صحیح ہے کہ ان اشعار میں غالب کا علوئے تخیل اور ان کی مشکل پسندی نہیں ہے لیکن غالب کے کلام کا رنگ صاف طور پر نمایاں ہے اور اکثر اشعار پر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ غالب کے ہیں حالی کے نہیں۔ غالب کے بعد حالی نے میر کی تقلید اور پیروی کرنے کا دعوے کیا ہے، یہ دعوے صداقت پر مبنی ہے۔ ان کے کلام میں یہ میر کی سادگی اور گداز پائی جاتی ہے۔ ان کے باتیں کرنے کا ڈھنگ بھی میر جیسا ہے چھوٹی اور لمبی بحروں میں ان کی غزلیں، میر کے رنگ میں زیادہ کامیاب ہیں۔

قلق اور دل میں ہوا ہو گیا — دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

یاد میں تیری سب کو بھول گئے — کھو دیے ایک دکھ نے سب ہمراہ

رہتے ہیں چار ہم پہ ہنستے ہیں چار ہم پر — یاں تک ہماری پہونچی اب ناتوانیاں ہیں

ذیل کی پوری غزل میر کی معلوم ہوتی ہے۔

جب سے سنی ہے تیری حقیقت، چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا، آگے کو ہوئے کان بہیں
کچھ روزوں غفلت میں پھرے یاں، ڈھونڈھتے ہیں ہم آسائش کو
کس گئی جب دنیا کی حقیقت، کچھ نہ رہا خلجان ہمیں
غیر سے اب وہ بیر نہیں، اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی، یاں سمجھو تم مہمان ہمیں

تاہم میر کے نغمہ غمگیں اپنے درد و اثر میں حالی کی صدائے درد سے کہیں زیادہ ہیں۔

میر و غالب اور شیفتہ کے بعد حالی کے کلام میں رنگ مومن نمایاں ہے۔ جب حالی پہلی بار دلی پہونچے تو مومن کا انتقال ہو چکا تھا[1]، مگر استاد ذوق کے بعد مومن مرحوم کا کلام لوگوں کے دلوں پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ غالب کو تو عوام میں کیا خواص میں بھی مقبولیت نصیب نہیں تھی۔ حالی کا حالی بند کے کلام کا چلتا تھا اور دلوں پر قبضہ مومن کے کلام کا تھا۔ حالی نے تو مومن سے مل سکے [illegible] دلی سے واپسی کے بعد شیفتہ کی ہم نشینی اور صحبت سے رنگ مومن کا اثر ہوا اور باوجود [illegible] جذبات کی دنیا پر کیفیت اور رنگین ہو گئی۔

اک سادہ ورق تھی مرے جذبات کی دنیا — رنگیں ہوئی رنگین [illegible] سے تیرے

یہ ضرور ہے کہ حالی مذہب و تاکیب میں مومن کی طرح اتباع نہیں کرتے تھے، لیکن مومن کے مقابلہ میں ان کے کلام کی خوبی [illegible][2]

---

[1] مومن کا انتقال [illegible] میں ہوا تھا۔

[2] عروس ادب، ہوشس بگرامی (مومن و حالی صفحہ ۱۰۶)

یہاں غرض عوام نہیں بلکہ صرف رنگِ شاعری مقصود ہے اس لئے مومن کے رنگ کے چند اشعار پیش کیے ہیں۔

تم سنے کہ پاس نامۂ نامک عدا سے ہے — تا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
آوے ہے بے کسی وہ غلط آرزوئے قتل — کیا اعتبار زندگیٔ مستعار کا
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے — شکوے کو سنکے لیتے ہیں پیرو زبان کہاں
ہے بزم غیر کے مانع یاں فرق دیدہ بھی — جائے گا دیر چھوٹ کے یہ میہمان کہاں
تقاضائے محبت ہے وگرنہ — مجھے اور بھولتا تم پر گماں ہو
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے — ہم شکوہ ہائے غیر بھی ہنس کر سنا کیے

مومن کی طرح ان اشعار میں نزاکت و ندرت، حسن و عشق کے معاملات کا لطیف پیرایہ میں ذکر ہے اور مومن کا خاص انداز بیان ہے۔

یہ تو تھے اساتذہ جن کی تقلید و پیروی کر کے حالی نے اپنا رنگِ سخن علیحدہ قائم کیا، لیکن ان کے زمانے میں دلی اور لکھنؤ، رام پور اور حیدرآباد، لاہور اور عظیم آباد علم و ادب کے مرکز اور مخزن تھے۔ ہر جگہ نامی گرامی شعراء موجود تھے۔ جن کی بدولت شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ دلی اور لکھنؤ میں مشاعروں کی گرم بازاری تھی۔ شعراء اور ان کے تلامذہ کا چرچا رہتا تھا۔ حالی نے چند اربابِ کمال کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔ مثلاً ان کی رباعی ہے۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے نہ آذر باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

دلی کی تباہی پر جو غزل لکھی ہے اس میں کس حسرت و افسوس کے ساتھ کہتے ہیں۔

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و زار — اب دکھائے گا یہ شمعیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغ و بیخود دلی کے تھے لکھنؤ میں امیر — اور سخن کے تھے یہ اقلیم سخن کے سردار — یہ تینوں شعراء زبان کے ہم عصر تھے۔ شہرت و مقبولیت میں داغ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ داغ کے بعد امیر مینائی کی دھوم تھی۔ حالی دلی کے قدیم و جدید کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہ دلی کے بزرگ جدید لکھنؤ کے مغربی پیروی کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے، لیکن ان کے کلام میں معاصرین کے کلام کی خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے کلام کا یہ خاص انداز ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے مروجہ مقبول عام معائب سے اپنے کو محفوظ رکھا اور صرف محاسن ہی کو اپنایا۔

Marfat.com

حالی نے میر مہدی مجروح کو سراہا ہے۔ مجروح غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ غالب نے
نثر و نظم میں کتنے ہی فن بنانا چاہے تھے اور جہاں تک مجھے علم ہے، غالب کو مجروح کی صحبت
رشک آنے کا تاکید کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔

"میر مہدی مجروح ... آفریں ... سبز ... ! اگر دو عبارت گھنے کا ... ڈھنگ پیدا کیا
ہے تو ... آنے لگا۔"

لیکن شاعری میں ... تو کوئی ... غالب نے ... دی۔ یہ حقیقت ہے کہ مجروح ... کے کلام جیسی چٹخارے دار ... نہیں ہے۔ ان کی ہم طرح دو ہم مضمون غزلوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالی مجروح سے کہیں آگے ہیں، مثلاً حالی کا شعر ہے۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ ... مجھ نے

مجروح نے اسی قافیہ کو یوں استعمال کیا۔

... حوصلہ چاہیے ... کو ... کرنا

اسی غزل کا ایک ... ہے

حالی ... ہم کو ... گئے
مجروح ... وہ بھی ... رہا

ایک اور غزل میں کہا ... مجروح ...

کہتے ... ہے
مجروح ...
منحصر ...

غالب کی لفظ میں حالی مجروح کے مقابلہ میں اچھے شاعر تھے۔ اور ان میں شاعرانہ صلاحیتیں کافی تھیں۔

مولانا حالی نے داغ مرحوم کا بھی ذکر کیا ہے۔ داغ شہنشاہ تغزل ہیں اور اُن کا یہ دعوے بالکل بجا ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ — سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ کی شاعری کی مخالفت لکھنؤ میں کافی ہوئی۔ اور وہ بھی داغی شاعری کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ لیکن داغ حسن و عشق کی تصویر برابر کھینچتے رہے اور اپنے بانکپن شعر سے لوگوں کے دلوں کا شکار کرتے رہے۔ ان کے کلام کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ حالی بھی داغ سے متاثر تھے۔ انھوں نے داغ کے کلام پر کام کرنا شروع کر دیا تھا جو کسی وجہ سے پورا نہ ہو سکا[1]

ان کے دیوان میں متعدد غزلیں اسی ردیف و قافیہ اور بحر میں ہیں جن میں داغ نے کہی ہیں دونوں کا موازنہ یہ ثابت کرتا ہے کہ حالی بھی لذتِ عشق اور اثرِ حسن سے واقف تھے اور داغ کی طرح رد بھی نازک فکری میں مہارت رکھتے تھے۔ حالی کی مشہور غزل ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

داغ نے بھی اسی زمین میں غزل کہی۔ مطلع اور مقطع بہت اچھا ہے بلکہ داغ کا مطلع، حالی کے مطلع سے بڑھ گیا ہے۔

مانا کہ لطفِ عشق نہیں ہم مگر کہاں — کیا سوجھتا نہیں کہ پڑی ہے نظر کہاں

حامد حسن قادری کے الفاظ میں۔

"کیا خوب کہا: ہم مگر کہاں، اور کیا سوجھتا نہیں، تو داغ کے سوا مشکل سے کسی کا سوجھتا"[2]

طنز اور شوخیاں داغ کا خاص رنگ ہے۔ جب کہ حالی کا رنگ ہی دوسرا ہے۔

حالی کی ایک مشہور قدیم غزل ہے۔

رنگِ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا — جب دیکھتا ہے زور دلِ بے قرار کا

داغ نے بھی غزل لکھی مطلع ہے۔

کیا ہو سکے مقابلہ مژگانِ یار کا — دل ایک بانکا ہے جگر آبدار کا

اسی غزل کے کچھ اور اشعار دیکھئے۔ حالی

عذر گناہ کچھ بھی ہو تو غم نا گوار ہو — ملتا نہیں تحمل کارِ گناہ گار کا

داغ نے اس سے پیدا کی، دستِ روزگار میں لطف، اور کہا اس سے عجز کا رنگ ہے کہ اس میں

---

[1] خم خانۂ جاوید، حصہ دوم، صفحہ ۲۵۸۔

[2] عالمگیر لاہور خاص نمبر جنوری ۱۹۳۷ء (حالی کی غزل گوئی۔ حامد حسن قادری) صفحہ ۵۲۔

انداز جورِ یار ہے۔

انداز کچھ ملانے لگا جورِ یار کا　　اب لطف دیکھنا ستمِ روزگار کا

اسی غزل میں حالی کا مشہور شعر ہے۔

اک خوبی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب　　وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

اور مرزا داغ نے بیقراری میں بھی شوخی اور بانکپن کو قائم رکھا۔

فرقت میں ہم نے اپنی تسلی کے واسطے　　کھینچا تمام شوخ دلِ بے قرار کا

طور تھا، دور تھا، حالی کی مشہور غزل ہے۔ داغ نے بھی اسی ردیف و قافیہ میں غزل کہی ہے اور بھی حالی کی متانت داغ کی شوخی سے دب گئی ہے۔ حالی کا مطلع ہے۔

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا　　رخصت کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

لیکن داغ کا حوصلہ قابلِ داد ہے۔

یاں امتحان برقِ تجلی ضرور تھا　　کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا

حالی ہجر میں خوش رہنے ہی کو اپنی حوصلہ مندی و وارستگی سمجھتے ہیں لیکن داغ تمام تر بیقراری پر

حالی۔ حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شاد ماں　　تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا

داغ۔ کرنی پڑیں فراق میں تیار داریاں　　ہاتھوں میرا ہماری رفاقت نے بور تھا

حالی انتظار کرتے کرتے عاجز آ جاتے ہیں اور اس کے ماں سے خبردار کرتے ہیں۔

گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال　　سن لیں گے وہ تو شامِ شبِ انتظار سے

لیکن داغ انتظار کو لذتِ عشق کا ایک اہم جزو بتاتے ہیں۔ کیونکہ انتظار ہی وہ چیز ہے جو محبوب کو تڑپاتی ہے اسی لئے وہ انتظار یار کے ختم ہونے کا افسوس کرتے ہیں۔

رہتی تھی اس کی یاد وہ راتیں کدھر گئیں　　اب مجھ کو انتظار ہے شامِ فراق کا

کوئی شک نہیں کہ داغ کا رنگ تغزل حالی سے کہیں زیادہ شوخ ہے۔ مگر داغ و حالی دونوں (قدیم و جدید دونوں) کے قائل تھے۔ چنانچہ جب حالی نے جدید نظم کی تحریک شروع کی تو داغ ہی سب سے پہلے ان کی مدد کے لئے بڑھے۔

سب عارفوں کو حیرت اور منکروں کو شک　　ہر دل ہے آئینہ ترے جلوے کے سامنے

تو داغ مرحوم نے کہا

"مولانا! یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس رنگ میں آپ کا کوئی ہم نہیں"

لکھنؤ میں امیر مینائی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ داغ اور امیر کی چشمکیں ظہور میں آئیں۔

سلہ یادگار حالی، مرتبہ حالی، صفحہ ۱۰۰ بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد۔

پہلوانانِ سخن، اپنے اپنے فن کے کرتبوں سے، دلدادگانِ سخن کے دلوں کو متاثر کر رہے تھے، حالی بھی امیر کے کیف آور اور وجد آفریں نغموں سے آشنا تھے، امیر صوفی شاعر تھے، ان کا کلام زیادہ تر عارفانہ ہے، حالی بھی جہاں کہیں معرفت بیان کرتے ہیں، امیر کی پیروی کرتے ہیں۔ دونوں کے ہاں مذہبی روح بیدار ہے اور خلوص و عقیدت نمایاں ہے۔ حضرت امیر اہلِ زبان تھے اور انہیں اپنی زبان پر فخر بھی تھا۔

شاعری تھا امیر کی خاطر — میرا اپنی زبان چھوڑ گئے

داغ مرحوم باوجود معاصرانہ چشمک کے امیر مرحوم کو طوطیِ معجز بیاں اور استادِ زمانہ تسلیم کرتے ہیں۔

آج ہے یہ طوطیِ معجز بیاں — بلبلِ ہندوستاں کا ہم صفیر
ایسا استادِ زمانہ پھر کہاں — زندہ رکھ تو اس کو یا رب قدیر[1]

حالی اہلِ زبان تو نہ تھے، زبان داں ہونے کے مدعی بھی نہ تھے، لیکن امیر و حالی کی غزلوں میں زبان کے امتیازات کا تعین کرنا مشکل ہے، چند اشعار دیکھیے۔

حالی — پھر ہوا ہے دل کا کعبہ مطلعِ انوارِ دیر — چھپتا نہیں ہلال تمہارے شہید کا
امیر — آئینہ جیسے ہو شوقِ تجلی کے دید کا — ہے کوہِ طور ڈھیر تمہارے شہید کا

اس غزل میں قافیہ اور ردیف کا استعمال دونوں نے کیا ہے، معنی کے اعتبار سے حالی کا شعر امیر کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ حالی کہتے ہیں۔

دونوں جہاں کی رحمتِ وسیع تر — لا تقنطوا جواب ہے ھل من مزید کا

جیسا کہ امیر مرحوم رنج و تنگی کے چکر میں مبتلا ہو گئے۔

نکلیں دعائیں دل کی کروں گا جو میں سوال — نکلے گا جملہ جفر کا ھل من مزید کا

[illegible] طرح آزمائی کی ہے۔ حالی نے زندگی کا تجربہ بیان کیا ہے اور امیر نے

چھوڑا جب اس نے بھر وسا کلیر کا — محتاج قفلِ سیکڑہ تھا اس کلید کا

[illegible]

[illegible] — زدہ دیوار کی صورت نہ در کی صورت
[illegible] — کل نہ پہچان سکے گی تری گھر کی صورت
[illegible] — دیکھنا آپ کی اور اپنے گھر کی صورت

[illegible] (مطبوعہ ۱۹۱۸ء)

Marfat.com

اسی زمین میں امیر مرحوم کی بھی غزل ہے۔ ہم مضمون و ہم قافیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

رات دن کعبۂ دل میں ہے بتوں کا مجمع — کیا سے کیا ہو گئی اللہ کے گھر کی صورت

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے — تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

قبر میں چین سے یاروں کے گزرتی ہے امیر — پاؤں پھیلائے ہوئے موتے ہیں بستر کی صورت

مختصر یہ کہ حالی، غزل گوئی میں امیر سے کمتر نہیں ہیں۔

مجروح، داغ اور امیر جیسے اساتذہ کے مقابلہ میں حالی کا کلام ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے کہ اس میں بھرتی کے اشعار نہیں ہیں اور ایک شعر بھی مشکل سے ایسا نکلے گا جو بالکل پھیکا ہو۔ جب کہ اس عیب سے اُردو کا کوئی شاعر بجز خواجہ میر درد کے خالی نہیں ہے۔ مومن و غالب و ذوق کے کلام میں رطب و یابس کی کمی نہیں ہے۔ غالب کے متعلق تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے شعر کی بھی کنہ سے باتیں نہیں کرتے تھے۔

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم — سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

کبھی کبھی وہ جرأت بھی کر جاتے ہیں لیکن اس کے بعد اپنی جرأت پر خود بھی کانپ جاتے ہیں۔

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب — مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا حجاب تھا

وقت رخصت کی اضطرابی کیفیت اور غم انگیزی سے حالی بھی متاثر ہوئے ہیں۔

وقت رخصت تھا سخت حالی پر — ہم بھی بیٹھے تھے دو بدو لیکن

حالی کے اس اضطراب میں احساس ضبط، بہرحال موجود ہے لیکن مومن اضطراب میں ضبط کھو جاتے ہیں کہ خدا کو بھول کر پائے صنم پر سجدے کرنے لگتے ہیں۔

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع — مومن خدا کو بھول گیا اضطراب میں

حالی میں یہ کیفیت کسی حالت میں بھی پیدا نہیں ہوتی۔ انگریزی اور پرانی قدروں سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے مذہبی جذبات نے انھیں بے قابو کر پاتے ہیں۔ ان کے فن کو ان کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ان کے فن کا امتیاز غزلوں میں موجود ہے۔ حسرت و یاس کے [illegible]

مضمون کی حقیقت اور بیان کی متانت، جو ہر حالت میں [illegible]

مضمون کا منشا، یہ ہے کہ [illegible]

سلہ صحیفہ تا بیاض اردو۔ مجموعہ اکبر آبادی۔ صفحہ ۳۴۔

Marfat.com

کہ ان کے عکس میں تصنع کا شائبہ تک نہ ہو، اور "متانت بیان کا کمال یہ ہے کہ معاملات حسن و عشق کی تفصیل میں بھی بے پردگی اور بے باکی کا دخل نہ ہو۔ اسی لئے راقم کے خیال میں حالی کی عاشقانہ شاعری کا مرتبہ ان کی قومی شاعری سے بھی زیادہ بلند ہے اس لئے کہ صفات مذکورہ بالا کے جیسے اور جتنے دلپذیر نمونے غزلیات حالی میں موجود ہیں ویسے یا اتنے، ان کے دیوان کے مختلف میں نہیں ملتے[1]"

گو حالی "غزل کو صرف حدیث حسن و عشق قرار نہیں دیتے بلکہ اس میں اخلاقی، نیچرل، قومی اور سیاسی خیالات کا ادا کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں[2]"

فراق گورکھپوری حالی کی غزل گوئی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ حالی نے

"اردو غزل کو ایک ضمیر یا کانشنس دی، اسے نئی ذمہ داریوں سے روشناس کیا، اس کو احساس عمل دیا، دائمی تمثیلوں کے نئے نئے پہلو عطا کئے اور غزل کی روایات میں پہلے پہل وطن کی زندگی کی گونج سنائی دی اور اس میں ایک سماجی مافیہ (SOCIAL CONTENT) کو داخل کیا، اس میں ہندوستانیت، وطنیت، افادیت، مقصدیت، واقعیت اور سیاست کے عناصر شامل کئے اور سادگی و پرکاری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، مسلسل اور غیر مردف غزلوں کو رواج دیا اور اپنی غزلوں کو اس خود بینی و خود پرستی سے بالکل محفوظ اور پاک رکھا، جو رومانی تغزل یا جذباتی دبستان شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ اور جو دلکش ہوتے ہوئے بھی سمیت کے اثر سے محفوظ ہے[3]"

جن مضامین کو شعرا نے بے حجابانہ یا بے باکانہ بیان کر کے شرم و حیا کو طاق پر رکھ دیا اور اپنی اس معاملہ بندی، لذت پرستی، لفظی صنعت گری پر داد حاصل کی، حالی نے انھیں کو مہذب پیرایہ اور سیدھے سادے انداز میں بیان کیا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :-

"حالی کی غزلوں میں جذبات کی جیسی شائستگی، لہجہ کی نرمی، خیال کی پاکیزگی، بیان کی سادگی اور فن کی پختگی ملتی ہے اور شاعری و شرافت کا جیسا جیتا جاگتا توازن ملتا ہے وہ مجموعی طور پر کسی اور غزل گو کے یہاں مشکل سے ملے گا..... حالی غزل کے سارے لوازم برتتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو اس کے حدود سے باہر نہیں نکلنے دیتے[4]"

یہی وہ خوبی اور خصوصیت ہے جو حالی کے سوا دوسرے شاعر میں مشکل سے ملے گی۔ نیاز فتحپوری کے الفاظ میں

---

[1] تذکرۃ الشعراء۔ حسرت موہانی۔ صفحہ ۱۸۔

[2] جدید تاریخ اردو۔ اشرف علی خاں۔ صفحہ ۲۹۵ (مطبوعہ ۱۹۲۶ء آریہ نگر، لکھنؤ)

[3] اندازے۔ فراق گورکھپوری۔ (اقتباس) صفحہ ۲۸۵۔

[4] جدید غزل۔ رشید احمد صدیقی۔ صفحہ ۱۵-۱۶۔

Marfat.com

"غالب کے شاگرد دلدادہ خواجہ حالی صحیح رنگ تغزل کے سوا اور سے اپنا جواب نہ رکھتے تھے، سوز و گداز، شیرینی و سلاست، شادگی و تاثر، حقیقت نگاری جو غزل کی جان ہیں، ان کے ہاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں"

غرض حالی کی غزلیں

"اپنی نرم آہنگی، سکون، متانت اور عفت کے ساتھ [illegible]

صراری، نمائش اور بے باکی نہیں پائی جاتی"

حالی کا رنگ تغزل اس زمانہ میں بھی مقبول ہوا اور غزل کے شعرا کے لئے مینارۂ نور ثابت ہوا۔ جس کی روشنی میں غزل کی نئی نئی راہیں نظر آئیں اور شعرا ان راہوں پر بلا خوف و خطر گامزن ہو سکے۔ اس طرح حالی نے غزل کو نئی زندگی بخشنے کے لئے انقلاب انگیز [illegible]

قیس ہو، کوہکن ہو یا حالی
دشتی کچھ کسی کی داستان نہیں

اردو شاعری میں شیخ [illegible] دیا رسا [illegible] حالی کی بھی [illegible] پردے میں دل کی بھڑاس نکالی جاتی تھی اور ہر ہر ترد امنی کی دھجیاں اڑائی جاتی تھیں۔ حالی نے بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے مگر عام شعرا کے طلاقت ان کے یہاں تزلیل و تحقیر کم ہے، ان کی نظر میں سنجیدگی و بلکہ متانت کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ طنز و ظرافت سے [illegible] نے اپنے خیالات کا اظہار [illegible]

"بعض قطعات رباعیات میں اخلاقی مضامین کا [illegible] کہیں مطائبہ کی حد کو پہنچ گئے ہیں مگر اکثر [illegible] ان کے یہاں [illegible] وہ زاہد و صوفی کا [illegible] ہیں"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ ہیں واعظ [illegible]

سلہ [illegible]

سلہ تہذیب و [illegible]

سلہ [illegible]

Marfat.com

چھیڑ کر واعظ کو حالی حشر سے بستر کیوں اپنا پلوا رہے ہیں آپ

یہ جانتے ہوئے بھی حالی، واعظ کے راز ہائے دروں کا انکشاف کرنے سے باز نہیں آتے کیونکہ واعظ کی تلخ گوئی کو وہ برداشت نہیں کر پاتے، واعظ دوسروں کو برا کہتا ہے لیکن اپنے اعمال قبیحہ پر نظر نہیں رکھتا۔

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث
شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

لعن طعن کرنا تو زاہد و شیخ اور واعظ کا کام ہے۔ ادھر کسی غریب پر نظر پڑی ادھر ان کی زبانِ مبارک سے شستہ و پاکیزہ الفاظ کے پھول جھڑنے لگے اگر کبھی ان کی نظر جام کی طرف بھی ہوتا ہے تو شیخ فقرے چسپاں کرنے لگتا ہے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ [illegible] ہوتا ہے اس کے بعد متنفر ہو جاتا ہے، حالی نے زاہد کو اس کی خفیہ حرکات پر متنبہ کیا ہے۔

آنکھ بچتے تھے کبھی مسجد میں ہم تو نے زاہد ہم کو رسوا یا عبث

حالی نے زاہد و شیخ کی خوش اوصافی و شیریں بیانی پر ایک غزل مسبغت کہی ہے جس میں ان کے اقوال صادقہ اعمال صالحہ اور ارشادات عالیہ پر لطیف طنز کیا ہے اور ان کی ریاضت کا مذاق اڑایا ہے۔ شیخ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

رہا کوثر سے ہے جام مے بدل دیتا تمہیں بھی ہے کوئی یاد آنے والا شیخ
وہ نکلے میکدہ میں جو بناتے تھے اکسیر تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے [illegible] شیخ
کمال حسن عقیدت سے آپ بنتا حالی [illegible]

شیخ کی خلاقات کا انجام برا ہوتا ہے اور افسردہ دل ہو کر زاہد [illegible]

کیونکہ زاہد کا زہد نالشتی نکلا۔

ہم دعا دیں گے کہ زہد اور ہی کچھ اور سہی کچھ [illegible]
قرب حق کے لئے کچھ سوز نہاں بھی ہو ضرور خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے [illegible]

حالی زاہد کے زہد کو دینداری کے جال سے تشبیہ دیتے ہیں۔

جال جب تک ہے یہ پھیلا ہوا دینداری کا [illegible]

حالی نے ساری خدائی کی مخالفت برداشت کر لی مگر زاہد کی [illegible]

عیب حالی کے بہت آج کہے تو نے ولے [illegible]

[illegible]

واعظ میں کل کترتے ہیں [illegible] [illegible]

ہے نقیروں میں ہم میں نزاع ۔۔۔ ھل لنا فی نزاعنا من قاض
ہے یہ مضمون یا نکتہ زاہد ۔۔۔ فارکش تجھ سے ہے سوا مرتاض
شیخ کی نفی یا حضوری میں ۔۔۔ چاہئے زر تو اس سے کر اعراض

ایک غزل میں واعظ کے خلاف صاف کہتے ہیں۔

کوئی بات ایسی نہیں تجھ میں لیکن ۔۔۔ سُنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ
یہ داڑھی، یہ تسبیح کرتے ہیں بدظن ۔۔۔ یہ جبہ، یہ ریش اور یہ دستار واعظ

محتسب بھی، شیخ و زاہد، واعظ و فقیہ کا ہم مشرب ہے۔ اس کی وجہ سے صحبت رنداں ہمیشہ درہم برہم رہتی ہے۔ حالی نے محتسب کو باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔

محتسب اصدق و صفا یاں ہے انھیں کے دم تک ۔۔۔ مصلحت برہمی صحبت رنداں میں نہیں

کہیں کہیں حالی کا طنز زیادہ تیز اور شوخ ہو گیا ہے۔ اور اکبر مرحوم کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

اپنی سیوں سے ہیں سوائے نمازی بیزار ۔۔۔ اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے ۔۔۔ یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

لیکن حالی کا یہ رنگ نہیں ہے، شوخی و ظرافت سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں بلکہ کسی حد تک لاگ ہے۔ اور

"انھوں نے ظرافت کو ہنسوڑپن یا ہزل گوئی یا فواحشات کی حد تک نہیں جانے دیا بلکہ بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی کو ایک حد رکھا۔ علیحدہ ظرافت کی تصویر تحقیق کر دکھا دی اور اس کو متانت کی وہ صورت بنا دی جس پر سے ہزاروں شوخیاں قربان کی جا سکتی ہیں[1]"

غرض حالی کا طنز بھی اصلاحی پہلو لئے ہوئے ہے، اس میں اکبر مرحوم کی طرح شوخی، تیزی اور بیباکی نہیں ہے لیکن اس سے ان کے طنز کی اہمیت اور تاثیر کم نہیں ہوتی بلکہ ان کا طنز وعظ و نصیحت کی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ شرافت کا اچھا نمونہ ہے۔

حالی کے کلام میں معرفت و تصوف کی جو چاشنی موجود ہے وہ ایک رند شاہد باز کے لئے سوزش پاکبازی رکھتی ہے۔ ان کے تصوف میں فلسفہ کی موشگافیاں نہیں ہیں سچائی، خلوص، عقیدت ہے۔ پاکبازی اور خاکساری سے انھیں نفرت ہے اور نام نہاد صوفیوں کا عمل دخل تھا انھوں نے شیخ و صوفی، واعظ و پارسا پر اسی خیال کے تحت طنز کیا ہے۔ ان کے یہاں تصوف کے عام بنیادی مسائل مثلاً وجود باری تعالیٰ، وحدانیت، ربانیت الٰہی، مفاسد مادیت، سلوک، ہمہ اوست، ہمہ از اوست، جبر و قدر، تزکیۂ نفس وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

---

[1] یادگار حالی، عبدالباری آسی، صفحہ ۱۹۱، مطبوعہ ۱۹۲۹ء یا ۱۹۲۹ء (کیونکہ سن طباعت ۱۹۲۹ء درج ہے جو قطعاً غلط ہے۔

Marfat.com

امتحانم کے اشعار زیادہ تر غزلوں میں ہیں لیکن رباعیات اور قطعات میں بھی موجود ہیں خصوصاً رباعیات میں تصوف و معرفت کا زیادہ ذکر ہے۔ وجود باری تعالےٰ پر یہ رباعی مشہور ہے۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہریہ نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

منکرین خدا کے لئے حالی کی یہ دلیل کتنی قوی ہے؟

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے　　جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

اکبر الہ آبادی نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

گھر گیا جو عقل میں لا انتہا کیونکر ہوا　　جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

بار امانت الٰہی کا سوائے حضرت انسان کے اور کوئی متحمل نہ ہو سکا، یہ مسئلہ تمام شعراء کا خاص موضوع رہا ہے۔ فارسی کا یہ شعر تو زبان زد خاص و عام ہے۔

آسماں بار امانت نہ توانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

میر صاحب نے اسی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

لیکن حالی نے اس کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔

گو جانتے تھے تند و تیز بہت ساقی کے ہاتھ ہم　　لے شیخ بن پڑے گی: سنبھالا کیے بغیر

چند اور اشعار دیکھیے۔

وصل کا اس کے دل زار تمنائی ہے　　نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
نہ بیانا آشنا زمانے سے　　حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر
تھے بہت بے درد لیکن حالی کا　　اور ہم کو نہیں گویائی کا ڈھب
تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں　　ہر خار نخل ایمن و ہر کوہ طور تھا
دیا اپنا دل جس کو وہ اک نکیلا تو　　کھیلا ہوا دل سے تجھ کو گلا بن گیا

حالی نے تصوف اور معرفت کے بہت سے نکات اپنے اشعار میں بیان کئے ہیں اور ان کے [illegible] رنگ و غنا کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

تصوف کا ایک اہم مسئلہ سلوک ہے، سالک خدا کی جستجو میں راہ سلوک طے کرتا ہے، اور ہر قسم کی مصیبت کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، اس کی طلب صادق اسے منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہے اور جب دیدار حبیب نصیب ہوتا ہے تو پھر ہوش و حواس بھی غائب ہو جاتے ہیں

حالی، کلیات حالی، مرتبہ صفحہ ۶۶۔ ۶۷۔ (مطبوعہ ۱۹۶۸ء)

Marfat.com

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے راز تیرا
ملا نہ کھوج اس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈھا ہزار دیکھا

داغ مرحوم نے بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

اسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

نفس امّارہ کی سرکوبی کرنا، صوفی کا پہلا فرض ہے کیونکہ نفس ہی بندہ کو خدا سے جدا کر دیتا ہے، حالی نے نفس پر متعدد اشعار لکھے ہیں۔

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

نفس پر قابو بغیر اہل صفا کی محبت کے ناممکن ہے۔ صحبتِ با اولیا، پر ہر صوفی شاعر نے زور دیا ہے اور مولانا روم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

یک زمانہ صحبتِ با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حالی ان پاک نفوس کی صحبت کے اثرات و فیوض سے اتنے باخبر تھے کہ ان کی زبان بیان نہیں کر سکتی۔

زباں تقریر سے قاصر، قلم تحریر سے عاجز نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

حالی کے متصوفانہ کلام و خیالات میں غالب جیسی پیچیدگی اور گہرائی نہیں ہے وہ خود سیدھے سادے فرشتہ خصلت، نیک سیرت، پاک باطن اور صاحب دل انسان تھے، اسی لئے انھوں نے مسائل تصوف سیدھے سادے انداز میں بیان کئے ہیں اور وہ

"اس خصوصیت خاص میں اپنے استاد سے بھی پیش پیش ہیں"[1]

ذیل کے اشعار میں سادگی کے ساتھ کیسے کیسے مسائل بیان کئے ہیں؟

آفاق میں پھیلے گی کب تک مہک تیری گھر گھر لئے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ذرہ ذرہ ہے مظہر خورشید دیکھ لے آنکھ دن ہے رات نہیں

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر تم میں ہے رد پئے گل نسرین و سمن کس کا ہے

غم و [illegible] مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ دل دکھاتے ہیں وہی جن [illegible]

تھا جز غم بساطِ عاشق میں غم کو راحت فزا کیا تو نے

صادق قریشی لکھتے ہیں کہ

"شعر شروع شروع کی چند غزلیں عام زمانہ کی روش کے مطابق مجازی رنگ میں کہی گئی ہیں، باقی تمام کلام عارفانہ ہے اور حسن و عشق کے تذکروں میں اس نے فنا اور اس کے

---

[1] زمانہ، کانپور، حالی نمبر، صفحہ ۴۳ (حالی اور تصوف، مائل صدر انجمن اردو بھوپال)

Marfat.com

طالب کے تعلقات جستجو اور کاوشوں کو بیان کیا ہے[1]۔"

حالی کی شاعری کا آخری دور دل کی رام کہانی سے خالی ہے۔ یہ کہانی انھوں نے خود چھیڑی یا زمانے کے حالات و انقلابات نے ترک کرنے پر مجبور کر دیا، یا دیرینہ سال پیر کی کیمیا اثر صحبت نے سب کچھ بھلا دیا؟ وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وقت کی راگنی نے بزم شعراء میں شعر خوانی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میر نے تو یہ کہہ کر عشق سے فراغت حاصل کر لی تھی۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اور حالی بھی غزل گوئی کو بے وقت کی راگنی کہہ کر بہت جلد تا سپا عشق کھو بیٹھے۔ ۱۸۹۳ء کے بعد انھوں نے غزل گوئی قریب قریب ترک کر دی۔ اس زمانہ کی غزلوں میں کیف و سرور اور دل کشی و رعنائی کی کمی ہے، ان کی ہیئت ضرور غزل کی ہے لیکن ان میں نہ وہ اگلی سی روح ہے نہ تڑپ اور نہ سوز۔ ڈاکٹر اعجاز حسین فرماتے ہیں:—

"جدید غزلوں میں حالی نے نئی مہم سر کرنی چاہی، مگر شگفتگی و سدمست اور غزلوں کا فطری لب و لہجہ بہت کم قائم رکھ سکے، ان غزلوں کی حیثیت ایک ادبی تجربہ سے زیادہ نہ بڑھ سکی[2]۔"

اور "ان کی ساری اگلی نغز سرائی، پند سرائی ہو کر رہ گئی[3]۔"

اس کا احساس خود حالی کو بھی تھا۔ کس حسرت کے ساتھ کہہ رہے ہیں

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی تھیں سخنور کے لئے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گراتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلہ پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجال نعت اس محفل میں کم راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

حالی نے قوم کے اقبال کا ماتم ۱۸۷۹ء سے شروع کر کے تمام عمر جاری رکھا۔ وہ اس قومی مرثیہ خوانی کے موجد تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں۔

"اب جو نئی قسم کے مرثیہ خواں چلے تو اس کے موجد ہوئے ہمارے مولوی الطاف حسین صاحب

---

[1] ذکر حالی، صادق قریشی، صفحہ ۲۷۔۳۰۔ [2] مختصر تاریخ ادب اردو، صفحہ ۱۳۰۔

[3] نقوش و افکار، صفحہ ۲۲۵۔

Marfat.com

حالی ..... میں نہیں سمجھتا کہ (انھوں نے) مسدس اس غرض سے کہا تھا کہ ایشیائی شاعری میں ایک
طرز جدید داخل کریں بلکہ اُن کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوتی ہوئی قوم جاگے اور دیکھے کہ دنیا کی رفتار
اُن کے سروں پر آپہونچا مگر قوم نے جاگنا تو درکنار کروٹ تک بھی تو نہ لی۔"[1]

یہ حقیقت ہے کہ حالی نے نظم نگاری قوم کی بیداری کے لئے شروع کی تھی کیونکہ انھیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ نثر کے مقابلہ میں نظم کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور قوم کی ترقی و تعمیر میں شاعری کا خاصا اہم حصہ رہا ہے۔ اسی لئے وہ ہر کانفرنس میں کوئی نہ کوئی نظم ضرور پڑھتے تھے، ان کی زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جو کانفرنس کے موقع پر پڑھی گئی تھیں۔ ان کی منظومات

"اردو شاعری میں ایک تحریک اور ایک رجحان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے لئے
نئی راہیں تعمیر کی ہیں اور اس کو نئی منزلوں سے ہم کنار کیا ہے۔"[2]

لیکن اگر ان کی "نظمیں دیکھی جائیں تو اندازہ ہوگا کہ جہاں خیالات میں تغیرات ہوئے وہاں نظم کی ہیئت میں بہت سی تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ بنے بنائے فارم کام میں لائے گئے اور ہوتا بھی یہی ہے۔ ہیئت میں جلد جلد تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسلوب اور انداز، رموز اور علامات، احساس فن اور ذوق نظر
وہاں جاما ہے۔"[3]

خود مولانا حالی بھی اسی خیال کے حامی تھے، جس کا اظہار [illegible] دیباچہ دیوان حالی اور دیباچہ
نظم حالی میں کیا ہے۔

بہترین نظم کس کو کہیں گے؟ اور نظم کے اصول فنی کے لحاظ سے کیا کیا ہیں؟ اس اور اسی سے
[illegible] پر مفصل بحث کی ہے۔ مختصر یہ کہ

[illegible] نظم کا کل حسن و [illegible]

[illegible] مجموعہ [illegible] صفحہ [illegible]

[2] نظم جدید [illegible] اردو نظم طباطبائی و فنی ارتقاء [illegible]

[3] [illegible]

Marfat.com

حالی کی نظم نگاری مذکورۂ بالا اصول کی پابند ہے۔ ان کی نظمیں فن کا مکمل نمونہ ہیں اور وہ ان کے گہرے سیاسی شعور، اور سماجی بصیرت کا آئینہ ہیں۔ ان کے زمانہ میں مغربی تعلیم اور تہذیب کے اثر سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ انقلاب اور کشمکش کا دَور تھا، انھوں نے ان تمام مسائل کی اہمیت کو محسوس کیا اور اُردو شاعری میں ان کو بیان کرنا ضروری سمجھا، کسی دوسرے شاعر کو یہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ نظم میں ان مسائل اور حقائق پر اس طرح روشنی ڈالے کہ دوسروں پر اثر ہو۔ حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کو زمانہ کے موافق کرنے کے لئے اپنا نظریہ پیش کیا، اس پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام سخت مشکل تھا۔ یہ حالی کی ہمت تھی جو انھوں نے، ایسے دشوار کام کا بیڑا اُٹھایا، ان کی فنکارانہ پختگی، ان کی ادبی بصیرت اور ان کی شاعرانہ فطرت نے انھیں کامیاب کیا۔ انھوں نے غزل، مثنوی، مرثیہ اور مسدس ہی پر قناعت نہیں کی، بلکہ شاعری کی دیگر اصناف سخن، ترکیب بند، قطعہ وغیرہ کو حیات بخشی۔ حالی سے پہلے نظیر اکبر آبادی کو چھوڑ کر موخر الذکر اصناف سخن کو بہت کم شعراء نے شعوری طور پر استعمال کیا۔ حالی نے نظیر اکبر آبادی کی طرح اپنے موضوع میں بھی وسعت دی۔ اسی لئے ان دونوں میں خاص مماثلت بھی ہے۔ حالی کی طرح نظیر بھی سچائی، واقعہ نگاری اور حقیقت پسندی کے شاعر ہیں اور ان کا کلام بھی زندگی اور عوام کے رجحانات کا ترجمان ہے۔ زبان کے اعتبار سے حالی نظیر سے بہت آگے ہیں۔ نظیر الفاظ کے رکھ رکھاؤ کے پابند نہیں ہیں اور اپنے خیالات کے اظہار کے لئے دستیاب اور مروج بلکہ عریاں الفاظ کا استعمال کر جاتے ہیں۔ جب کہ حالی کسی حالت میں بھی ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے جن میں ابتذال یا رکاکت کا شائبہ تک ہو۔ اسی لئے حالی، موضوع، مواد، زبان و بیان کے اعتبار سے جدید نظم نگاری کے بادا آدم ہیں۔

ان کی نظموں کی افادیت مسلم ہے۔ انھوں نے افادی پہلو کو مدنظر رکھ کر شاعری کی، اُردو شاعری میں یہ نظریہ تقریباً بالکل نیا تھا۔ حالی کو اس میں اولیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے افادی رجحانات اُردو میں پیش کئے اور کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے متعدد لکچروں میں ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ وہ حالی کے کلام کے سامنے اپنا کلام ہیچ سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ :—

"مولوی الطاف حسین حالی نے نظم کا رنگ بدل دیا ہے اور شاعری اگلی گندگی اور بیہودگی سے بہت کچھ پاک ہو گئی ہے[۵۱]"

یہ حالی ہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ :—

"ایشیائی شاعری کی شان تہذیب کے ٹھکانے پر آتی جاتی ہے[۵۲]"

---

۵۱ مجموعۂ لکچر، جلد دوم، صفحہ ۶، ۵۲ مجموعۂ لکچر، جلد دوم، صفحہ ۳۸۹۔

Marfat.com

علامہ نذیر احمد کا یہ اعترافِ حقیقت بھی قابلِ تعریف ہے۔

تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو نذیر احمد کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی[1]

فنی اعتبار سے بھی حالی کی نظمیں منفرد ہیں، ان میں تاثیر، شعریت اور موزونیت کی کمی نہیں ہے اگرچہ بعض مقامات پر خصوصاً قطعات ہیں، روانی اور سلاست کم ہو جاتی ہے اور ان میں تناسبِ الفاظ اور فصاحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ لیکن اس خامی سے ان کے ماہر فن ہونے پر حرف نہیں آتا۔ انھوں نے اپنے کلام میں حسبِ موقع تشبیہ، استعارے اور دیگر صنائع و بدائع کا استعمال کیا ہے، وہ بعید الفہم دور از کار اور خیالی تشبیہوں اور استعاروں سے کام نہیں لیتے، لیکن ان کے ذریعے سے وہ رموز و نکات بڑی خوبی سے بیان کر جاتے ہیں۔ زبان کا جادو اور بیان کی خوبی نیز ان دونوں کے باہمی امتزاج سے جو اثرات دلوں پر مترتب ہوتے ہیں وہ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:۔

"ادبی اعتبار سے ان نظموں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ انھوں نے شاعری کی ساری غیر ضروری حد بندیاں توڑ دیں اور اسے ہر قسم کے افکار، مسائل، جذبات و احساسات کی ترجمان بنایا۔ اب شاعری عشق کی سرگوشی نہیں تھی بلکہ زندگی کے سارے شعبوں کی آواز تھی اور اس کی آواز کو سوز و گداز، جذبے کے خلوص، اور شخصیت کی آنچ نے تیز کر کے لازوال رنگ و روغن بخشا گیا تھا۔ انداز بیان کے اعتبار سے نیچرل شاعری کے قائلوں کے پیشِ نظر حالی نے شاعری و حسنِ تشبیہ و استعارہ یا خیال بندی کے بغیر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا فن ہیروی آراستگی اور آرائش و زیبائش کا فن نہیں ہے بلکہ اندرونی تب و تاب کا فن ہے جو خیال کے کمال، فکر کی آنچ سے پیدا ہوتا ہے وہ تصنع کے قائل نہیں بلکہ ایسے سادہ حسن کے قائل ہیں جو غازہ اور زیور سے کم و بیش سے نیاز ہے۔"[2]

غرض ان نظموں میں حالی کا فن اور ان کی شعری نظر اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ ان میں خلوص، وسعت، ہمہ گیری سب کچھ موجود ہے اور یہ نظمیں اردو شاعری کی [illegible] ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان نظموں سے اردو [illegible] لکھی گئی ہیں [illegible] اسی سے ان کی اہمیت [illegible]

ڈاکٹر اعجاز حسین نے حالی کی نظموں کے سلسلہ میں مختصر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

---

[1] مجموعہ نیچر، جلد دوم، صفحہ ۴۰۔

[2] اجمل، دیباچہ نظم مسدس حالی، مرتبہ نظامی، صفحہ ۵۔ نقار۔ ڈاکٹر محمد حسن، صفحہ ۸۔

نئے عنوانوں کے علاوہ ان کی نظموں میں سادگی، روانی، تسلسل، اور ایک بڑی حد تک ہمواری، یکسانیت، اور یک رنگی موجود ہے۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ قومیت، اظہار شخصیت، وسعت نظر، صداقت پسندی، جذبۂ ہمدردی اور کہیں کہیں سادگی اور بے تکلف سرمستی، کلام میں خاص دلکشی پیدا کرتی ہیں[1]۔"

اس طرح حالی کی نظموں کی انفرادیت مسلم ہے۔ یہ انفرادیت اکتسابی بھی ہے اور وہبی بھی۔ ان کی سلیم الفطرتی نے شاعری کی فرسودہ و پامال اور عام روش کو قبول نہیں کیا، لیکن ماحول کے اثرات پر بھی نظر رکھی، یہ حالی کے حق میں مفید ہوا، اگرچہ انھیں ماحول کی گندگی اور اردو شاعری کی عفونت کا ذاتی طور پر تجربہ ہوا اور وہ دونوں کے نتائج اور اثرات سے باخبر ہوئے، لیکن ان کی فطری سنجیدگی اور متانت نے انھیں بوالہوسی اور لذت پرستی سے باز رکھا۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:—

"اگرچہ حالی کی طبیعت بالقوۃ انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی، اور ان کی فطرت میں عجز و خاکساری، سنجیدگی و متانت، حد سے زیادہ تھی، لیکن زمانے کے طوفان اور جوانی کے ہیجان نے انھیں بھی اس چکر میں ڈال دیا۔ تاہم حالی کی صلاحیت طبع نے اور غالب و شیفتہ کے فیض تربیت نے انھیں بہت کچھ سنبھالے رکھا[2]۔"

اور یہ حالی کی فطری صلاحیت اور اساتذہ کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ وہ نہ صرف خود عمر بھر سنبھلے رہے بلکہ انھوں نے دوسروں کو بھی سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہی جرعۂ سخن جو دوسروں کو بدمست و بے خود بنا دیا کرتا تھا۔ حالی کو ہوش و گوش، دانائی و بصیرت عطا کرتا تھا۔ بزم رندان سخن میں "تنہا وہی رند پاکباز اور ہوشیار تھے" دمے سخن کی تیزی، اور اہل بزم کی تنگ ظرفی سے بے خبر نہیں تھے۔ اور اردو شاعری کے زہریلے اثرات سے بھی واقف تھے۔ مغربی ادب کے مطالعے نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں وہ شاعری سے پیغمبری کا کام لینا چاہتے تھے، اس کے لیے صبر و تحمل، ہمت و استقلال، دلسوزی و دردمندی، خلوص و محبت کے ساتھ ساتھ زبان میں شیرینی، بیان میں دلکشی، قلب میں وسعت، نگاہ میں بصیرت، فطرت انسانی سے واقفیت، اور فلسفۂ ترقی سے آگاہی کی ضرورت تھی۔ حالی نے یہ تمام خصوصیات اپنے اندر پیدا کیں۔ جب پورا معاشرہ عشق و حسن اور لذت کوشی میں مبتلا ہو اور عاشقانہ غزل کے ایک ایک لفظ پر جان فدا کر رہا ہو اس وقت غزل کو بے وقت کی راگنی کہنا، حالی ہی جیسے دیدہ ور کا حوصلہ ہو سکتا ہے۔

"بیسویں صدی کے ارباب بصیرت میں وہ پہلا مبصر ہے جس نے قدامت کے فرسودہ [illegible] اختراع کے راستے پر قدم اٹھایا[3]۔"

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو، صفحہ ۲۲۱ [2] مضامین حالی صفحہ ۳۰ [3] سفینہ تاریخ [illegible] صفحہ ۲۲۸-۲۲۹

یہ بڑی ہمت کا کام تھا، حالی کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں

حالی کیے گا کاٹے ہی سے یہ بے ستوں حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر

اور انھیں اپنے خلوص، اپنی دردمندی اور سچائی کی کامیابی کا یقین تھا۔

"امید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا"[۵۱]

ان کی یہ امید پوری ہوئی۔ ان کا درد پھیلا اور ان کی صداقت آمیز صدا نے ہر دل کو درد آشنا بنا دیا۔

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

حالی کی بیدار کن صدا نے، سب کو خوابِ غفلت سے جگا دیا۔ اس نے شاعری میں افادیت کو سمو کر انفرادیت حاصل کر لی۔

"اس نے اپنی بصیرت، اپنے مشاہدے سے، اپنے تجربے کے نتیجے اُردو شعر میں سمو کر اس کو نہ صرف اصلاحی و تعمیری قدر سے مالا مال کر دیا بلکہ معیاری و کائناتی بھی بنا دیا۔"

انھوں نے

"غزلوں میں جو سفر شروع کیا تھا وہ نظموں کی منزل پر آ کر ختم ہو گیا۔ اس سفر میں انھوں نے اپنی غزلوں کے پھولوں کو روند ڈالا، مگر ان پھولوں کی تازگی اب بھی باقی ہے۔ ان سے ہماری شاعری میں بانکل نئے پھول کھل اُٹھے، جن کی خوشبو ہر دور میں ہمارے ادب اور ہماری زندگی کو فرحت بخشتی رہے گی"[۵۲]

مولانا حالی نے اُردو شاعری کو نغمۂ عشق کے بجائے آہنگِ عمل سے روشناس کیا، اور اُسے قومی و ملی، وطنی و ملکی، اخلاقی و اصلاحی، علمی و ادبی، سیاسی و سماجی کاموں کے لیے مفید بنایا۔ ان کی شاعری میں آفاقیت اور تحیر کم سہی لیکن واقعیت Realism اور عقلیت Rationalism (سرسید) نمایاں ہے۔ اس لئے اس میں افادیت بھی زیادہ ہے۔

"انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری کو طاق پر اسی لئے رکھ دیا تاکہ ایسی شاعری جنم لے سکے جو ملکی مسائل سے آنکھ ملا سکے۔ جس میں نئے عزائم اور نئے حوصلے ہوں۔ ان کا یہ اقدام ہماری [illegible] تاریخ میں جرأت اور ایثار کی بنا پر اپنی نظیر آپ ہے۔ اُس وقت کے حالات [illegible] شعور کا نتیجہ تھا۔ ان کا یہ قدم ایک انقلابی آگ [illegible] روشن ہے۔ اس کی لَو [illegible] ہمیشہ چمکتی رہے گی"[۵۳]

ان میں یہ جرأت و حوصلہ ان کے دل کی دردمندی نے پیدا کیا اور اس دردمندی میں اضافہ [illegible]

---

۵۱ دیباچہ دوم، مسدس حالی۔

۵۲ سید، تاریخ اُردو، مخمور اکبر آبادی، صفحہ ۳۳۶-۳۲۰

۵۳ [illegible] تہذیب، [illegible] صفحہ ۱۹۰-۱۹۱

Marfat.com

ملتِ اسلامیہ نے کیا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :۔

"تہذیب اور تاریخ کا پورا سوادِ اعظم حالی نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا اور اس کھنڈر پر حالی بے پایاں انسانی ہمدردی، دردمندی اور غیرت قومی کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھیوں کی غفلت اور خفیف الحرکاتی پر آنسو بہاتے ہیں۔ سوادِ رومۃ الکبریٰ میں اقبال، حالی ہی کی آواز بازگشت ہیں۔"[1]

یہی ایک خصوصیت ان کو دوسرے تمام شعرا میں ممتاز و منفرد کرتی ہے، غالب کے بہت سے شاگرد تھے اور ان میں سے اکثر اپنے زمانہ میں حالی سے زیادہ شہرت و مقبولیت رکھتے تھے، لیکن زندگی اور بقا صرف حالی کے کلام کو نصیب ہوئی۔ آج غالب کے تلامذہ کا نام محض استاد کی وجہ سے باقی ہے۔ ان کے کلام سے بہت کم حضرات واقف ہیں، کیا بات تھی جو حالی کو شہرت دوام اور بقا نصیب ہوئی؟ کیا یہ محض غالب کی شاگردی کی وجہ سے ہے؟ یا شیفتہ کی صحبت کا اثر ہے؟ یا سرسید کے "تاریخ ساز" ہونے کا ثمرہ ہے؟ میرے نزدیک یہ تینوں باتیں ان کی منفرد حیثیت قائم کرنے میں معاون ضرور ہیں، لیکن ان کی انفرادیت صرف انھیں بزرگوں کی تعلیم و صحبت کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ اگر یہی ہوتا، تو غالب کے شاگردوں میں، شیفتہ کے دوستوں میں اور سرسید کے رفیقوں میں، حالی سے کہیں زیادہ ذہین، طباع، قابل اور بلند مرتبہ حضرات موجود تھے جنھیں اردو شعر و ادب میں خاص مقام حاصل تھا اور شعر و شاعری میں جن کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ لیکن ان کی گمنامی ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ حضرات زیادہ تر غزل گوئی میں مبتلا رہے اور اسی میں کامیاب ہوئے۔ بعض نے عصری رجحانات کو شاعری میں سمونے کی کوشش کی اور کسی حد تک ان کا کلام اس زمانے میں مقبولِ عام بھی ہوا لیکن اس میں وہ جان اور روح نہیں ہے، جو لوگوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے، جو اپنے اثرات نفسوں میں چھوڑ جاتی ہے، اور جس کی صدائے بازگشت، ہر آنے والی نسل کے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ مثال میں ڈاکٹر نذیر احمد کی نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بے مثل خطیب اور لاجواب مقرر تھے، ان کی تقریریں جادو تھا جو سنتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا لیکن نثر، نثر ہی ہے اور نظم، نظم ہی۔ نظموں کا اثر کافی ہوتا اور دیر تک رہتا، حالی اور شبلی اور دوسرے ممتاز شعرا نظمیں پڑھتے، ڈاکٹر نذیر احمد بھی لکچر شروع کرنے سے پہلے کوئی نہ کوئی نظم ضرور پڑھتے تاکہ ان کی تقریر کا اثر بڑھ جائے۔ شبلی مرحوم نے ان کی نظم خوانی کی تعریف بھی کی ہے۔

نگہ از مہر سوئے حالی آزاد افگن — ایں نذیر احمد خوش فکر چہ بنگر[2]

---

[1] فکر و نظر (صفحہ ۲۰ (جدید غزل۔ رشید احمد صدیقی) ادارہ ادب۔ علی گڑھ ۱۹۵۳ء

[2] کلیات نظم شبلی، الناظر پریس لکھنؤ۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی نظموں کا مجموعہ "نظم بے نظیر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

Marfat.com

لیکن آج اس طوطی شکر خا کی نظمیں گوشۂ گمنامی میں ہیں۔ کون جانتا ہے کہ علامہ نذیر احمد بے مثل نثر نگار کے ساتھ ساتھ اچھے نظم نگار بھی تھے۔ اسی طرح علامہ شبلی بھی نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں ہیں، حالانکہ ان کی نظمیں اپنی دلکشی اور تاثیر میں حالی کی نظموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری دیوان کے اندر محفوظ ہے۔ وہ صرف اپنی ریڈروں کی وجہ سے زندہ ہیں کوئی جانتا بھی نہیں کہ مولوی صاحب مرزا غالب کے شاگرد، اور اپنے زمانے کے ترقی پسند شاعر تھے، پس اگر حالی کی شاعری کی شہرت اور ریٹا کا انھیں اکابر خلاف کا مرہون منت ہوتا تو حالی کے ہم عصر حریف ان سے بڑھ چڑھ کر نامور اور مشہور ہوتے اس لئے یہ لازمی ہے کہ حالی میں خدا داد صلاحیتیں تھیں جن کی بدولت وہ بگڑے ہوئے ماحول میں بھی سنبھلے رہے، قدرت نے انھیں اکتساب فیض کی قوت دی تھی، خوب سے خوب تر کی جستجو کا جذبہ عطا کیا تھا۔ تحقیق و تخلیق کا مادہ دیا تھا، ان کی طبیعت محنت پسند تھی، مزاج میں استقلال تھا۔ ذہن میں بالیدگی اور پاکیزگی تھی، دور اندیشی اور دور بینی تھی مگر ان سب سے بڑھ کر ان کے اندر خلوص و محبت، دردمندی و دلسوزی، ایثار و قربانی، اخوت و ہمدردی کا بے پناہ جذبہ تھا جو اشعار کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا رہتا تھا، ان سب عوامل نے مل ملا کر حالی کو اردو شاعری میں منفرد و یگانہ بنا دیا۔ ورنہ

"ان کی طبیعت بے حد حکیمانہ واقع ہوئی تھی، ان میں تخیل سے زیادہ مشاہدہ اور احساس سے زیادہ عقل کی قوتیں کام کر رہی تھیں۔ نشاۃ ثانیہ کی طرح شاعری میں بھی وہ ایک حد تک منطقی رنگ کے اندر رہنے کی کوشش کرتے۔ ایسی طبیعت کا مالک عموماً [illegible] نہیں ہو سکتا۔ شاعر کا احساس اور تخیل اگر اس کی عقل سے زیادہ قوی نہیں تو کم بھی نہ ہونا چاہیئے ورنہ شعر کے لحاظ سے اس کے کارنامے مشکل سے دوسرے درجہ تک پہونچ سکتے ہیں۔ لیکن حالی کی مخصوص مثال میں پیہم مشق اور صحیح ذوق کے شعری کارناموں کو بلند رتبہ عطا کرنے میں بہت کارگر ثابت ہوئے۔"[1]

لیکن حالی کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے عقلیت کی پابندی کرتے ہوئے احساس اور تخیل کی [illegible] و نفاست پر آنچ نہیں آنے دی، ان کو

"جو چیز دوسرے اردو شاعروں سے ممتاز رکھے گی وہ عقل و جذبات [illegible] یک توازن ہے۔"[2]

وہ مشاہدہ اور عقل کی قوتوں کو احساس و تخیل میں سمونے کے فن کو جانتے ہیں۔ وہ فن یا موضوع کے

---

[1] جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، صفحہ ۹۸۔

[2] ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری، صفحہ ۱۲۷۔

Marfat.com

قابو میں نہیں گئے، بلکہ فن اور موضوع کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ اور یہ

"اس وقت تک ممکن نہیں جب تک شاعر خود اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکے"[۵۱]

حالی کو جس طرح اپنے اوپر پورا پورا قابو تھا اسی طرح شاعری پر بھی۔ انھوں نے شاعری میں رنگین بیانی بھی کی اور سادگی بھی اختیار کی۔ شاعری کی قدیم بنیادوں پر نئی عمارت تعمیر کرنا حالی جیسے فن کار کا ہی کام تھا۔ یہ عمارت فن کے اعتبار سے کوئی نادر و نایاب نمونہ اور مہتم بالشان کارنامہ نہ سہی لیکن اس کے مفید، اور وسیع ہونے میں شک نہیں، اس میں سادگی اور پختگی ہے، تنوع اور تناسب ہے۔ اس میں آکر شاعری کا مریض، صحت و توانائی حاصل کرتا ہے، اس کے خیالات میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اس کا دل سچائی اور سادگی کا فدائی ہو جاتا ہے۔ دراصل حالی کی

"ساری جد و جہد نئے خیالات کو پرانے لباس میں جلوہ گر کرنے کی تھی اور شاعری کو اصلیت اور حقیقت کی طرف لوٹانے کی تھی"[۵۲]

اور حالی اپنی اس جد و جہد میں کامیاب ہوئے۔

"اردو شعراء میں سب سے پہلے انھوں نے شاعری کے اصلی مقصد کو صحیح طور پر سمجھا، اور یہ محسوس کیا کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ قدرت کی نیرنگیوں کے مشاہدے سے جو اثر اس کے احساس اور ذکی دل و دماغ پر مترتب ہوئے ہوں اُسے ایسے دل کش انداز اور موزوں الفاظ میں ادا کرے جس سے سامعین کے اعلیٰ ترین احساسات برانگیختہ ہوں اور نظام فطرت کے مطالعہ سے مسائل حیات کے متعلق جو نتائج وہ خود اخذ کرتا ہے وہ دوسروں کے دلوں میں بھی پیدا کر دے اور اس کی نظم ہر قسم کے رکیک خیالات اور ادنیٰ جذبات سے پاک ہو، چنانچہ انھوں نے شاعری کے اس نصب العین کو نظم میں پوری بے باکی اور یکسوئی سے پیش نظر رکھا"[۵۳]

حالی نے میتھو آرنلڈ کی طرح ادب سے تفسیر حیات اور تنقید حیات دونوں کام لیے کہ

"جہاں تک اسلوب کی بے ساختگی اور زبان و دل کی یک جہتی کا تعلق ہے حالی ورڈسورتھ کے بہت قریب ہیں"

اور "اردو شاعری میں آج جو سیدھا پن اور فطری انداز پایا جاتا ہے اس کے موجد اور مبلغ حالی ہیں"[۵۴]

اردو میں یہ بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ ادب برائے ادب کے نام لیوا، ادب برائے زندگی، کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ ادب میں مقصدیت کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ادب اعلیٰ تصورات

---

[۵۱] فکر و نظر، صفحہ ۲۷۔ [۵۲] نئی قدریں، ممتاز حسین، صفحہ ۱۷۶۔

[۵۳] زمانہ، کانپور، حالی نمبر، صفحہ ۳۲۵ (مولانا حالی اور ان کے احسانات، نواب حمید اللہ خاں)

[۵۴] ادب اور زندگی، صفحہ ۱۲۸۔

Marfat.com

وتخیلات کا ایک پیکر جمیل ہے، جس میں رعنائی و زیبائی کے بغیر حسن قائم نہیں رہ سکتا، مقصدیت اس حسن و کشش کو ختم کر دیتی ہے اس لئے حسنِ کلام کے لئے الفاظ و خیال کی رنگینی لازمی ہے۔ لیکن حالی نے اس غلط نظریے اور تباہ کن عقیدے کی تردید کی اور سب سے پہلے انھوں نے

"طرز قدیم پر کہ جس میں تکلف و تصنع، اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں، ضرب کاری لگائی ہمواری خیال کو مدنظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے پاک کیا۔"[1]

اور چونکہ حالی کا مرکزی مقصد اصلاح ملک و ملت تھا اس لئے انھوں نے شاعری کو حصول مقصد کا ذریعہ بنایا کہ سب سے زیادہ موثر ذریعہ یہی تھا۔ اصلاحی خیالات کا اظہار نثر میں بھی ہوتا تھا۔ سرسید میر کارواں تھے مگر حالی سے پیشتر

"اصلاح ملک و ملت کے لئے شعر سے کام لینے کا خیال شاید کسی کے ذہن میں نہیں آیا اور اس بے قراری سے فریاد بلند کرنا کہ ساری قوم کے دل ہل جائیں خدا کی دین تھی جو حالی مرحوم کے حصہ میں آئی۔"[2]

اس طرح سب سے پہلے حالی نے شاعری کو اصلاح ملک و ملت کے لئے باقاعدہ استعمال کیا، یہی ان کی اولیت اور انفرادیت ہے۔ اسی انفرادیت کی وجہ سے ان کی شاعری میں مشت پہل نگینہ کی طرح خصوصیات پائی جاتی ہیں، سب سے پہلی اور عجیب خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جس صنف سخن کو پہلے پہل قلم اٹھایا وہ اردو شاعری میں شاہکار ہے۔ ان کی اوائل عمر کی غزلیں، متنوع اور دو آتشہ ہیں وہ قدیم خیالات کو مہذب پیرایہ میں ادا کرنے کا بہترین نمونہ ہیں، انھوں نے ان غزلوں میں کبھی مبالغہ آرائی، خیال بندی، اور لفظی صناعی سے کام نہیں لیا لیکن ان میں

"عاشقانہ جذبات نہایت تیز اور پر اثر ہیں۔ سادگی کے ساتھ سلیقہ کنایہ اور فن عشق کے [illegible] طرح آجاتے ہیں کہ پڑھنے والا ایک پر کیف [illegible] پہنچ جاتا ہے۔ [illegible] بے تکلفی، ترنم اور کہیں کہیں سہل ممتنع ان غزلوں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔"[3]

اسی طرح حالی نے سب سے پہلا مرثیہ اپنے استاد غالب کا ترکیب بند میں لکھا، یہ مرثیہ ہیئت و ہوا زبان و بیان، خلوص و عقیدت، سوز و درد اور تاثیر میں آپ اپنی مثال ہے، اس سے قبل ترکیب بند میں مرثیہ لکھنے کی مثال نہیں ملتی۔ یہ مرثیہ

[illegible] اور حقیقی تاثر سے لبریز اور ایک غمزدہ دل کی [illegible]

[illegible] مسدس حالی، صفحہ ۳۰۶۔

[illegible] پاکستان، کراچی، یکم جنوری ۱۹۶۹ء (الطاف حسین حالی، شمس فریدآبادی)۔

[illegible] اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین، صفحہ ۱۲۶ - ۱۳۰۔ [illegible] تاریخ ادب اردو، صفحہ ۱۳۰۔

Marfat.com

"اس نظم میں حالی کا آرٹ اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ بیان کی متانت و ثقاہت لب و لہجے کی پاکیزگی و پُراثری، ہیرو کے قلب و ذہن کے محاسن کی بے کم و کاست سچائی اور ان سب سے بالاتر خود غالب سے حالی کے خلوص و عقیدت کا بھرپور اظہار، ایسی شعری خوبیاں ہیں جن میں ہر ایک ادبی نادرہ اور حالی کی اعلیٰ ہنرمندی کا بیّن ثبوت ہے۔[1]"

درحقیقت یہ مرثیہ غم کا تاج محل ہے، جس میں

"شاعر کا رنج و غم مشکل، بہ نظم ہو گیا ہے۔[2]"

[illegible] مرثیے لکھے لیکن وہ اس پایہ کے نہیں ہیں البتہ فارسی میں [illegible] کا مرثیہ اپنے درد و اثر میں مرثیۂ غالب کے ہم پلہ ہے۔

نیچرل شاعری کی ابتدا لاہور کے قیام سے ہوئی۔ حالی نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کی طرف عملی قدم اُٹھایا۔ برکھا رُت، حبِّ وطن، نشاطِ اُمید، اور مناظرۂ رحم و انصاف لاہور کے مناظمہ کی یادگار ہیں۔ یہ اُن کی پہلی کوشش تھی لیکن اس کوشش میں وہ اُمید سے زیادہ کامیاب [illegible] نفسِ مضمون دونوں اعتبار سے یہ نظمیں اُردو شاعری میں نئی ہیں۔ اس قسم کے [illegible] کا بیان اُردو کی روایتی شاعری میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان نظموں میں تسلسلِ خیال، فکر کی [illegible] سادہ اسلوب، آسان زبان، سیاسی و سماجی پس منظر، اور [illegible] دوسری خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو اس وقت تک اُردو شاعری میں برائے نام تھیں، حالی کو اپنی ان نظموں پر فخر تھا وہ نیچرل شاعری کے موجد تھے اور انھیں اپنی اس ایجاد کی اہمیت و افادیت معلوم تھی، انھوں نے اکثر خطوں میں نیچرل شاعری کا ذکر کیا ہے وہ اس کو خاص اپنی چیز سمجھتے تھے۔ ان نظموں میں مناظرِ فطرت کو جس خوبی کے ساتھ انھوں نے بیان کیا ہے وہ ان کے ہمعصر شعرا میں سے کسی اور سے نہ ہو سکا۔ یہ نظمیں اپنی روانی اور سلاست میں جتنی مترنم اور باکیف ہیں دوسروں کی نہیں ہیں۔ مولانا آزاد کی نظمیں حالی کی نظموں کے مقابلہ میں کامیاب و مقبول نہ ہو سکیں۔ اسی لیے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ

"حالی نورِ بصیرت کا پیشرو، اور خود ایک نئی تحریک (دبستان) کا بانی جدید نقطۂ نظر کا پیغمبر نئی زندگی کا ہراول، اور اُردو شاعری کی نجات کا مبشر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بہ حال بیدار دماغ [illegible] اور خلاق صناعوں کی صف اول کا شاعر ہے، اس کا شعری شعور مغرب شعرا کے میلانات سے باخبر اور ان کے کیف و اثر کی لذتوں سے سرشار تھا۔[3]"

حالی نے ۱۸۷۹ء میں مسدس مدوجزر اسلام لکھا، اُردو شاعری میں اس قسم کی کوئی نظم موجود نہیں تھی۔

---

[1] صحیفۂ تاریخ اُردو، مخمور اکبر آبادی، صفحہ ۳۴۷-۳۴۹۔

[2] تاریخ ادب اُردو، صفحہ ۴۱۲۔ [3] صحیفۂ تاریخ اُردو، صفحہ ۳۴۹۔

Marfat.com

خود حالی نے اس سے پہلے کوئی مسدس کسی موضوع پر نہیں لکھا تھا، یہ ان کے کمال فن کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے پہلی بار اتنے اہم موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار مسدس میں اس انداز سے کیا کہ وہ ان کا لافانی شاہکار تسلیم کر لیا گیا، یوں کہنے والوں نے مسدس میں بہت سی خامیاں اور خرابیاں بتائی ہیں۔ اور اس کو شاعرانہ خصوصیات سے عاری بتایا ہے کیونکہ یہ نظم

"قصداً لکھی گئی اس لئے اس میں ہر جگہ آورد ہے اور آورد کو آمد میں تبدیل نہیں کیا گیا، خیالات ہیں اور بلند قسم کے بھی ہیں لیکن ان کو احساسات کے سانچہ میں نہیں ڈھالا گیا ہے۔ اس لئے شعریت کا پتہ نہیں..... مسدس حالی ایک ریگستان ہے جس میں کبھی کبھی کوئی مختصر سی سرسبز و شاداب جگہ ملتی ہے جس سے لمحہ بھر کے لئے دماغی سکون و فرحت کا سامان ہو جاتا ہے لیکن زیادہ تر تو پریشانی ہی پریشانی ہے[1]"

مگر اس کی مقبولیت، پڑھنے والے پر اس کا تاثر، اس دعوے کی تردید کرتے ہیں، حالی کا یہ نقش اول اپنے اندر شخصی اور انفرادی بہاؤ کا حسین امتزاج رکھتا ہے اور باوجود اُبالی کھچڑی اور بے مزہ سالن کی پریشانی اور مرغ مسلم سے زیادہ لذیذ ہے، اس نے حالی کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

اصلاح ملت کے خیال سے حالی نے مسدس کی تخلیق کی، اصلاح نسواں کی خاطر انھوں نے مناجات بیوہ لکھی۔ یہ نظم ۱۸۸۷ء میں لکھی گئی، اس سے پہلے حالی نے کوئی نظم صنف نازک کے متعلق نہیں لکھی تھی، اس نظم میں فنی خلوص، بے پایاں درد و اثر، میٹھی رسیلی زبان، دلکش انداز بیان، خیالات کی ندرت، سماج کے ظلم و ستم کا نقشہ، بیوہ کے جذبات کی من و عن ترجمانی، تباہ کن رسم و رواج، سب کچھ موجود ہے، اردو شاعری آج تک اس نظم کی مثال پیش نہیں کر سکی، ہندستان کی دوسری زبانیں بیوہ کی مناجات پر رشک کرتی ہیں۔ اس کے بعد دوسرے شعراء نے بیوہ کے مصائب و آلام اور رنج و غم کی ترجمانی کی ہے۔ ان شعراء کے سامنے حالی کی مناجات بیوہ موجود تھی اس کے باوجود ان کی نظمیں مقبول نہ ہو سکیں۔ ان کے سینہ میں حالی جیسا درد آشنا اور حساس دل کہاں تھا جو وہ بیوہ عورتوں کے صحیح جذبات و احساسات کو محسوس کر کے بیان کرتے۔

صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں :-

"اس نظم کی زبان اور بیان کی سادگی معجزہ ہے..... بحیثیت مجموعی مسدس کی عظمت و اہمیت بہت زیادہ ہے، لیکن بیشتر لحاظ سے ہماری نظر میں مناجات کا درجہ مسدس سے بھی زیادہ بلند ہے[2]"

حالی کے نقوش اول کا تعارف، ان کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے

---

[1] اردو شاعری پر ایک نظر، صفحہ ۳۰۰۔ [2] یادگار حالی، صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴۔

ان کی ادبی بصیرت، فکری شعور، ذہنی بالیدگی، ژرف نگاہی اور قدرت بیان کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے قلم سے پہلے پہل جو کچھ لکھا وہ ہر اعتبار سے مکمل اور بہترین ہے غزلوں میں انھوں نے جدید خیالات کی آمیزش کی اور اُن کو وسعت و توانائی بخشی۔ قصائد ان کی طبیعت کے موافق نہیں تھے اس لئے بہت کم لکھے ان میں بھی نعتیہ قصائد زیادہ ہیں، ان قصائد میں مبالغہ یا غلو کا نام تک نہیں ہے، اور یہ ان کا کمال فن ہے، نیچرل شاعری کی بنیاد ڈال کر اسے پروان چڑھایا۔ مرثیہ نگاری میں وسعت و افادیت انھوں نے پیدا کی ورنہ مرثیہ صرف واقعات کربلا کے لئے مخصوص اور محدود ہو گیا تھا۔ حالی نے اسے سیاسی و سماجی، ملکی و ملی، شخصی و قومی خیالات کا حامل بنایا، اسے مسدس کی قید و بند سے آزاد کیا، اور ترکیب بند، مثنوی، قطعہ اور غزل کی شکل میں بھی لکھنے کا رواج دیا۔

مسدس کو جو مرثیے کے لئے مخصوص سا ہو گیا تھا، ہر قسم کے مفید خیالات کے ادا کرنے کا ذریعہ بنایا، اس میں قومی و ملی، تعلیمی و سماجی، اصلاحی و اخلاقی اور نیچرل مضامین ادا کئے۔ اسی طرح مثنوی جو زیادہ تر عشق و حسن کے حرف و حکایات کے لئے ہی وقف ہو چکی تھی اب ہر قسم کے خیالات و جذبات کے اظہار کرنے کے لئے استعمال کی جانے لگی، حالی نے ایک بھی عشقیہ مثنوی نہیں لکھی، ان کی جتنی مثنویاں ہیں وہ سب نیچرل، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی ہیں، حالی کے فن کا یہ بھی کمال اور اعجاز ہے کہ انھوں نے روشِ عام سے ہٹ کر، فکر و خیال کی ایک نئی شاہراہ قائم کی اور رہروانِ سخن کو منزل مقصود تک پہونچانے کے لئے خود رہبر بنے۔

وہ حکیمانہ طبیعت رکھتے تھے اسی طبیعت نے ان سے غزلیات میں بھی حکیمانہ باتیں لکھوائیں اور دوسری اصنافِ سخن بھی اس سے خالی نہیں رہیں۔ قطعات و رباعیات کا مزاج حکمت و فلسفہ اصلاح و اخلاق سے مناسبت رکھتا ہے۔ اُردو شاعری میں ان اصنافِ سخن میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار بھی کیا جاتا رہا ہے لیکن کسی شاعر نے فرض سمجھ کر نہ قطعات لکھے، نہ رباعیاں لکھیں، حالی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ان دونوں اصناف پر توجہ کی اور اپنے خصوصی نظریات اور خیالات کو رباعیات و قطعات میں ادا کیا، جن میں ان کا سوز دروں، اور ان کے دل کی تڑپ بدرجۂ اتم موجود ہے اور انھیں کی بدولت وہ سعدی ہند ہوئے۔ سلیم پانی پتی نے انھیں اٹلی کے نامور رومن پرسیڈ شاعر کاروشی سے نسبت دی ہے[1]۔

قطعات کے علاوہ شاعری کی دوسری صنفوں کی طرف بھی حالی نے توجہ دی، سب سے زیادہ انھوں نے ترکیب بند میں اپنے خیالات ظاہر کئے، ان کی بڑی بڑی نظمیں ترکیب بند

---

[1] رباعیات حالی۔ سلیم پانی پتی (مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سنہ ۱۹۳۰ء)

Marfat.com

میں ہیں، سرے پہلا اور بہترین ترکیب بند مرثیہ غالب ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف موضوعات پر ترکیب بند لکھے جو زیادہ تر جلسوں اور کانفرنسوں کے موقع پر پڑھے جاتے تھے۔ یہ تمام ترکیب بند اُردو شاعری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے شاعری افادیت و تنوع سے خالی نہیں رہی۔ دنیائے ادب میں ایسی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں کہ کسی شاعر کی پہلی تخلیق ہی بے مثل و لاجواب ہو، حالی نے "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کو غلط ثابت کر دیا۔ کم از کم اُردو شاعری میں حالی کے علاوہ کوئی دوسرا فنکار ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس کامیابی کے ساتھ اپنے فن کی تخلیق کی ہو کہ اس میں فنی خصوصیات و کمالات بدرجۂ اولیٰ موجود ہوں۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شاعر کی حیثیت سے حالی کو اور بھی کئی خصوصیات حاصل ہیں، جن کا مختصر ذکر کر دینا ضروری ہے، زبان کے متعلق ان کا نظریہ نہایت وسیع ہے وہ اُردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا مناسب استعمال جائز سمجھتے ہیں، خاص کر ہندی اور انگریزی کے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، انھوں نے ہندی کے الفاظ نظم میں اور انگریزی کے الفاظ نثر میں زیادہ لکھے ہیں۔ نظم میں انگریزی کے الفاظ خال خال ہیں۔ مگر ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کئے۔

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر تم میں روپ ہے اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے
توفیق نے ہمیشہ لی تنت پر خبریاں جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا
ہٹ پہ اُس کی اور پس جاتے ہیں دل راس ہے کچھ اس کو خود رائی بہت

بعض غزلیں ہندی الفاظ کے قافیہ کی ہیں۔

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

اسی طرح ٹھاٹ، پاٹ، گھاٹ، کاٹ، سپاٹ وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے اشعار دل میں چٹکیاں لیتے ہیں۔

چٹکیاں سی دل میں ہر لیتا ہے کون؟ شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سراپا

دوسری غزل میں پاٹ، آٹ، جھاڑ، لتاڑ جیسے ہندی لفظ استعمال کئے۔

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ ہو گئی اک اک گھڑی بیتاب پہاڑ
قطرے قطرے کو ترستا ہے جو ہر باغ و بہار کر لیا سامان سیرابی کا ریگستان میں

بعض شاعروں کو قوافی میں ہندی لفظ آیا ہے۔ یہ الفاظ کانوں پر گراں نہیں معلوم ہوتے۔ اس لئے شاعر بے تکلف قوافی الفاظ استعمال کر گئے ہیں۔ مناجات بیوہ میں [illegible]

Marfat.com

الفاظ کی تو کوئی گنتی نہیں ہے۔

سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی　　سُکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی
کہہ گئی سچ اک راج کمُاری　　لاچاری پربت سے بھاری

غرض حالی نے

"ہندی الفاظ کو نہایت خوبی سے ادا کیا.... میر کے سوا شاید اور کوئی شاعر ہندی الفاظ کو اس خوبی سے ادا نہیں کر سکا"[۱]

حالی نے ہندی الفاظ کا استعمال اس خوبی سے کیا ہے کہ اُردو زبان کے مزاج کی [illegible] اور لطافت قائم رہے۔ اپنے معاصرین میں حالی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ [illegible] الفاظ انھوں نے استعمال کیے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اُردو فن کاروں کو ہندی، بھاشا اور سنسکرت زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ بغیر ان کی جانکاری کے اُردو زبان و ادب میں فطری حسن و بالیدگی نہیں پیدا ہو سکتی، وہ خود اس پر عمل کرتے تھے، کلیات نثر میں انھوں نے جو تقریظ لکھی ہے اس سے ان کی ہندی دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یادگار جاوید جلد دوم کی تقریظ میں بھی انھوں نے ہندی اور سنسکرت جاننے پر زور دیا ہے۔ اُردو شاعری کے مزاج کے لئے وہ ہندی الفاظ کو مناسب سمجھتے تھے، لیکن انگریزی الفاظ کو نظم میں استعمال نہیں کیا البتہ جدید نظموں کا نثر نما کے سرقع پر پڑھی جانے والی نظموں میں کہیں کہیں انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نثر میں بالغیر کی تحقیق کے موجب

"سب سے زیادہ انگریزی الفاظ حالی کے یہاں ملتے ہیں"... یعنی "اوسطاً چار انگریزی لفظ فی صفحہ"

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"حالی کے بعد مولانا شبلی انگریزی الفاظ ان کے مترادفات کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ان کے بعد آزاد پھر نذیر احمد"[۲]

لیکن شبلی اور نذیر احمد نے نظموں میں کبھی انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں اور اکبر الہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری انگریزی الفاظ کے گرد چکر لگاتی ہے۔

ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ حالی نے کہیں کہیں متروک الفاظ اور عربی و فارسی کے گراں گوش الفاظ استعمال کئے ہیں یہ الفاظ زیادہ تر قطعات اور ترکیب بند میں ملتے ہیں۔ سلام نے اکبر الہ آبادی کے متروک الفاظ کے استعمال کو حالی کی وضعداری پر محمول کیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مولانا نے آخر دم تک ان تمام الفاظ کو اپنے کلام میں نبھایا جن کو اساتذہ قدیم [illegible]

---

[۱] مرآۃ الشعراء، حصہ دوم، محمد یحییٰ تنہا، صفحہ ۵۴۔ [۲] ماہ نو کراچی ستمبر [illegible] صفحہ ۱۲، جائزہ [illegible] ابو اللیث صدیقی

زبان کے لیے موزوں سمجھا تھا مثلاً سو، پر، پہ (بمعنی اگر) تلک وغیرہ یہ وضع کی پابندی تھی کہ گو ان الفاظ کو داغ و امیر و جلال نے اپنی متروکات کی فہرست میں داخل کر کے عیوب کلام میں شامل کر لیا لیکن مولانا نے انھیں الفاظ سے اپنے کلام کی سادگی میں سو حسن پیدا کر لیے[۱]"

غرض "زبان کی سادگی اور جذبات کی پاکیزگی حالی کی شاعری کے خاص اوصاف ہیں۔ ایسی دلکش اور سادہ زبان ہر شخص کے بس کی چیز نہیں ہے، انھوں نے اپنے کلام کو بعید از فہم ترکیبوں [illegible] لغات اور غیر ضروری اطناب سے پاک رکھنے کی مسلسل کوشش کی ہے اسی لیے زبان کے اعتبار سے بھی حالی کا کلام قابل قدر سمجھا جاتا ہے..... ان کی شاعری تمام و کمال سادگی، سلاست اور صفائی کے ایک بلند معیار پر دائم ہوئی ہے..... اور ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ان کے سیدھے سادے اسلوب، سلاست زبان، سنجیدگی خیال اور شریفانہ جذبات کو بڑا دخل ہے[۲]"

اردو شاعری میں وسعت و تنوع، افادیت و مقصدیت کو سب سے پہلے حالی نے پیدا کیا۔ انھوں نے شعوری طور پر ادب اور سماج کے تعلق پر زور دیا، شاعری کو خیالی دنیا سے نکال کر عملی دنیا میں لے آئے۔ انھوں نے روایتی شاعری سے بغاوت کی ہے[۳]۔ لیکن یہ بغاوت تعمیری تھی، تخریبی نہیں۔ احتشام حسین کے الفاظ میں:-

"جہاں تک شاعری کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کا تعلق ہے آزاد کا یہ رویہ جذباتی تھا، حالی کا تعقل پسندانہ اور افادی۔ اس وجہ سے حالی کے یہاں اسلوب اور طرز ادا میں لطافت اور شعری کمالات پر اتنا زور نہیں جتنا حقیقت واقعیہ اور صداقت [illegible]

اس طرح حالی نے ترقی پسند شاعری کی بنیاد ڈالی۔ سب سے پہلے انھوں نے اس حقیقت کا انکشاف کیا

"قوت متخیلہ کوئی شے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتی، بلکہ جو مصالحہ اس کو خارج سے ملتا ہے اس میں وہ اپنا تصرف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے[۴]"

حالی نے یہ ثابت کر دیا کہ شاعر یا فنکار کی کوئی تخلیق خلا سے نہیں پیدا ہو سکتی [illegible] مطلب ہو سکتا ہے کہ فنکار بھی خلا میں نہیں پیدا ہو سکتا۔ چونکہ حالی نے [illegible] اسی نقطہ پر کہ تمام [illegible] ادبی کاوشیں کس [illegible] پر مبنی ہیں

---

[۱] حالی [illegible]

[۲] پیدا کردہ [illegible]

[۳] [illegible]

[۴] [illegible]

Marfat.com

جاتے ہیں، انھوں نے شعوری طور پر ادب کو اپنے عہد کے تقاضوں سے وابستہ کیا۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں :۔

"سرسید اور حالی اس نئے شعور کے ترجمان تھے جو انیسویں صدی کے ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ اس شعور میں بہت سی متضاد کیفیات تھیں..... اس لئے حالی جدید ادبی تحریک کے بانی ہونے کے باوجود سیاسی رجعت پرستی کا شکار تھے، اور رجعت پرستی کا شکار ہوتے بھی سماجی اور ادبی طور پر بعض ترقی پسند پہلوؤں کے ترجمان تھے، جو عقل پسندی (عقلیت) کی شکل میں نمایاں ہوئے..... لیکن اس سارے تضاد کے باوجود جو چیز اُردو ادب کے دھارے کا رُخ موڑنے کا سبب بنی وہ ان کی عقل پسندی اور حقیقت نگاری کی کوشش تھی[51]"

ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی حالی کو ترقی پسند تحریک کا علمبردار بتایا ہے "جدید نقطۂ نظر کی تلاش اور سماجی اصلاح کی کوشش" حالی نے سب سے بڑھ کر کی ہے[52]

یہ کوشش انھوں نے ہر صنف سخن میں اور ہر موضوع پر کی غزل یا قصیدہ، مثنوی ہو یا مرثیہ، رباعی ہو یا قطعہ، ہر ایک میں حقیقت و عقلیت پر زور دیا۔

"حالی نے اُردو ادب کو نظم کی شکل میں ایک نئی صنف سخن دی، غزل کو جس پر مُردنی چھانے لگی تھی، روایتی بیماری سے اچھا کر کے حقیقت نگاری کا خوبصورت لباس پہنایا اور اس طرح اس کے زندہ رکھنے کا سامان کیا..... اُردو زبان کا دامن بیش بہا ادب پاروں سے بھر دیا اور ادب کے دھارے کو ریگستانوں سے نکال کر خوبصورت وادیوں اور سرسبز و شاداب میدانوں کی طرف پھیر دیا۔ اس طرح (حالی) اُردو میں جمہوری شعر و ادب اور جمہوری تنقید کے بانی ہیں جس کا براہ راست تعلق ہماری تحریک آزادی کے ترقی پسند پہلوؤں سے ہے[53]"

حالی کے شعری نظریات ترقی پسندانہ ہیں۔ اُنھوں نے درمع الدھر کیف دار اور رخذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیا، جو ترقی پسندی کی روح رواں ہے۔ ان کی شاعری کو سید احتشام حسین کے فرمودات ذیل کی بنا پر بھی جانچا جا سکتا ہے۔ یہ خیالات انھوں نے جدید شاعری کے سلسلے میں ظاہر کیے ہیں

"شاعری میں ان مسائل کو جگہ دینا جن سے واقعی زندگی عبارت ہے..... تخیل اور مبالغہ پرستی سے زیادہ واقعیت اور حقیقت پر زور دینا۔ مواد اور اسلوب میں گہرا تعلق (ہونا) — وجود کو خیال پر مقدم قرار دے کر اقدار کا احساس دلانا..... مطلق قدروں کا قائل نہ ہونا بلکہ یہ ماننا

---

۵۱ ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری، صفحہ ۹۸ و ۱۰۱۔

۵۲ سویرا، نمبر ۱۲، ۱۹۵۵ء، اُردو ادب کے رجحانات، ڈاکٹر عبدالعلیم (کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے)

۵۳ ترقی پسند ادب، صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۸۔

کہ وقت کے تقاضوں سے شعر و ادب کی قدریں بھی بدلتی ہیں اور ذوق بھی بدلتا ہے، نئے سماجی اور سیاسی شعور کی بنا پر موضوع، مواد، اور طرز فکر میں تغیر ہونا) وغیرہ[۵۱]"

حالی کی شاعری میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ترقی پسند شاعری کے بانی ہیں اور سب سے پہلے ترقی پسند شاعر۔ ان کا مطمح نظر اخلاقی و اصلاحی ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندانہ تھا وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں؟

ان کی ترقی پسندی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ قدیم روایات کا احترام کرنے کے باوجود سخن میں سلف کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ باطل پرستی یا قدامت پرستی سے یہ انحراف، حقیقت پسندی کا اقرار تھا۔ انھوں نے اپنے نایاب مال کی دکان سب سے الگ اسی اصول کے پیش نظر سجائی تھی۔ غرض

"خارجی موضوعات کو منظم طریقے سے مقبول عام بنانے کا سہرا انھیں کے سر ہے[۵۲]"

اور انھوں نے

"نہ صرف اسلوب و ہیئت، بلکہ معنویت و افادیت کے لحاظ سے بھی شاعری کا رواج بدل دیا[۵۳]"

اسی لیے ترقی پسند شاعر حالی کی پیروی کرنے پر مجبور ہوئے۔

حالی کی حب الوطنی، شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ اردو زبان میں وطن کی محبت کے راگ انھوں نے سب سے زیادہ گائے۔ اس راگ میں غلامی و محکومی کا احساس ہے، آزادی و حریت کے جذبات ہیں، زوال قوم کے اسباب کی دردناک داستان ہے، سیاست فرنگ کی پردہ دری ہے ان کی حب الوطنی ایک سچے ہندوستانی کی حب الوطنی ہے۔ مثنوی حب وطن، ان کی حب الوطنی کی دستاویز ہے۔ اس میں انھوں نے جن خیالات کا ذکر کیا ہے اور وطن کی غلامی کے جو اسباب بتلائے ہیں ان سے حالی کی حقیقت پسندی، اور سچی حب الوطنی ثابت ہوتی ہے۔ ایک سچا محب وطن اور بے تعصب انسان ہی یہ کہہ سکتا ہے۔

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی　　جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا　　کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا　　کبھی محمود نے غلام کیا

کیا یہ ایک سچے محب وطن کے دل کی آواز نہیں ہے؟ انھوں نے سب سے پہلے (تاسیس کانگریس سے بھی کئی برس پہلے) قوم کو حب وطن کا یہ تصور دیا[۵۴] اور اپنے شعر کی دل نشینی اور گھلاوٹ

---

۵۱ تنقید کی جائزے۔ صفحہ ۳۰۵ (۱۹۵۶ء)　　۵۲ جدید غزل۔ رشید احمد صدیقی، صفحہ ۴۴۔

۵۳ نگار، جنوری فروری ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۲۔ نیاز فتحپوری۔

Marfat.com

اُسے تاثیر کا دائمی چشمہ" بنایا۔ اسی لیے ان کے اندر ایسی جامعیت اور مرکزیت پیدا ہوگئی کہ

"تاریخ سیاسی میں، تاریخ تعلیمی میں، تاریخ معاشرت میں، تاریخ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب، شاعر، مصلح، محب وطن، اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصلت انسان کی کاوش ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے[1]"

حالی کے اس چشمۂ صافی نے چمن کو سرسبز و شاداب کر کے وطن کی محبت کے پھول کھلائے۔ جن کے رنگ و بو سے جذبۂ حریت، کو کیف و سرور حاصل ہوا۔

حالی کو اسلامی شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت و اہمیت حاصل ہے۔ کوئی شک نہیں ان کی شاعری کا زیادہ تر مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو اپنی پستی کا احساس ہو اور وہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں، اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے عظیم ماضی کا احساس پیدا کیا اور اسلام کی برکتوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر کیا۔ مسدس مدوجزر اسلام تو خاص اسی مقصد کے لئے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد نظمیں انجمن حمایت اسلام، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلمانوں کے دوسرے جلسوں کے لئے لکھی تھیں۔ ان تمام نظموں میں خطاب خاص طور سے مسلمانوں سے ہے لیکن سیاق و سباق کو علیحدہ کر کے اگر ان نظموں کو پڑھا جائے یا جو حضرات ان نظموں کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ جب ان نظموں کو پڑھتے ہیں تو یہ نظمیں صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہتی ہیں بلکہ ان کے مخاطب عوام ہو جاتے ہیں۔ خود مسدس کے نصف سے زیادہ بند ایسے ہیں جن کے مخاطب عامۃ المسلمین نہیں بلکہ تمام انسان ہیں۔ دقت، فرصت، علم، رحم، ہمدردی، تعصب، افلاس، تقلید، غیبت، حسد و تکبر، بدنامی و رسوائی، خوشامد، خود پسندی، کذب و مبالغہ، کاہلی، امید، شرافت، محنت، ہمت مردان، فضیلت علم وغیرہ ایسے موضوع ہیں جو صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ہیں، اور مسدس میں ہندوستان کی فضا تو ایک ایک لفظ کے اندر موجود ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ

"حالی اسلامی تہذیب و تمدن کا انحطاط اور مسلمان شریف خاندانوں کی پستی بیان کر رہے تھے لیکن اس کی تصویر انھوں نے اتنے خلوص اور شاعرانہ دردمندی سے کھینچی کہ وہ جاگیرداری عہد کے زوال کی بڑی مکمل تصویر بن گئی۔ مسدس کی عظمت کا یہی راز ہے[2]"

خواجہ غلام السیدین نے مسدس کی عظمت و اہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

---

[1] حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (سہیل، علی گڑھ، صفحہ ۲۵۶۔

[2] ترقی پسند ادب۔ علی سردار جعفری، صفحہ ۱۰۴۔

"میرے نزدیک مسدس حالی کا اہم ترین حصہ وہ نہیں جہاں اس نے اسلامی تہذیب و تمدن کی شاندار ماضی کا نقشہ کھینچا ہے، بلکہ وہ ہے جہاں اس نے بتایا ہے کہ اس تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کن صفتوں اور قدروں کا احیاء ضروری ہے۔ مثلاً محنت اور کارکی عظمت کا احساس، باہمی معاملات میں عدل و رواداری، آپس کے تعلقات میں محبت اور پاسداری، ذاتی شخص اور نام و نسب کی تمیز سے پرہیز، زندگی میں سادگی و کفایت، خیالات میں وسعت [illegible] آج بھی اتنا ہی جدید اور مقتضائے وقت ہے جتنا اپنے عہد میں پہلے تھا۔"

موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے مسدس کی اہمیت ملی سے زیادہ قومی، تاریخی، ذہنی اور ترقی پسندانہ ہے۔ اسی کی بدولت

"سیاسی شعور بڑھنے لگا۔ مغربی ادبیات کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے، جمہوریت کا احساس اور سماجی انصاف کا تقاضا زور پکڑنے لگا۔"[۵۱]

علی سردار جعفری مسدس کو ترقی پسند شاعری کی مشعل تسلیم کرتے ہیں۔

"فنی اعتبار سے مسدس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو آج بھی ترقی پسند شاعری کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔"[۵۲]

جہاں تک جو خالص اسلامی نظم مشہور ہے اپنے اندر ترقی پسندی اور سیاسی رہنمائی کی خصوصیت رکھتا ہے تو حالی کی دوسری نظمیں اسلامی کیسے کہی جا سکتی ہیں۔ یہ نظمیں اصلاحی و اخلاقی ضرور ہیں لیکن ان میں خالص اسلامی تصورات نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حالی مصلح شاعر کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہیں لیکن ان سے ان کی شاعرانہ عظمت پر حرف نہیں آسکتا۔ وہ بیک وقت مصلح، معلم، مفکر، مجدد اور ترقی پسند شاعر تھے۔ فکر و عمل، خارجی و جذبہ کا جیسا گہرا تعلق حالی کے یہاں ہے، کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ اسی سے ان کے کلام میں افادیت و جامعیت پیدا ہو گئی اور وہ عظیم شاعر اور مفکر کا تسلیم کئے گئے۔

۵۱۔ آل احمد، ہماری نظمیں، خواجہ منظور حسین، مطبوعہ ۱۹۴۵ء، صفحہ ۲۰۔

۵۲۔ [illegible] صفحہ ۱۰۔

۵۳۔ ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری، صفحہ ۱۰۔

Marfat.com

حرفِ آخر:

اعتدالِ معانی از من پُرس کہ مزاجِ سخن شناختہ ام

حالی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے اور مکمل جائزہ لینے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری ہشت پہل نگینہ کی طرح مختلف النوع خصوصیات رکھتی ہے۔ اس نے ہمارے ادبی و جمالیاتی ذوق کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ اس نے زمانے کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اس نے نئے نئے امکانات اور نئے نئے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کی شاعری میں بڑی وسعت ہے۔ مذہبی شاعری کو چھوڑ کر، مسدس شاعری کی وہ کون سی صنف ہے جو ان کے یہاں اپنی پوری دلکشی اور توانائی کے ساتھ موجود نہیں اور جس میں اُن کی مجتہدانہ شان نہیں پائی جاتی؟

غزل کو تنگیِ مضامین، بوالہوسی اور لذت پرستی نیز لفظی صناعی اور خیال آرائی سے نکال کر اس قابل بنایا کہ اس میں زندگی کے مسائل، جدید خیالات و رجحانات بیان کیے جا سکیں۔ اسی طرح دیگر اصناف سخن مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور قطعہ وغیرہ سب کو خیال اور مبالغہ کی دنیا سے نکال کر عمل اور حقیقت کی دنیا میں لائے، ان کو نئے زمانے، نئے امکانات، نئے مسائل اور نئے جہان و مکان کی ترجمانی کرنے کے قابل بنایا۔ اُنھوں نے شاعری کی عمارت کہنہ پر نئی تعمیر، اس انداز اور خوش سلیقگی کے ساتھ کی اور اس کو اس خوبی کے ساتھ آراستہ و پیراستہ کیا کہ اس میں وسعت و ہمہ گیری، جدت و ندرت، بلندی و رفعت، دل کشی و رعنائی، افادیت و مقصدیت پیدا ہو گئی۔

اُردو شاعری میں جو روایتی تاریکی، سماجی انتشار اور فکری افلاس کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ حالی کی حکیمانہ نظر نے انھیں دیکھا، اور اپنے تجربے اور اجتہاد سے ان کو دور کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ انھوں نے شاعری کو لفظی صناعی، اور مبالغہ آرائی سے نجات دلائی اور اس کو سادگیِ فکر، جدت بیان، اور حقیقت نگاری سے روشناس کیا۔ عام طور پر ان کی زبان سلیس، سادہ اور آسان ہے۔ بیان میں اُلجھاؤ، ابہام یا پیچیدگی نہیں ہے، مجموعی حیثیت سے لب و لہجہ نرم و شیریں دلکش ہے البتہ کہیں کہیں کچھ کر کے دکھانے کا جذبہ، حکیمانہ و ناصحانہ انداز، الفاظ و خیالات میں اُلجھاؤ پیدا کر کے ان کے کلام کو خشک و بے مزہ کر دیتا ہے، اور وہ ادبی و فنی اعتبار سے اپنے مرتبہ سے گر جاتا ہے۔ لیکن ان خامیوں اور غلطیوں سے کون شاعر بچا ہے؟ ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ حالی نے صحیح اور مجتہدانہ شان کے ساتھ شاعری کی اور ہر مصلح نے جہد باوجود اپنے عزم و خلوص، ہمت و محنت، جہد و جہد و ہمہ گیری، عظیم الشان خدمات اور اعلیٰ جذبات و خیالات کے خطا و نسیان سے بچ نہیں سکتا۔ اس کے اجتہاد میں فن کی خامی کا پایا جانا حیرت کی بات نہیں ہے۔ اس سے اس کے کمال فن پر اور اس کے مرتبۂ اجتہاد پر حرف نہیں آسکتا۔ بلکہ اس کے اعلیٰ کارنامے کی طرح اس کی خامیاں اور کوتاہیاں بھی

Marfat.com

آنے والی نسلوں کے لئے منارۂ نور بن کر راستہ دکھاتی ہیں، حالی کی شاعری میں جو خامیاں ہیں، اُن کو اسی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ان کی شاعری عظیم المرتبت کارنامہ نہ سہی لیکن اپنے اثرات کی بدولت وہ زندۂ جاوید ہے اور کم از کم اُردو شاعری میں منفرد و بے مثال ہے۔

ان کی شاعری میں غم عشق و غم روزگار کے ساتھ ساتھ ملت کا غم زیادہ ہے۔ لیکن یہ غم، یاس و ناامیدی، قنوطیت و نامرادی کا غم نہیں ہے بلکہ اس میں سوزِ دروں اور خون جگر کی آمیزش ہے، اس میں عزم و حوصلہ کی بلندی ہے، اس میں قول و فعل کی ہم آہنگی ہے، اس میں جمال و جلال کا شکوہ ہے۔ وہ دنیا کے لئے مشعلِ راہ اور آخرت کے لئے زادِ راہ ہے۔

درحقیقت اُردو شعر و سخن کی نشأۃ ثانیہ اور حیاتِ نو، انھیں کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے پہلے اُردو شعر و ادب کا جائزہ لیا اس کے بعد اس کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنا نظریۂ شعری پیش کیا اور اس کے معیار پر پورے سرمایۂ سخن کو پرکھا اور خود عمل کر کے نمونہ پیش کیا، اپنے نظریات کی روشنی میں اپنی تخلیقات پیش کیں، جن کے دُور رس اور مفید نتائج برآمد ہوئے، شعر و ادب زندگی سے قریب تر ہوتا گیا، اس کی افادیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی لئے حالی کو قدیم شاعری کا مصلح، جدید غزل اور نیچرل شاعری کا مجدد، قومی اور وطنی شاعری کا امام، نوربانیت اور ترقی پسند تحریک کا علمبردار اور حکیمانہ نظم کا موجد تسلیم کیا گیا۔ ان کی قومی نظموں میں شاعرانہ حسن و خوبی کم سہی، لیکن وہ اپنی افادیت کی وجہ سے اُردو شاعری کا سرمایۂ افتخار ہیں۔

شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند اور اعلیٰ نہ سہی، اور خواہ انھیں مدِ شعرائے اُردو کی صف اوّلیں میں شامل نہ کیا جائے[1]۔ لیکن وہ اُردو ادب کے سب سے بڑے محسن اور بلند مرتبت شاعر ضرور ہیں۔ اُردو شاعری میں ان کا مقام بہت اہم ہے اور ان کی ادبیت و انفرادیت مسلّم ہے۔ یہ اہمیت و انفرادیت غزل گو کی حیثیت سے بھی ہے، ترقی پسند اور نیچرل شاعر کی حیثیت سے بھی، نظم نگار کی حیثیت بھی ہے اور قومی و ملّی شاعر کی حیثیت بھی۔ غالب جیسے دیدہ ور اور نکتہ شناس نے یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ

"اگر نثر نہ لکھوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے"[2] بلکہ

انھوں نے حالی کے اندر شاعرانہ کمال کے وہ تمام اعلیٰ جوہر اور محاسن دیکھے جو ایک [illegible] کے لئے ضروری ہیں۔ پس اگر حالی نے اپنے استاد کے مشورہ پر عمل نہ کرتے ہوئے اپنی فطری صلاحیتوں سے بے بہرہ رہ کر شعر و شاعری ترک کر دیتے تو اُردو شاعری میں آج جو رنگا رنگی، گہرائی و گیرائی، سادگی و سلاست، شیرینی و دل کشی، وسعت و جامعیت، افادیت و مقصدیت، وطنیت و قومیت، صداقت و واقعیت، عقلیت و ترقی پسندی پائی جاتی ہے وہ کہاں ہوتی؟ اس کمی کو کون پورا کرتا؟ یہ تمام

---

[1] تاریخ ادب اُردو، صفحہ ۴۱۷۔ [2] مقالات حالی اول، صفحہ ۲۶۶۔

Marfat.com

خصوصیات تو انھیں کے دم سے وابستہ ہیں، انھیں کے کمال فن کا یہ اعجاز ہے کہ اُردو شاعری میں ان کے مقلدین اور نام لیواؤں کی کمی نہیں رہی۔ نہ صرف تقریباً کل قومی یا اخلاقی شاعر ان کے شاگرد ہیں[۵۱] بلکہ غزل گو اور نظم نگار شعرا بھی براہ راست یا بالواسطہ حالی سے متاثر و مستفیض ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ حالی ہی کی وجہ سے اُردو شعرا کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ ان کا رنگ بدلا اور وہ حقیقت نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، سلیم پانی پتی، سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی، کیفی دہلوی، علامہ اقبال، صفی لکھنوی، جوش ملیح آبادی، کون ایسا شاعر ہے جس نے حالی سے استفادہ نہ کیا ہو۔ اقبال مرحوم نے تو صاف صاف اعتراف کیا۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی — معمورۂ حق سے ہے جام حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا — نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی[۵۲]

اور اسی لئے انھوں نے ارباب معنی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ادبی بصیرت اور شاعرانہ کمال حاصل کرنے کے لئے مرقد حالی کا طواف کرتے رہیں۔

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را — نوائے او بجانہا افگند شوری کہ من دانم

اور لسان القوم صفی مرحوم نے حالی کے کمالِ فن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

ختم اس پہ تھی واقعہ نگاری — تھا نظم میں لطف نثر جاری
ہر گوشہ میں فیض اس کا جاری — ہر کشت رہینِ آبیاری
راتیں نہ رہیں سخنوری کیں
سوکھی ہوئی کھیتیاں ہری کیں[۵۳]

حالی کی شاعری کا تفصیلی جائزہ اور اس کے متعلق اساتذہ کے خیالات کا تجزیہ دونوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

"شاعر کی حیثیت سے حالی کو جو مرکزیت و جامعیت حاصل ہے وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہے وہ صف اول کے شاعروں میں بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔ اُردو شاعری میں اُن کا مقام نہایت اہم ہے۔ وہ نہ صرف فطری شاعر تھے، بلکہ
[illegible] (عہد) کے سب سے بڑے [illegible]"[۵۴]

---

۵۱ تذکرۂ الشعرا۔ حسرت موہانی، صفحہ ۱۰۔

۵۲ اقبال نے یہ رباعی لاہور کے جلسہ میں ۱۹۰۴ء میں پڑھی۔ اس کے بعد حالی کی نظم پڑھی۔ (سیرت اقبال۔ طاہر فاروقی)

۵۳ مرثیہ حالی، صفی لکھنوی (ہمارا ادب، آل احمد سرور)

۵۴ اُردو ساہتیہ کا اتہاس۔ سید احتشام حسین، صفحہ ۲۱۰ [illegible]

Marfat.com

کتابیات

کتب و اخبارات اور رسائل کی فہرست

نمبر سلسلہ	مصنف	نمبر سلسلہ	کتاب	سن طباعت یا ایڈیشن
(۱)	آرزو۔ مختار الدین احمد۔ ڈاکٹر	(۱)	انتقد غالب	۱۹۵۶ء
(۲)	آزاد۔ محمد حسین۔ شمس العلماء	(۲)	مجموعہ نظم آزاد	.
	〃 〃 〃	(۳)	آب حیات	.
(۳)	آسی۔ عبدالباری۔ مولانا	(۴)	تذکرۂ خندۂ گل	۱۹۲۸ء (کور پر ۱۹۲۹ء چھپا ہے)
(۴)	آفاق حسین	(۵)	نادرات غالب	پہلا ایڈیشن
(۵)	ابواللیث صدیقی۔ ڈاکٹر	(۶)	لکھنؤ کا دبستان شاعری	دوسرا ایڈیشن۔ اردو مرکز لاہور
	〃 〃	(۷)	غزل اور تغزلین	دسمبر ۱۹۵۴ء
(۶)	ابونصر محمد احمد خاکی		[illegible]	۱۹۳۹ء
(۷)	اثر۔ امداد امام	(۹)	کاشف حقائق	پہلا ایڈیشن
(۸)	اثر۔ نواب جعفر علی خاں	(۱۰)	اثر کے تنقیدی مضامین	〃
(۹)	امتشام حسین سید	(۱۱)	ادب اور رجحان	[illegible]
	〃 〃 〃	(۱۲)	تنقیدی جائزے	۱۹۵۶ء
	〃 〃 〃	(۱۳)	ذوق ادب اور شعور	۱۹۵۵ء
	〃 〃 〃	(۱۴)	روایت اور بغاوت	۱۹۵۶ء
			[illegible]	[illegible]
			[illegible]	۱۹۵۰ء
			[illegible]	۱۹۵۲ء
(۱۵)	ادیب۔ محمود حسن خلوق سید	(۱۹)	[illegible]	۱۹۵۳ء
(۱۶)	ماحصل۔ [illegible] شیخ محمد	(۲۰)	تذکرۂ ماہر	[illegible]
	〃	(۲۱)	تذکرۂ شعرائے [illegible]	[illegible]

نمبر سلسلہ	مصنف	نمبر سلسلہ	کتاب	سن طباعت یا ایڈیشن
(۱۳)	اسماعیل پانی پتی۔ شیخ محمد	(۲۲)	کلیات نظم حالی اول	پہلا ایڈیشن
	〃 〃 〃	(۲۳)	کلیات نظم حالی دوم	〃 〃
	〃 〃 〃	(۲۴)	مکاتیب حالی	〃 〃 سنہ ۱۹۵۰ء
(۱۴)	اشرف علی خاں	(۲۵)	جدید تاریخ اُردو	سنہ ۱۹۴۶ء
(۱۵)	اشہری۔ امجد علی سید	(۲۶)	ایشیائی شاعری	پہلا ایڈیشن
(۱۶)	اعجاز حسین۔ ڈاکٹر سید	(۲۷)	مختصر تاریخ ادب اُردو	چھٹا ایڈیشن
	〃 〃	(۲۸)	مذہب و شاعری	سنہ ۱۹۵۵ء
	〃 〃	(۲۹)	نئے ادبی رجحانات	سنہ ۱۹۵۶ء
(۱۷)	اقبال علی سید	(۳۰)	سید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب	سنہ ۱۸۸۴ء
(۱۸)	اقبال عظیم	(۳۱)	مشرقی بنگال میں اُردو	پہلا ایڈیشن
(۱۹)	امیر احمد علوی	(۳۲)	طرہ امیر	سنہ ۱۹۲۹ء
(۲۰)	[illegible]	(۳۳)	تذکرہ شمس العلماء خواجہ حالی	سنہ ۱۹۱۵ء
(۲۱)	بابائی	(۳۴)	کمپنی کی حکومت	پہلا ایڈیشن
(۲۲)	تارا چند (ڈاکٹر)	(۳۵)	اہل ہند کی مختصر تاریخ	پہلا ایڈیشن
(۲۳)	تسلیم	(۳۶)	مسدس حدیقۃ المذہب	سنہ ۱۳۰۰ھ م ۱۸۸۳ء
(۲۴)	تنہا۔ محمد یحییٰ۔ مولوی	(۳۷)	مرأۃ الشعراء جلد دوم	پہلا ایڈیشن
(۲۵)	جعفر حسن (ڈاکٹر)	(۳۸)	ہندوستانی سماجیات	〃 〃
(۲۶)	جگر بریلوی	(۳۹)	صحت زبان	سنہ ۱۹۵۰ء
(۲۷)	جلیل قدوائی	(۴۰)	تنقیدیں اور خاکے	سنہ ۱۹۵۲ء
(۲۸)	چکبست، برج نرائن پنڈت	(۴۱)	مضامین چکبست	سنہ ۱۹۵۵ء
(۲۹)	[illegible]	(۴۲)	مسدس حالی	سنہ ۱۹۰۷ء م سنہ ۱۳۲۵ھ
(۳۰)	حالی۔ الطاف حسین مولانا	(۴۳)	حیات سعدی	سنہ ۱۹۲۷ء
	〃 〃 〃	(۴۴)	دیوان حالی	سنہ ۱۸۹۳ء پہلا ایڈیشن
	〃 〃 〃	(۴۵)	〃 〃	سنہ ۱۹۴۰ء
	〃 〃 〃	(۴۶)	مجالس النساء اول	سنہ ۱۹۲۴ء
	〃 〃 〃	(۴۷)	〃 〃 دوم	سنہ ۱۹۲۴ء

Marfat.com

نمبر سلسلہ	مصنف	نمبر سلسلہ	کتاب	سن طباعت یا ایڈیشن
(۳۰)	حالی۔ الطاف حسین۔ مولانا	(۴۸)	مجموعۂ نظم حالی	۱۹۲۳ء گیلانی پریس لاہور
	〃 〃 〃	(۴۹)	〃 〃	۱۹۱۵ء
	〃 〃 〃	(۵۰)	مسدس حالی صدی ایڈیشن	۱۹۳۵ء
	〃 〃 〃	(۵۱)	〃 〃 نامی پریس	۱۹۰۹ء
	〃 〃 〃	(۵۲)	مقالات حالی حصہ اول	۱۹۲۵ء
	〃 〃 〃	(۵۳)	〃 〃 〃	۱۹۵۴ء
	〃 〃 〃	(۵۴)	〃 〃 دوم	۱۹۲۸ء
	〃 〃 〃	۵۵	ضمیمہ کلیات نظم حالی اردو	۱۹۱۰ء
	〃 〃 〃	(۵۶)	یادگار غالب	۱۹۳۵ء سائر
	〃 〃 〃	(۵۷)	مولود شریف	۱۹۳۳ء
	〃 〃 〃	(۵۸)	قطعات حالی	پہلا ایڈیشن، مصطفیٰ پریس
	〃 〃 〃	(۵۹)	مقدمہ شعر و شاعری	۱۹۵۲ء مرتبہ وحید قریشی
	〃 〃 〃	(۶۰)	مکتوبات حالی اول	پہلا ایڈیشن
	〃 〃 〃	(۶۱)	〃 〃 دوم	
(۳۱)	حامد حسن قادری	(۶۲)	داستان تاریخ اردو	۱۹۳۹ء
(۳۲)	حسرت موہانی	(۶۳)	تذکرۃ الشعراء بلد سوم	بار اول
(۳۳)	خیالی	(۶۴)	مسدس خیالی	
(۳۴)	خورشید الاسلام (ڈاکٹر)	(۶۵)	تنقیدیں	۱۹۵۰ء
(۳۵)	خیالی۔ فخر الدین۔ مولوی	(۶۶)	مسدس خیالی	پہلا ایڈیشن
(۳۶)	ذاکر حسین خاں (ڈاکٹر)	(۶۷)	خاں ایک محب وطن کی حیثیت سے	
(۳۷)	راس مسعود (سر)	(۶۸)	خطوط سرسید	
(۳۸)	رام بابو سکسینہ (ڈاکٹر)	(۶۹)	تاریخ ادب اردو	۱۹۳۰ء
(۳۹)	رشید احمد صدیقی	(۷۰)	جدید غزل	پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء
(۴۰)	رضا علی (سر)	(۷۱)	اعمال نامہ	
(۴۱)	رفیق مارہروی	(۷۲)	ہندوؤں میں اردو	۱۹۵۹ء
(۴۲)	رئیس احمد جعفری	(۷۳)	بہادر شاہ ظفر	۱۹۳۰ء

نمبر سلسلہ	مُصنّف	نمبر سلسلہ	کتاب	سن طباعت یا ایڈیشن
(۴۳)	زور۔ محی الدین قادری (ڈاکٹر)	(۷۴)	داستان ادب حیدرآباد	۱۹۵۱ء
(۴۴)	سجاد انصاری	(۷۵)	محشر خیال	۱۹۵۰ء
(۴۵)	سجاد ظہیر	(۷۶)	اُردو، ہندی، ہندستانی	۱۹۴۷ء
(۴۶)	شرر۔ ابو محمد	(۷۷)	اُردو میں قصیدہ نگاری	۱۹۵۳ء
(۴۷)	سرسید احمد خاں	(۷۸)	تہذیب الاخلاق	[illegible]
(۴۸)	سرور۔ آل احمد	(۷۹)	ادب اور نظریہ	۱۹۵۲ء
	〃 〃	(۸۰)	تنقیدی اشارے	۱۹۵۵ء
	〃 〃	(۸۱)	نئے اور پرانے چراغ	۱۹۵۵ء
	〃 〃	(۸۲)	ہمارا ادب (مرثیہ صفی بر حالی)	.
(۴۹)	سری رام۔ لالہ	(۸۳)	نمکدانۂ جاوید، جلد اول	پہلا ایڈیشن
	〃 〃	(۸۴)	〃 〃 دوم	〃 〃
	〃 〃	(۸۵)	〃 〃 چہارم	〃 〃
	〃 〃	(۸۶)	〃 〃 پنجم	〃 〃
(۵۰)	سعید انصاری	(۸۷)	شبلی بہترین انشا پرداز	۱۹۳۴ء
(۵۱)	سفارش حسین	(۸۸)	انتخاب حالی	۱۹۴۸ء
(۵۲)	سلیم۔ وحید الدین	(۸۹)	رباعیات حالی	۱۹۳۰ء
(۵۳)	سلیمان ندوی۔ سید	(۹۰)	حیات شبلی	پہلا ایڈیشن
	〃 〃	(۹۱)	نقوش سلیمانی	〃 〃
(۵۴)	سید محمود۔ ڈاکٹر	(۹۲)	تاریخ التعلیم	〃 〃
(۵۵)	سیماب اکبر آبادی	(۹۳)	حالات حالی	〃 〃
(۵۶)	شاد عظیم آبادی	(۹۴)	سروش ہستی	〃 〃
(۵۷)	شارق۔ میرٹھی	(۹۵)	اُردو شاعری کی روایات	۱۹۵۲ء
(۵۸)	شبلی نعمانی شمس العلماء	(۹۶)	کلیات نظم شبلی	پہلا ایڈیشن ناظر پریس لکھنؤ
(۵۹)	شاغل۔ احترام الدین۔ سید	(۹۷)	تذکرہ شعرائے جے پور	〃 〃
(۶۰)	شکیب۔ نجم الدین احمد	(۹۸)	کاروانِ معیشت	۱۹۴۹ء
(۶۱)	شیفتہ، نواب مصطفےٰ خاں	(۹۹)	مقدمہ دیوان شیفتہ از حالی	پہلا ایڈیشن

نمبر سلسلہ	مُصنّف	نمبر سلسلہ	کتاب	سن طباعت یا ایڈیشن
(۶۲)	صادق علی خاں	(۱۰۰)	(از) مخزن ادب	پہلا ایڈیشن، فیروز سنز لاہور
(۶۳)	صادق قریشی	(۱۰۱)	ذکر حالی	سنہ ۱۹۴۹ء
(۶۴)	صالحہ عابد حسین	(۱۰۲)	یادگار حالی	[illegible]
(۶۵)	صفی لکھنوی	(۱۰۳)	مرثیہ حالی از ہمارا ادب	
(۶۶)	طاہر فاروقی	(۱۰۴)	سیرت اقبال	پہلا ایڈیشن
(۶۷)	طفیل احمد منگلوری، سید	(۱۰۵)	مسلمانوں کا روشن مستقبل	[illegible]
(۶۸)	عابد حسین (ڈاکٹر)	(۱۰۶)	مضامین عابد	پہلا ایڈیشن
	〃 〃	(۱۰۷)	قومی تہذیب کا مسئلہ	سنہ ۱۹۵۵ء
(۶۹)	عبادت، بریلوی۔ ڈاکٹر	(۱۰۸)	روایت کی اہمیت	پہلا ایڈیشن
(۷۰)	عبدالحق، ڈاکٹر	(۱۰۹)	چند ہم عصر	[illegible]
	〃 〃	(۱۱۰)	خطبات عبدالحق	۱۹۳۹ء
	〃 〃	(۱۱۱)	مقدمہ مخزن الشعرا دیتی	-
	〃 〃		تذکرۂ شعرائے گجرات	پہلا ایڈیشن
(۷۱)	عبدالرزاق۔ کانپوری	(۱۱۲)	یادِ ایام	〃 〃
(۷۲)	عبدالرحمٰن بجنوری۔ ڈاکٹر	(۱۱۳)	باقیات بجنوری	〃 〃
(۷۳)	عبدالرحمٰن دہلوی۔ شمس العلماء	(۱۱۴)	مرأۃ الشعراء	[illegible]
(۷۴)	عبدالسلام ندوی	(۱۱۵)	شعر الہند دوم	[illegible]
(۷۵)	عبدالقادر، سروری	(۱۱۶)	اُردو مثنوی کا ارتقاء	[illegible]
	〃 〃	(۱۱۷)	جدید اُردو شاعری	۱۹۴۶ء
(۷۶)	عبدالرحیم۔ مولانا	(۱۱۸)	الدر المنثور، تذکرہ صادقہ	.....
(۷۷)	عبدالعلیم۔ ڈاکٹر	(۱۱۹)	اُردو ادب کے رجحانات	پہلا ایڈیشن
(۷۸)	عبداللہ یوسف علی	(۱۲۰)	انگریزی [illegible] کے تعاون کی	
(۷۹)	عبدالماجد دریابادی۔ مولانا	(۱۲۱)	ہندوستانی [illegible]	مولانا [illegible]
(۸۰)	عبدالمجید۔ خواجہ	(۱۲۲)	کیا خوب آدمی تھا	طبع چہارم
(۸۱)	علی سردار جعفری	(۱۲۳)	ترقی پسند ادب	طبع اول

نمبر سلسلہ	مصنف	نمبر سلسلہ	کتاب	سن طباعت یا ایڈیشن
(۸۲)	عوالی۔ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی	(۱۲۴)	مدرس عوالی	۱۳۱۹ھ م ۱۹۰۱ء
(۸۳)	غلام السیدین، خواجہ	(۱۲۵)	(از) حالی میری نظر میں	طبع اول
(۸۴)	غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر	(۱۲۶)	حالی ذہنی ارتقاء	۱۹۵۳ء
(۸۵)	فراق، گورکھپوری	(۱۲۷)	نیا ادب (ترقی پسند حالی)	۱۹۴۷ء
	〃 〃	(۱۲۸)	اندازے	طبع اول
(۸۶)	فضل حق خیرآبادی۔ علامہ	(۱۲۹)	باغی ہندوستان	〃 〃
(۸۷)	کشن پرشاد کول پنڈت	(۱۳۰)	گلدستہ پنج	۱۹۱۵ء
(۸۸)	کلیم الدین احمد۔ ڈاکٹر	(۱۳۱)	اردو شاعری پر ایک نظر دوم	۱۹۵۶ء
	〃 〃 〃	(۱۳۲)	اردو تنقید پر ایک نظر	۱۹۵۷ء
	〃 〃	(۱۳۳)	سخنہائے گفتنی	۱۹۵۵ء
(۸۹)	گارساں دتاسی	(۱۳۴)	مقالات ۱۸۷۰ء	طبع اول
	〃 〃	(۱۳۵)	〃 〃 ۱۸۷۴ء	〃 〃
(۹۰)	مالک رام	(۱۳۶)	تلامذۂ غالب	۱۹۵۷ء بار اوّل
(۹۱)	مبشر علی صدیقی	(۱۳۷)	ادبی مقالات	۱۹۴۳ء
(۹۲)	مجتبیٰ حسین	(۱۳۸)	تہذیب و تحریر	۱۹۵۹ء
(۹۳)	مجنوں گورکھپوری	(۱۳۹)	ادب اور زندگی	طبع اول
	〃 〃	(۱۴۰)	نقوش و افکار	۱۹۵۶ء
(۹۴)	محمد اکرام	(۱۴۱)	موجِ کوثر	۱۹۴۰ء
(۹۵)	محمد ذکی الحق	(۱۴۲)	دیباچہ سروش ہستی	طبع اول
(۹۶)	محمد عتیق	(۱۴۳)	ہندوستانی اخبار نویسی	۱۹۵۷ء
(۹۷)	محمد عزیر۔ (ڈاکٹر)	(۱۴۴)	اسلام کے علاوہ مذہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	۱۹۵۵ء
(۹۸)	محمود خاں شیرانی	(۱۴۵)	پنجاب میں اردو	پہلا ایڈیشن
(۹۹)	مخمور اکبرآبادی	(۱۴۶)	صحیفۂ تاریخ اردو	〃 〃
(۱۰۰)	ممتاز حسین	(۱۴۷)	نقد حیات	۱۹۵۰ء
		(۱۴۸)	نئی قدریں	۱۹۵۰ء

Marfat.com

نمبر سلسلہ	مُصنّف	نمبر سلسلہ	کتاب	سن طباعت یا ایڈیشن
(۱۰۱)	ناظر احسن گیلانی	(۱۴۹)	تذکرہ شاہ ولی اللہ	پہلا ایڈیشن
(۱۰۲)	مہدی الافادی	(۱۵۰)	افادات مہدی	۱۹۵۶ء
	مہر۔ غلام رسول [illegible]	(۱۵۱)	خطوط غالب حصہ دوم	طبع اوّل
	〃 〃 〃	(۱۵۲)	مرتبہ شمس الحق [illegible]	۱۹۵۱ء
	〃 〃 〃	(۱۵۳)	نقش آزاد	۱۹۵۹ء
(۱۰۴)	میر تقی میر	(۱۵۴)	تذکرہ نکات الشعراء	طبع اوّل
(۱۰۵)	ناصح زاہدی	(۱۵۵)	(از) حالی میری نظر میں	〃 〃
(۱۰۶)	ناظم لکھنوی، حکیم ابو العلاء	(۱۵۶)	نظم اُردو	〃 〃
(۱۰۷)	نذیر احمد۔ ڈاکٹر شمس العلماء	(۱۵۷)	مجموعہ لکچر، جلد اوّل	〃 〃
	〃 〃 〃	(۱۵۸)	〃 〃 جلد دوم	〃 〃
(۱۰۸)	نساخ، مولوی عبدالغفور خاں	(۱۵۹)	سخن شعراء	۱۸۷۴ء
(۱۰۹)	نصیر الدین ہاشمی	(۱۶۰)	جنوبی ہند کا بہترین ادب	۱۹۵۸ء
	〃 〃	(۱۶۱)	دکن میں اُردو	تیسرا ایڈیشن
	〃 〃	(۱۶۲)	مدراس میں اُردو	۱۹۳۸ء
(۱۱۰)	نور الحسن ہاشمی۔ ڈاکٹر	(۱۶۳)	ادب کیا ہے؟	۱۹۵۲ء
	〃 〃 〃	(۱۶۴)	دلی کا دبستان شاعری	پہلا ایڈیشن
(۱۱۱)	وحید قریشی۔ ڈاکٹر	(۱۶۵)	مقدمہ شعر و شاعری	۱۹۵۳ء
(۱۱۲)	ہوش۔ بلگرامی	(۱۶۶)	عروس ادب	پہلا ایڈیشن
(۱۱۳)	یوسف حسین خاں۔ ڈاکٹر	(۱۶۷)	اُردو غزل	〃 〃
(۱۱۴)	مطبوعہ حکومت پاکستان	(۱۶۸)	کوائف و مصاحف	۱۹۵۸ء
(۱۱۵)	[illegible] پبلشرز	(۱۶۹)	نوائے آزادی	۱۹۵۷ء

دیوان کے علاوہ مختلف اساتذہ و لی، حاتم، میر، حسرت، مومن، غالب، شیفتہ، ذوق، آتش، ناسخ، امیر، داغ، مجروح وغیرہ کے دواوین۔

نیز مقالات شبلی، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، تنقیدی مقالات، روح تنقید، کے علاوہ نیز سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اور

باسو، برک، میکسم لوئن، ہمچنسن اور ہنٹر کی کتابوں کا حوالہ۔
(مسلمانوں کا روشن مستقبل (مصنفہ سید طفیل احمد صاحب) سے دیا گیا۔)

हिन्दी

११६ अवोध्या प्रसाद गोयली

११७ एफ़तेशाम हुसैन

१७० शेर ओ हुस्न

१७१ उर्दू साहित्य का इतिहास

English Books

118 A. LATIF. Dr. Syed

172. The Influence of English Literature on Urdu Literature.

119 A. QADIR. Sir. Sh.

173. Urdu Literature.

120 B. N. LUNIA.

174. Evolution of Indian Culture.

121 J. L. NEHRU.

175. Discovery of India.

122 S. M. ABDULLAH. Dr.

176. The Spirit and Substance of Urdu Prose under the influence of Sir Syed Ahmad Khan.

Marfat.com

اخبارات و رسائل

نمبر سلسلہ	اخبار یا رسالہ	تاریخ و سن
(۱)	اُردو	جنوری ۱۸۹۳ء
(۲)	اُردو کراچی	جنوری اپریل ۱۸۹۹ء
(۳)	الناظر، لکھنؤ	جنوری ۱۹۱۵ء
(۴)	اودھ پنچ، لکھنؤ	۱۳ر فروری ۱۸۹۰ء
(۵)	〃 〃	۳ر جولائی ۱۸۹۰ء
(۶)	〃 〃	۱۷ر جولائی ۱۸۹۰ء
(۷)	〃 〃	۲۲ر جنوری ۱۸۹۱ء
(۸)	〃 〃	۲ر اپریل ۱۸۹۱ء
(۹)	〃 〃	۴ر فروری ۱۸۹۲ء
(۱۰)	〃 〃	۲۶ر جنوری ۱۸۹۳ء
(۱۱)	〃 〃	۱۶ر اپریل ۱۸۹۳ء
(۱۲)	〃 〃	۱۶ر مارچ ۱۸۹۹ء
(۱۳)	〃 〃	۳ر اکتوبر ۱۹۰۱ء
(۱۴)	〃 〃	۲۷ر مارچ ۱۹۰۲ء
(۱۵)	〃 〃	۲۹ر جنوری ۱۹۰۴ء
(۱۶)	〃 〃	۱۲ر فروری ۱۹۰۴ء
(۱۷)	〃 〃	۵ر مارچ ۱۹۰۴ء
(۱۸)	〃 〃	۲۸ر اگست ۱۹۰۲ء
(۱۹)	〃 〃	یکم اکتوبر ۱۹۰۳ء
(۲۰)	〃 〃	۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۳ء
(۲۱)	〃 〃	۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء
(۲۲)	〃 〃	۱۱ر فروری ۱۹۰۴ء
(۲۳)	〃 〃	۲۵ر فروری ۱۹۰۴ء
(۲۴)	〃 〃	۳ر مارچ ۱۹۰۴ء

نمبر سلسلہ	اخبار یا رسالہ	تاریخ و سن
(۲۵)	اودھ پنچ۔ لکھنؤ	۱۴ر اپریل ۱۹۰۴ء
(۲۶)	〃 〃	۲۱ر اپریل ۱۹۰۴ء
(۲۷)	〃 〃	۲۸ر اپریل ۱۹۰۴ء
(۲۸)	〃 〃	۱۲ر مئی ۱۹۰۴ء
(۲۹)	〃 〃	۱۹ر مئی ۱۹۰۴ء
(۳۰)	〃 〃	۲۶ر مئی ۱۹۰۴ء
(۳۱)	〃 〃	۲ر جون ۱۹۰۴ء
(۳۲)	〃 〃	۱۶ر جون ۱۹۰۴ء
(۳۳)	〃 〃	۱۴ر جولائی ۱۹۰۴ء
(۳۴)	〃 〃	۲۱ر جولائی ۱۹۰۴ء
(۳۵)	〃 〃	۲۸ر جولائی ۱۹۰۴ء
(۳۶)	〃 〃	۴ر اگست ۱۹۰۴ء
(۳۷)	〃 〃	۱۸ر اگست ۱۹۰۴ء
(۳۸)	〃 〃	۲۹ر دسمبر ۱۹۰۴ء
(۳۹)	〃 〃	۷ر ستمبر ۱۹۰۵ء
(۴۰)	ذخیرہ، حیدرآباد	مارچ ۱۹۰۸ء
(۴۱)	ریاض الاخبار، گورکھپور	۱۸ر مارچ ۱۹۱۳ء
(۴۲)	〃 〃	۲۳ر جولائی ۱۹۱۴ء
(۴۳)	〃 〃	۱۵ر اپریل ۱۹۱۵ء
(۴۴)	〃 〃	۱۵ر جولائی ۱۹۱۵ء
(۴۵)	زمانہ، کانپور۔ عالی نمبر	دسمبر ۱۹۲۵ء
(۴۶)	〃	جنوری ۱۹۳۶ء
(۴۷)	سہیل، علی گڑھ	جنوری ۱۹۳۶ء
(۴۸)	شاعر، آگرہ، خاص نمبر	جنوری ۱۹۴۹ء

Marfat.com

نمبر سلسلہ	اخبار یا رسالہ	تاریخ و سن
(۴۹)	صدائے عام پٹنہ، عید نمبر	۱۹۵۳ء
(۵۰)	عالمگیر لاہور، خاص نمبر	۱۹۴۷ء
(۵۱)	عصر جدید	دسمبر ۱۹۱۴ء
(۵۲)	فکر و نظر، علی گڑھ	۱۹۵۴ء
(۵۳)	قومی آواز میگزین سکشن (حالی اور اُن کا عہد سید احتشام حسین)	× ×
(۵۴)	قومی زبان، کراچی	یکم جنوری ۱۹۵۵ء
(۵۵)	کلکتہ، ریڈیو	۱۸۷۰ء
(۵۶)	گل خنداں، غزل نمبر	جنوری ۱۹۵۹ء
(۵۷)	ماہ نو، کراچی	جون ۱۹۵۱ء
(۵۸)	〃 〃	مارچ ۱۹۵۳ء
(۵۹)	〃 〃	مئی ۱۹۵۳ء
(۶۰)	〃 〃	ستمبر ۱۹۵۳ء

نمبر سلسلہ	اخبار یا رسالہ	تاریخ و سن
(۶۱)	ماہ نو، کراچی	اکتوبر ۱۹۵۴ء
(۶۲)	〃	اکتوبر ۱۹۵۶ء
(۶۳)	مخزن، لاہور	نومبر ۱۹۰۴ء
(۶۴)	معارف	شوال ۱۳۵۴ھ
	〃	دسمبر ۱۹۳۵ء
(۶۵)	نقوش شخصیات نمبر	× ×
(۶۶)	نگار، لکھنؤ	جنوری فروری ۱۹۴۱ء
(۶۷)	〃 〃	فروری ۱۹۴۶ء
(۶۸)	〃 〃	جنوری فروری ۱۹۴۷ء
(۶۹)	نیا ادب، لکھنؤ	۱۹۴۶ء
(۷۰)	نیا ادب، لکھنؤ (ترقی پسند مصنفین کی تحریک، علی سردار جعفری)	
(۷۱)	آج کل، دہلی، نظم نمبر	اپریل ۱۹۵۸ء

محمد اسلامی
ذخیرہ
لاہور

Marfat.com